جنوبی ہند کے
جنگلوں میں
اے حمید

ابھی سارے ہندوستان پر انگریزوں کا راج تھا۔ اگرچہ ان کا اقتدار تاریخ کے آخری مراحل میں سے گزر رہا تھا۔ سری لنکا کا ملک بھی انگریز ہی کی علمداری میں تھا۔ اس وقت سری لنکا کا نام سیلون تھا۔ دونوں ملکوں میں انگریزوں کا قانون اور انگریزوں کا سکہ چلتا تھا۔ برما رنگون کی طرح سری لنکا یعنی سیلون جانے کے لئے بھی کسی پاسپورٹ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ آج کی طرح ہندوستان میں جانے کے لئے بھی کسی ویزا' پاسپورٹ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ سیلانی مزاج رکھنے والوں کے لئے کھلی چھٹی تھی۔ جب چاہیں ٹکٹ لے کر بحری جہاز میں بیٹھ کر برما' رنگون اور سیلون کولمبو کی سیاحت کو جا سکتے تھے۔

میں نے بھی بچپن ہی سے سیلانی مزاج پایا تھا۔ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ نئے ملک' نئے شہر اور ان شہروں کے لوگ اور ان ملکوں کے جنگل' وادیاں' سمندر دیکھنے کو ہر وقت دل مچلتا تھا۔ اس وقت میری عمر تیرہ برس ہوگی۔ یہاں سے میری عمر کا اندازہ لگا لیں کہ میں امرتسر کے ایم اے او ہائی سکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ جب میں پہلی بار اپنا شہر امرتسر چھوڑ کر برما کے دارالحکومت رنگون کی طرف روانہ ہوا۔ آٹھویں جماعت مجھے اس لئے یاد ہے کہ جب میں رنگون کی آوارہ گردی کے بعد امرتسر واپس آیا تھا تو چونکہ میں نے آٹھویں جماعت پاس نہیں کی تھی اس لئے مجھے ایک بار پھر آٹھویں جماعت میں ہی داخلہ ملا تھا۔

بہرحال میرے پیش نظر سکول کی تعلیم اتنی اہم نہیں تھی جتنی اپنے اس شوق کی اہمیت تھی کہ نئے نئے ملک دیکھوں' نئے نئے شہر دیکھوں۔ ان جنگلوں کی سیر کروں جہاں

بڑی بارشیں ہوتی ہیں اور جن کا حال میں جغرافیے کی کتابوں میں پڑھا کرتا تھا۔ اس کے بعد کے سفر تو میں نے اکیلے اور خانہ بدوشوں کی طرح کئے' مگر رنگون جاتے وقت میں اکیلا نہیں تھا۔ میری بڑی ہمشیرہ اور اس کا خاوند بھی ساتھ تھے۔ بلکہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ بڑی ہمشیرہ کے شریک حیات کا نام ممتاز ملک تھا' جو بعد میں فوج میں کمیشن پا کر کیپٹن ممتاز ملک کے نام سے مشہور ہوئے اور اپنے زندگی کے آخری ایام میں روزنامہ نوائے وقت کے نیوز ایڈیٹر بھی رہے۔

ملک صاحب گورنمنٹ کالج سے بی اے کرنے کے بعد صحافت کے پیشے سے منسلک ہو گئے تھے اور رسالہ پھول' شباب' اردو اخبار زمیندار میں بھی کام کرتے تھے۔ وہ مولانا چراغ حسن حسرت' ڈاکٹر باقر' باری علیگ' سجاد سرور نیازی' راجہ مہدی علی خان اور ن م راشد کے دوستوں میں شامل تھے۔ اردو اور انگریزی زبان میں زبردست عبور رکھتے تھے۔ خبروں کے انگریزی بلیٹن کا ترجمہ حیرت انگیز تیزی سے کرتے تھے۔ بے تکان انگریزی بولتے تھے۔ انہوں نے بہاولپور اور چولستان کی صحرائی زندگی پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جو معلوم نہیں چھپی کہ نہیں چھپی۔ میں نے ان کے ہاتھ کا انگریزی میں لکھا ہوا مسودہ ان کے ہاں ضرور دیکھا تھا۔

جس زمانے میں' میں ان کے ساتھ رنگون گیا وہ رنگون سے شائع ہونے والے اردو کے دو روزناموں یعنی شیر رنگون اور مجاہد برما کے ادارے سے منسلک تھے۔ روزنامہ شیر رنگون کے مالک ٹھیکیدار شیر محمد تھے۔ جس کے چیف ایڈیٹر بھائی جان یعنی کیپٹن ممتاز ملک تھے۔ اس اخبار کے ساتھ ہی ممتاز ملک نے رنگون کے نامور فروٹ مرچنٹ حاجی رحیم بخش صاحب کی شراکت سے ایک اپنا روزنامہ نکالا جس کا نام مجاہد برما تھا۔ حاجی صاحب کا تعلق پشاور سے تھا۔ میں آگے چل کران کا ذکر کروں گا۔ گجرات کے ایک ٹھیکیدار جن کا نام ظہور الحسن شاہ تھا اور جنہیں سب شاہ جی کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ان دونوں اخباروں میں کالم لکھا کرتے تھے۔

خوش لباس' خوش شکل تھے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے۔ شیر رنگون اور مجاہد

برما دونوں اخباروں کے چیف ایڈیٹر کیپٹن ممتاز ملک تھے۔ رنگون میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے آئے ہوئے مسلمانوں کی بھاری تعداد مختلف کاروبار کرتی تھی۔ ان میں سورتی میمن بھی تھے۔ گجراتی مسلمان بھی تھے اور پنجابی مسلمان بھی تھے۔ جو صاحب ثروت ٹھیکیدار تھے اور بزنس بھی کرتے تھے۔ چنانچہ رنگون میں اردو عام بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اردو کی ادبی اور دینی کتابیں چھاپنے والا ایک ادارہ بھی تھا جس کا نام اب یاد نہیں۔ میں نے اس ادارے کی دکان سے بارش میں گھوڑا گاڑی باہر کھڑی کر کے میرزا ادیب کی کتاب ''صحرانورد کے خطوط'' خریدی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک الگ اسلامی ریاست پاکستان کا مطالبہ کر دیا تھا اور قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں برصغیر میں تحریک پاکستان پورے زور وشور سے جاری تھی۔

ادھر یورپ میں دوسری جنگ عظیم بھی اپنے عروج پر تھی۔ لیکن ابھی جاپان میدان جنگ میں نہیں کودا تھا۔ اس اعتبار سے ہندوستان' برما اور سیلون (سری لنکا) میں رات کو بلیک آؤٹ وغیرہ نہیں ہوتے تھے اور برما اور ہندوستان کے درمیان بحری جہازوں کی آمدورفت بھی جاری تھی۔ شروع اگست کے دن تھے۔ جب ہم امرتسر سے رنگون کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ بارشوں کا موسم ہوتا ہے اور جنوبی ایشیا میں ان دنوں موسلادھار بارشیں ہوتی ہیں۔ میں نے ابھی جنوبی ایشیا کی بارشیں نہیں دیکھی تھیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں ان بارشوں سے ملنے جا رہا تھا۔ ابھی زندگیوں کے معمولات میں افراتفری نہیں مچی تھی۔ کسی بھی شہر کی آبادی حد سے نہیں بڑھی ہوئی تھی۔ لوگ معمول کے مطابق قناعت پسندی اور سادگی سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ نہ ہونے کے برابر تھی۔ دیسی گھی کے کنستر پنساریوں کی دکانوں پر عام مل جاتے تھے۔ اس کنستر کے چھوٹے سے گول ڈھکنے پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ کر کھولا جاتا ہے۔ گھی برتن میں ڈالا جاتا تھا تو چاروں طرف اس کی خوشبو پھیل جاتی تھی۔ عام تنوروں پر خالص آٹے کی روٹی ملتی تھی۔ تنور سے روٹیاں پک کر نکل رہی ہوتی تھیں تو قریب سے گزرنے پر بھنے ہوئے باداموں کی خوشبو آتی تھی۔ ان تنوروں پر ایک پیسے کی روٹی کے ساتھ چنے کی دال

مفت ملتی تھی۔ سبزیاں جراثیم کش ادویات کے چھڑکاؤ سے پاک ہوتی تھیں۔ آج کل
کیمیکل سپرے کے اندھا دھند استعمال کی وجہ سے سبزیوں کی خوشبوئیں غائب ہونے گ
ہیں۔ مگر جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں سبزیوں کی دکان کے سامنے
سے گزرتے وقت ہر سبزی کی خوشبو آتی تھی۔ جس میں ہرے دھنیے اور پودینے کی خوش
نمایاں ہوتی تھی۔ ڈبل روٹی ڈاکٹر کی ہدایت پر بیمار کو دی جاتی تھی۔

نہ کوئی رکشا تھا۔ نہ سکوٹر تھے۔ نہ ویگنیں تھیں۔ نہ اتنے زیادہ دھواں اگ
کارخانے تھے۔ آدمیوں کے دماغ اور قدرت کا آسمان آلودگیوں سے پاک تھا۔ رات
شفاف آسمان پر ستارے بڑی آب و تاب سے چمکتے تھے۔ ہر ستارہ اپنے سائز اور روش
کے ساتھ الگ الگ نظر آتا تھا۔ کسی کی روشنی سفید ہوتی تھی کسی کی سرخ اور کسی کی ہلکی ن
اور کسی کی گہرے نیلے رنگ کی ہوتی تھی۔ چاند کی چاندنی موتیے کے سفید پھولوں کی چا
کی طرح بچھ جاتی تھی اور راتوں کو سفر کرنے والوں کو خود راستہ دکھاتی تھی۔

کمیٹی کی گاڑیاں سڑکوں پر صبح صبح اور تیسرے پہر پانی کا چھڑکاؤ کرتی تھیں ا
زمین میں سے مٹی کی ہلکی ہلکی خوشبو اٹھتی تھی۔ گلیوں کی نالیاں صبح شام صاف کی جاتی تھیں
پینے والے پانی کی سپلائی بڑے بڑے واٹر ٹینکس کے ذریعے ہوتی تھی۔ جہاں ہر وقت پا
کا مشاہدہ کیا جاتا تھا کہ اس میں کوئی مضرِ صحت اجزا تو شامل نہیں ہو گئے۔ گرمیوں میں لوگ
پیاس بجھانے کے لئے لسی اور شربت کا استعمال کرتے تھے۔ شربت خالص جڑی بوٹیو
سے تیار کئے جاتے تھے۔ ایسنس کا نام و نشان نہیں تھا۔

صندل کے شربت میں سے خالص صندل کی خوشبو آتی تھی۔ انار کا شربت سر
اناروں اور شہتوت کا شربت خالص اور میٹھے سبز اور کاسنی بادانے شہتوت سے بنائے جا
تھے۔ پھل دار پودوں، پھل دار درختوں اور خود پھلوں پر کسی قسم کی جراثیم کش ادویات
چھڑکاؤ نہیں کیا جاتا تھا۔ پھلوں کی دکان کے آگے سے گزر جائیں تو ہر پھل کی خوشبو اگ
الگ آتی تھی اور یہ خوشبو دور تک ساتھ چلتی تھی۔

موسموں کا رویہ ابھی غیر قدرتی نہیں ہوا تھا۔ اپنے وقت پر آتے تھے اور ا

وقت پر برس کر چلے جاتے تھے۔ نہ وقت سے پہلے بارش لاتے تھے نہ وقت کے بعد تک
برستے رہتے۔ بادل شہروں کے ساتھ ہی پورا انصاف کرتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ
گڑھی شاہو میں بارش ہو رہی ہے اور میکلوڈ روڈ پر دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ دریاؤں اور نہروں
میں آلودگی سے پاک ٹھنڈا اور میٹھا پانی بہتا تھا۔ آم کے باغوں میں سے گزرنے والی
چھوٹی نہروں پر درختوں کے گرے ہوئے آم تیرتے تھے۔ جنہیں بچے نہر میں چھلانگیں لگا
کر پکڑتے تھے۔ گرمیوں کی چمکیلے ستاروں والی خاموش راتوں میں کمپنی باغ کی نہر کے
کناروں سے گیلی مٹی اور گیلے گھاس کی مہک آتی تھی۔

چیت وساکھ میں جب آم کے درختوں پر بور آتا تھا تو شہد ایسی میٹھی خوشبو پھیل
جاتی تھی۔ راتیں اتنی خاموش ہوتی تھیں کہ دور...... بہت دور ریلوے سٹیشن پر انجن کے
شنٹ کرنے کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ بارہ بجے رات سینما کا آخری شو ٹوٹتا تو انجمن
پارک کی طرف سے لوگوں کی آوازیں کچھ دیر کے لئے ابھرتیں اور خاموش ہو جاتیں۔ پھر
ہال بازار سے کسی کسی تانگے کے گزرنے کی آواز آتی جو دور ہوتے ہوئے رات کے
سناٹے میں گم ہو جاتی۔

کمپنی باغ ہمارے محلے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں
چھت پر سوتے ہوئے کمپنی باغ کی طرف سے کبھی کوئی ہوا کا جھونکا امرود کے باغوں کی
خوشبو لے کر اور کبھی طرح طرح کے پھلوں کی خوشبو لے کر آتا۔ کسی وقت کوئل کی آواز
رات کی خاموشی میں میٹھا نغمہ سناتے ہوئے گزر جاتی۔

یہ سب باتیں، یہ سب چیزیں اب خواب میں دیکھی ہوئی چیزیں، خواب میں سنی
ہوئی باتیں لگتی ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے۔ غور سے سنا جائے تو یہ خواب ہی کی باتیں
ہیں۔ خواب ہی کی چیزیں ہیں۔ آپ کو پتا ہے میں خواب کو کیا سمجھتا ہوں؟ میں آپ کو بتاتا
ہوں اگر زندگی کی شادی ہو جائے تو خواب کو میں اس کی دلہن سمجھتا ہوں۔ خوبصورت، پاکیزہ
اور معصوم خواب، زندگی کی سہاگ رات کے برابر ہے۔ خواب میرے جسم کی روح ہے۔
میری روح کی توانائی ہے۔ میں اس وجہ سے زندہ ہوں کہ میں خواب دیکھتا ہوں۔ ایسا

خواب جو میرے کردار کی تعمیر کرتا ہے۔ میری غیر ضروری مادی آلودگیوں کو مجھ سے الگ کرتا ہے۔ یہی وہ خواب ہیں جن کو دیکھنے کے لئے میں رات کو سوتا ہوں۔ جس دن یہ خواب مجھ سے جدا ہو گئے اس دن میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا۔ شائد پھر میں خوابوں کی ایک ایسی دنیا میں چلا جاؤں گا جو اس دنیا سے زیادہ حقیقی اور میرے اعمال کو پرکھنے والی دنیا ہوگی۔ بہت دیر ہوئی میں نے ایک بار کسی قدیم مصری دانشور کا قول پڑھا تھا۔ یہ اس قول کا ذکر میں پہلے بھی اپنے ایک کالم میں کر چکا ہوں۔ ایک بار اس قول کو دہرانا چاہتا ہوں۔ کسی اچھی بات کو دہرانے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ مصری دانشور کا قول یہ تھا۔

''جھونپڑی میں رہ کر شاہی محلات کا خواب دیکھنا بہتر ہے بجائے اس کے کہ آدمی شاہی محلات میں رہے اور اس کے پاس خواب دیکھنے کے لئے کچھ نہ ہو۔''

ایک خواب ہوتا ہے۔ ایک خواب کا علم ہوتا ہے۔ علم، خواب کی نفسیاتی تشریح کرتا ہے۔ اس کا سائنسی تجزیہ کرتا ہے۔ لیکن علم خواب نہیں دیکھتا۔ یہاں مجھے بے اختیار علامہ اقبال کے تین شعر یاد آ رہے ہیں۔ میں آپ کو بھی سناتا ہوں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
(علامہ اقبال بال جبریل)

آپ سے باتیں کرتے ہوئے میں اصل موضوع سے ہٹ کر دوسری طرف نکل جاتا ہوں۔ اس کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ اصل میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میری نگاہوں کے سامنے نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی حسین ترین شکلوں کا ایک ہجوم سا

جاتا ہے اور پھر میری نگاہ کسی ایک پر نہیں ٹھہرتی۔

شدت شوق سے کبھی ایک شکل کو دیکھتا ہوں اور کبھی دوسری نورانی صورت کو تکنے لگتا ہوں۔ میں آپ کو آج سے پچاس پچپن سال پہلے کے زمانے کی سادگی اور قناعت پسندی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ بات نہیں کہ اس زمانے میں مادہ پرستی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس کی اہمیت آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ باقی ساری کی ساری فضاؤں میں روحانیت رچی ہوئی تھی۔ جنہیں عام اصطلاح میں بدمعاش کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ گلی محلوں میں نظریں نیچی کر کے گزرتے تھے۔ وہ صرف بدمعاشوں کے واسطے بدمعاش تھے۔ شریفوں کے سامنے ان کی آنکھیں نہیں اٹھتی تھیں۔ چیزوں میں بڑی روحانیت تھی۔ بڑی برکت تھی۔ اب چیزیں پہلے سے زیادہ ہوگئی ہیں لیکن برکت اور روحانیت کہیں کہیں ملتی ہے۔

اب میں واپس اپنی زندگی کے پہلے سفر کی طرف واپس آتا ہوں جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ ہم برسات کے موسم میں امرتسر سے رنگون کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ بھائی کو سمندری سفر کے لئے اس موسم کا انتخاب نہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ اس موسم میں جنوب مشرقی ایشیا کے سمندر چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان میں بڑے طوفان آتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رنگون میں ان کی صحافتی مصروفیات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ان کا وہاں جلد پہنچنا ضروری تھا۔ ہم لوگ تانگوں میں سوار ہو کر امرتسر کے ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ جیسا کہ اس زمانے کا رواج تھا۔ آپو جی (والدہ صاحبہ) نے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں بنا کر ساتھ رکھ دی تھیں۔

ہمیں ہوڑا ایکسپریس پکڑنی تھی جو لاہور سے آتی تھی اور کلکتہ جاتی تھی۔ کلکتے سے ہمیں بحری جہاز کے ذریعے رنگون تک سمندر میں سفر کرنا تھا۔ اس روز امرتسر کے آسمان پر برسات کے بادل نہیں چھائے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے ہوا بند تھی اور حبس تھا۔ بھائی جان جب سٹیشن سے باہر قلیوں سے سامان اتروا رہے تھے تو انہیں بہت پسینہ آیا ہوا تھا۔ اس ریل گاڑی کے ڈبے سبز ہوتے تھے اور یہ امرتسر صبح کے وقت پہنچتی تھی۔ پتھر کے کوئلوں

سے چلنے والا بڑا گرانڈیل اور باجبروت انجن آگے لگا ہوتا تھا۔

میں نے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک برصغیر کی ریل گاڑیوں میں سفر کیا ہے۔ مجھے ریل گاڑی میں سفر کرنا بہت پسند ہے۔ لیکن اس زمانے کی ریل گاڑیوں کی جس چیز نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا وہ ان گاڑیوں کے آگے لگے ہوئے کوئلے کے چھوٹے چھوٹے ذرات شامل ہوتے تھے۔ لمبا سفر کرنے والے مسافروں کے سر کے بالوں اور چہروں پر کالک کی ہلکی سی تہہ جم جاتی تھی جو صرف صابن کے ساتھ منہ دھونے یا چہرے کو تولئے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرنے سے ہی اترتی تھی۔

ایک اور مصیبت یہ تھی کہ آنکھوں میں پتھر کے کوئلوں کے ذرے پڑ جاتے تھے۔ ایک بار آنکھ میں کوئی ذرہ پڑ جاتا تھا تو پھر لاکھ کوشش کریں۔ پانی کے چھینٹے ماریں' آنکھ میں رومال کے کونے پھیریں' پتھر کا ذرہ باہر نہیں نکلتا تھا۔ آنکھ مل مل کر لال ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جب آدمی دو تین دن کے ریل کے سفر کے بعد میزبان کے ہاں پہنچتا تھا تو پہچانا نہیں جاتا تھا۔ انجن کے دھوئیں کی وجہ سے چہرے پر کالک کی تہہ جمی ہوتی تھی اور ایک آنکھ لال سرخ ہو کر سوج گئی ہوتی تھی۔

امرتسر سے کلکتے تک کا ریل کا سفر بھی کافی لمبا تھا۔ میں پہلی بار کلکتہ جا رہا تھا۔ اس کے بعد تو کلکتے کی بہت آوارہ گردیاں کیں۔ لیکن بھائی جان کے ساتھ یہ میرا کلکتے اور رنگون کا پہلا سفر تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں سکول چھوڑ کر بھائی جان کے ساتھ رنگون ج رہا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہم کب رنگون پہنچیں گے اور راستے میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی۔ گھر والے ہمیں ریل پر چڑھانے آئے ہوئے تھے۔

پلیٹ فارم پر ہمارا سامان ایک طرف لگا دیا گیا تھا۔ سبز رنگ کے ڈبوں وا ہوڑہ ایکسپریس لاہور سے آ کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی۔ جلدی جلدی سامان ڈبے میں رکھوانے کے بعد ہم بھی سوار ہو گئے۔ کیونکہ ہوڑہ ایکسپریس امرتسر میں پانچ سات منٹ ہ ٹھہرتی تھی۔ گارڈ نے سیٹی دی۔ انجن نے تین بار سیٹی بجائی گارڈ نے سبز جھنڈی لہرائی او ٹرین چل پڑی۔

میں کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی والی سیٹ ہمیشہ میری کمزوری رہی ہے۔ بس، ہو ہوائی جہاز ہو یا ریل گاڑی ہو میں کوشش کر کے کھڑکی کے پاس ہی بیٹھتا ہوں تاکہ باہر کا نظارہ کر سکوں اور اپنے آپ کو دوسرے مسافروں سے بے تعلق رکھ سکوں۔

ہوڑہ ایکسپریس امرتسر کے ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی اور اس کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔ پہلے سیڑھیوں والا پل آیا۔ اس کے بعد گاڑی کمپنی باغ والے پل کے نیچے سے گزرنے لگی۔ اس پل کا نام میں بھول گیا ہوں۔ شاید ریلوے برج نام تھا لیکن میرا خیال ہے کہ امرتسر سے لاہور جاتے ہوئے گول باغ کے قریب جو پل آتا تھا اس کا نام ریگو برج تھا۔ کمپنی باغ والا جو پل تھا اس کی چار سڑکیں تھیں اور اس پر سے بھاری ٹریفک بھی گزرتی تھی۔

اس کی ایک سڑک شریف پورے کی طرف سے آتی تھی۔ دوسری سڑک ہال بازار کی طرف سے آتی تھی۔ ایک سڑک کمپنی باغ کے بڑے ہسپتال والے دروازے کی طرف جاتی تھی اور ایک سڑک ریلوے سٹیشن کی طرف نکل جاتی تھی۔ اس پل کی ایک جانب انجمن پارک تھا جہاں مسلم لیگ کے جلسے بھی ہوتے تھے اور کرکٹ میچ بھی ہوتے تھے۔ انجمن پارک کے جنوبی کونے میں کسی بزرگ کا مزار تھا۔ جہاں سبز جھنڈا ہوا میں لہرایا کرتا تھا۔ اس کے قریب ہی مسجد نور تھی۔

پھر کمپنی باغ اور عیدگاہ والا ریلوے پھاٹک آ گیا۔ اس کے ایک جانب حسین رے شریف پورے اور تحصیل پورے کے مکان تھے اور ایک جانب امرود کے باغات تھے۔ جن کے عقب میں کمپنی باغ تھا۔ اس کے بعد ایک ریلوے لائن بٹالہ گورداسپور کی رف جاتی تھی۔ پھر چالیس کھوہ آ گئے۔ یہ صاف پانی کے بڑے بڑے زمین دوز ٹینک تھے جن میں سے امرتسر شہر کو پینے کا پانی سپلائی ہوتا تھا۔ اس کے آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع گیا۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا یہ سب کچھ بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا۔

اب ہوڑہ ایکسپریس نے کافی سپیڈ پکڑ لی تھی۔ ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ گرد رہی تھی۔ مجھے اس کی بھی بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ ہوا کا رخ دوسری جانب تھا اور انجن کا

دھواں میری طرف آنے کی بجائے دوسری طرف جا رہا تھا۔ مانانوالہ سٹیشن آیا۔ کرتار پور
آیا۔ ٹرین ان سٹیشنوں پر سے شور مچاتی سیٹیاں بجاتی گزر گئی۔ پھر جالندھر آ گیا۔ ٹرین
یہاں رک گئی۔ تین چار منٹ کے بعد پھر چل پڑی۔ بھائی جان نے بتایا تھا کہ لدھیانے
سٹیشن پر ان کا ایک دوست ظفر نیازی کھانا لے کر آیا ہوا ہوگا۔ ٹرین لدھیانے رکی تو پلیٹ
فارم پر ایک اونچا لمبا گورا چٹا خوش شکل نوجوان کھانا لئے موجود تھا۔ دونوکر بھی اس کے
ساتھ تھے۔ ان صاحب کا نام ظفر نیازی تھا اور یہ شاعر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد معلوم
ہوا کہ راولپنڈی میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ظفر نیازی صاحب بھائی جان سے گلے لگ کر
ملے۔ ٹرین وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی تھی۔ جلدی جلدی کھانے کے برتن وغیرہ ڈبے میں
رکھوائے۔ اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجا کر سبز جھنڈی لہرا دی اور ٹرین چھک چھک کرتی آگے
چل پڑی۔

◆......◆......◆

رنگون میں اپنے قیام اور سفر کے بارے میں، میں نے تین چار کتابیں، ناول اور
افسانوی انداز میں لکھی ہیں۔ ضابطہ ادب کے تقاضوں اور بعض مصلحتوں کے باعث ان
ناولوں اور افسانوں میں، میں نے بعض واقعات نہیں لکھے اور اگر لکھے ہیں تو ان میں حقیقت
کی جگہ افسانوی رنگ زیادہ ہے۔ اس وقت میں اپنے رنگون کے سفر اور قیام رنگون کے
بارے میں جو سفر نامہ لکھ رہا ہوں اس میں پورے حقائق سے کام لیا جا رہا ہے اور جن
ب کے نام میں بھول گیا تھا ان کے نام تصدیق کرنے کے بعد لکھ رہا ہوں اور تمام
مصلحتوں کو بھی میں نے بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

مثال کے طور پر میں نے رنگون کے بارے میں اپنے ایک ناول میں لکھا تھا کہ
رنگون میں جو دو اردو روزنامے "شیر رنگون" اور "مجاہد برما" شائع ہوتے تھے ان کے مالک
اور پبلشر سید کشفی شاہ صاحب تھے۔ اب پوری طرح تصدیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ
ایسا نہیں تھا اور میں غلط لکھ گیا تھا۔ "شیر رنگون" کے مالک محترم شیر محمد صاحب تھے جن کا
شمار برما کے مشہور ٹھیکیداروں میں ہوتا تھا جبکہ "مجاہد برما" کیپٹن ممتاز ملک اور رنگون کے
مشہور فروٹ مرچنٹ محترم حاجی رحیم بخش صاحب نے مل کر نکالا تھا۔ ان دونوں اخباروں
کے چیف ایڈیٹر کیپٹن ممتاز ملک ہی تھے جو قیام پاکستان کے بعد لاہور میں آ کر روزنامہ
"نوائے وقت" سے منسلک ہو گئے تھے۔

ان حضرات کے بارے میں آگے چل کر تفصیل سے لکھوں گا۔ اس وقت میں
ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہوں اور ہم لوگ جناب ظفر نیازی صاحب کو الوداع کہہ کر

لدھیانے سے آگے نکل چکے ہیں۔ لدھیانے کے بعد ٹرین انبالہ شہر کے سٹیشن کو چھوڑ کر انبالے کینٹ کے سٹیشن پر رکی۔ بڑا صاف ستھرا اسٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم کا فرش چمک رہا تھا۔ زیادہ رش نہیں تھا۔ انبالہ کینٹ اس زمانے میں فوج کی مشہور چھاؤنی تھی۔ یہاں سے ٹرین چلی تو سہارن پور آ کر رکی۔

سہارن پور کے گنے یعنی کماد بڑا مشہور تھا۔ ریلوے ٹریک کے دونوں جانب کھیتوں میں اونچی اونچی فصل کھڑی تھی۔ بھائی جان نے بتایا کہ یہ کماد کے کھیت ہیں۔ مجھے یاد ہے امرتسر میں ہمارے محلے کے دروازے کے باہر گنے بکتے تھے۔ گنے بیچنے والا ''سہارنی گنے'' کی آواز لگایا کرتا تھا۔ میں اور میرا چھوٹا آرٹسٹ بھائی مقصود یہاں سے گنے لیتے اور انہیں چالیس کھوہ کے کھیتوں میں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔

سہارن پور کے بعد ٹرین میرٹھ چھاؤنی کے سٹیشن پر رکی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کا آغاز میرٹھ چھاؤنی کے سٹیشن سے ہی ہوا تھا۔ اس شہر کے غیور مسلمانوں کی شجاعت اور دلیری آج بھی بدستور ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ میرٹھ بڑا مردم خیز شہر ہے۔ اس سرزمین نے دینی، سیاسی اور علمی ادبی اعتبار سے بڑی بڑی نامور ہستیوں کو جنم دیا ہے۔ میرٹھ کینٹ بھی انگریزوں کی بہت اہم فوجی چھاؤنی تھی۔ اس کے بعد ہم دلی پہنچ گئے۔ دلی سٹیشن پر بھی دوسرے سٹیشنوں کی طرح پلیٹ فارم پر انگریزی اور اردوں میں لکھے ہوئے رنگین پوسٹر چسپاں تھے جن پر لکھا تھا افواہوں پر اعتبار نہ کریں۔

ففتھ کالم سے ہوشیار رہیں، ریڈ کراس میں خون کے عطیات جمع کرائیں وغیرہ۔ ففتھ کالم سے مراد دشمن کے جاسوس ہوتے ہیں۔ آج کے دلی شہر اور اس زمانے کے دلی شہر میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ جو لوگ ویزا لے کر دلی جاتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ دلی میں ٹریفک کا شور، فضائی آلودگی، غربت اور گندگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔

جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے کی دلی اسلامی تہذیب و ثقافت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ اس شہر میں جو مسلمان بادشاہوں کا پائے تخت رہا تھا، ان کے زوال کے بعد بھی ایک شان باقی تھی۔ میں ایک دو دن دلی میں مشہور شاعر جناب ن۔م۔ راشد

کے ہاں قیام کرتا تھا۔ ن۔م۔ راشد صاحب بھائی جان کے دوست تھے اور انہوں نے بھائی جان کو کہا تھا کہ رنگون جاتے ہوئے میرے ہاں ضرور قیام کرنا۔ راشد صاحب کی کوٹھی غالباً علی پور روڈ پر ہی تھی۔ انگریزوں کے زمانے کا ایک منزلہ بنگلہ تھا جس کے تین جانب کشادہ لان تھا۔ میں اس عمر میں ذرا موٹا ہوا کرتا تھا۔ راشد صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا۔

''کیا حال ہے پہلوان؟''

مجھے ان کا یہ جملہ اس طرح یاد ہے جیسے انہوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا ہو۔ میں کوٹھی کے ایک کمرے میں پھرتا پھرتا گیا تو دیوار کے ساتھ رسالوں کے ڈھیر لگے تھے۔ مجھے یاد ہے ان میں ''ادب لطیف'' کے رسالے بھی تھے۔ جو میں امرتسر میں اپنے محلے کی کمیٹی کی لائبریری میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ ایک رسالے پر افسانہ نگار کرشن چندر اور منٹو کی رنگین تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ میں ان کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتا تھا اور یہ میرے پسندیدہ ادیب تھے۔ ہم رات کے وقت راشد صاحب کے بنگلے پر ایک تانگے میں سوار ہو کر پہنچے تھے۔ ن۔م۔ راشد صاحب ان دنوں آل انڈیا ریڈیو میں ڈائریکٹر آف پروگرامز تھے۔ دوسرے دن بھائی جان کے ساتھ میں ان کے دفتر گیا۔ راشد صاحب ایک کشادہ کمرے میں بڑی میز کے پیچھے بیٹھے تھے۔ ان کی بائیں جانب دو چھوٹی میزیں بچھی تھیں۔ ایک میز پر بیٹھے ہوئے گورے چٹے سیاہ بالوں والے دبلے پتلے نوجوان کو میں نے پہچان لیا کیونکہ میں نے ان کی تصویریں اکثر ادبی رسالوں میں دیکھی ہوئی تھیں۔

یہ افسانہ نگار سعادت حسن منٹو تھے۔ منٹو صاحب کچھ لکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ چہرہ اٹھا کر اپنی گول گول آنکھوں سے اردگرد کا جائزہ لیتے اور پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ منٹو صاحب نے ان دنوں ریڈیو کے لئے بڑے دلچسپ ایکٹ کے پلے لکھے تھے جو لاہور میں ''جنازے'' اور ''آؤ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ دوسری میز پر جو گندمی رنگت کا دبلا پتلا نوجوان بیٹھا تھا، میں نے اسے نہیں پہچانا۔ راشد صاحب نے بتایا کہ یہ افسانہ نگار چندر کانت ہے۔ چندر کانت کے اردو

افسانے ادب لطیف اور ادبی دنیا میں کبھی کبھی چھپا کرتے تھے۔

دلی کا ریڈیو سٹیشن بھی علی پور روڈ پر ہی واقع تھا۔ دوسرے دن دوپہر کو خواجہ حسن نظامی صاحب نے بھائی جان کو کھانے کی دعوت دے رکھی تھی۔ ہم لوگ اب یاد نہیں کہ کسی ٹیکسی میں یا ریڈیو کی گاڑی میں بیٹھ کر خواجہ حسن نظامی صاحب کے دولت خانے پر پہنچے جو درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پچھواڑے مزار کے احاطے میں ہی واقع تھا۔ فرشی دستر خوان بچھا ہوا تھا جس پر انواع و اقسام کے کھانے موجود تھے۔ اب یاد نہیں کہ کیا کیا کچھ تھا۔ ہر شے بڑی لذیذ اور خوشبودار تھی۔

بھائی جان' خواجہ صاحب سے رنگون میں اردو کی ترقی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کچھ وہاں کے اخباروں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد مجھے اچھی طرح یاد ہے خواجہ نظامی صاحب مجھے بھائی جان اور ہمشیرہ صاحبہ کو لے کر مکان کے باہر تشریف لائے اور انہوں نے ہمیں ایک دروازہ دکھایا جس پر گولیوں کے سوراخ تھے۔

انہوں نے بتایا کہ یہاں ان پر ہندو مہاسبھائیوں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر ایک قبرستان کی چار دیواری تھی جس کی تنگ سی ڈیوڑھی میں سے ہو کر ہم چھوٹے سے قبرستان میں آ گئے۔ یہاں اردو اور فارسی کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی قبر تھی۔ قبر کے سرہانے لوح مزار پر جو کچھ لکھا تھا وہ میں پورا نہ پڑھ سکا۔ غالب کا نام ضرور پڑھا اور یہ لکھا ہوا پڑھا۔ "ہاتف نے کہا میری سمجھ میں نہ آیا کہ ہاتف کون تھا۔"

وہ رات بھی ہم نے ن۔م۔ راشد صاحب کے بنگلے پر بسر کی اور دوسرے دن ٹرین میں بیٹھ کر دلی سے کلکتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ بمبئی جاتے ہوئے گاڑی دلی سے متھرا' آگرہ' گوالیار' جھانسی سیکشن والے ریلوے ٹریک کی طرف مڑ جاتی ہے۔ کلکتے کے لئے ٹرین مراد آباد' بریلی والی ریلوے لائن پر آ جاتی ہے۔ دلی سے ٹرین چلی تو دریائے جمنا کے پل پر سے گزر گئی۔ بہت مشہور دریا تھا۔

گنگا جمنا دریاؤں کا حال میں اپنی جغرافیے کی کتاب میں پڑھ چکا تھا۔ کئی سٹیشن آئے اور گزر گئے یہ بھی کوئی ایکسپریس ٹرین تھی۔ ہوڑہ ایکسپریس تھی یا کلکتہ میل تھی یاد

نہیں۔ بڑا شہر مراد آباد آیا۔ مراد آباد کے پیتل کے برتن اس زمانے میں بڑے مشہور تھے۔ شاعر جگر مراد آبادی کی غزلیں بھی میں نے ادبی رسالوں میں پڑھی تھیں۔ سٹیشن دیکھ کر مجھے یاد آ گیا کہ جگر صاحب اسی شہر مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔ سٹیشن پر کافی رونق تھی۔ اس کے بعد بڑا شہر رام پور تھا۔ رام پور کے بعد بریلی کا سٹیشن آیا۔ ٹرین چلتی رہی۔ سٹیشن پر سٹیشن آتے اور گزر جاتے۔ کسی سٹیشن پر گاڑی رکتی' کسی سٹیشن کو چھوڑ کر گزر جاتی۔ شاہجہان پور آیا' سیتا پور آیا' پھر ہندوستان کا مشہور شہر لکھنؤ آ گیا۔ یہ انگریزوں کے زمانے کا لکھنؤ تھا۔ پلیٹ فارم کی طرز تعمیر سے اسلامی رنگ جھلکتا تھا۔ محرابی دروازے تھے۔ آدھی دیواروں پر پھولدار چمکیلی ٹائلیں لگی ہوئی تھیں۔ پان سگریٹ والے کا سٹال خوب سجا بنا تھا۔ کانچ کے ٹکڑوں کے رنگین پھول بنے ہوئے تھے۔ ایک عطر فروش کا سٹال بھی تھا جس کی پیشانی پر بڑی خوش خطی سے لکھا ہوا تھا۔ "اصغر علی محمد علی تاجران عطر" اس نام کا اشتہار ادبی رسالوں میں بھی میری نظر سے گزرا تھا۔

اخباروں کے سٹال پر لاہور کے سول اینڈ ملٹری گزٹ" ٹریبون اور کلکتے کے انگریزی اخبار سٹیٹسمین اور امرت بازار پتریکا رکھے ہوئے تھے۔ یہ اس زمانے کی مشہور انگریزی فرم وھیلر اینڈ وھیلر کے تھے۔ اگر میں بھول نہیں رہا تو اس فرم کا یہی نام تھا۔ چائے کے سٹال پر پولسن (Polson) بٹر اور جے پی منگا رام بسکٹ اور بروک بانڈ چائے کے چھوٹے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ زندہ دلان لکھنؤ ململ کے کرتوں میں ملبوس پان کھاتے پلیٹ فارم پر گھوم پھر رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر خس کے عطر کی خوشبو' بنارسی پانوں اور لپٹن چائے کی خوشبوؤں سے گھل مل رہی تھی۔ آج کا لکھنؤ جا کر ذرا دیکھیں عطر والوں کے سٹال پر سکھ بیٹھے پاپڑ وڑیاں بیچ رہے ہیں۔

ٹرین لکھنؤ سے چلی تو بنارس سے پہلے کچھ سٹیشنوں پر ضرور رکی تھی مگر مجھے وہ سٹیشن یاد نہیں رہے۔ جھریا نام کے ایک سٹیشن پر بھی ٹرین کچھ دیر کے لئے رکی تھی۔ جھریا میں کوئلے کی کانیں ہیں۔ یہاں انجن نے پانی اور پتھر کا کوئلہ لیا تھا۔ میں ڈبے سے نکل کر پلیٹ فارم پر ٹہلتا انجن کے قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ میلی کچیلی ساڑھیوں والی مزدور

عورتیں ایک سیڑھی پر چڑھ کر انجن کے پچھلے خانے میں پتھر کے کوئلوں کی ٹوکریاں الٹتی جاتی تھیں۔ اس عہد کی مشہور گانے والی کملا جھریا اسی شہر کی رہنے والی تھی۔

ہمارے گھر میں اس کی گائی ہوئی ٹھمریوں اور غزلوں کے چار پانچ ریکارڈ تھے جو میں گراموفون پر بجا کر سنا کرتا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ جب ٹرین بنارس پہنچی۔ بنارس شہر دریائے گنگا کے کنارے پر واقع ہے۔ ہندوؤں کا قدیم شہر ہے۔ اگرچہ اس شہر بنارس کی شہرت میں مسلمان دست کاروں' ہنرمندوں' موسیقاروں اور پارچہ بافوں کا بڑا ہاتھ ہے مگر بنارس پر دریائے گنگا کے دونوں کناروں پر واقع گھاٹوں کی وجہ سے اس شہر پر ہندوؤں کی چھاپ ہے۔

بسم اللہ خان شہنائی نواز کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ ان کی بجائی ہوئی شہنائی کا ریکارڈ آج بھی آل انڈیا ریڈیو کے ہر سٹیشن پر صبح صبح بجایا جاتا ہے۔ بسم اللہ خان کے مقابلے میں بعض ہندو شہنائی نوازوں نے بہت زور مارا مگر ان کی شہنائی میں وہ باریکیاں' لگاؤ اور نغمگی پیدا نہ ہو سکی جو قدرت نے بسم اللہ خان کو عطا کر رکھی ہے۔ بنارس کے شہر کے کنارے والے گھاٹوں کے پاس ہندو اپنے مردوں کو نذر آتش کرتے ہیں۔ یہ منظر بڑا عبرتناک ہوتا ہے۔ مردے بھوپانوں (بانس کے سٹریچروں) پر قطار میں رکھے ہوتے ہیں۔ مردے جلانے والے جنہیں شمشان کے باوے کہا جاتا ہے' باری باری مردے کو آگ پر رکھتے ہیں اور کچا بھنا کر کے دریا میں پھینک دیتے ہیں جہاں یہ ادھ جلے مردے بڑی بڑی مچھلیوں' کچھوؤں اور مگرمچھوں کی خوراک بن جاتے ہیں۔

جن مردوں کے آدمی ذرا بااثر ہوتے ہیں ان کے مردے پورے جلائے جاتے ہیں اور ان کی ہڈیاں دریا میں بہا دی جاتی ہیں۔ بنارس کے ہر گھاٹ پر ایک ننگ دھڑنگ (صرف لنگوٹی پہنے ہوئے) سادھو چھتری لگائے اپنے چیلوں کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ یہ بڑے موٹے پیٹ والے جٹادھاری اور پلے ہوئے سانڈوں ایسے سادھو ہوتے ہیں۔ ہندو عورتیں ان کے آگے پھل پھول اور پیسے رکھتی ہیں۔ یہ انہیں کیسر کا تلک لگاتے ہیں۔ بنارس میں دریائے گنگا کے دونوں کناروں پر بے شمار گھاٹ ہیں۔ یہاں سیڑھیاں دریا میں

اترتی ہیں جہاں ہندو عورتیں اور مرد قریب قریب ہی کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر دریا میں اشنان کرتے ہیں۔

ہر قسم کے گندے مندے میلے کچیلے لوگ گنگا میں آ کر نہاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جو ہندو ایک بار گنگا میں اشنان کر لے وہ پوتر ہو کر مرنے کے بعد کسی دوسرے روپ میں جنم لینے سے آزاد ہو جاتا ہے۔ گنگا اشنان پر مشہور طنزیہ شاعر راجہ مہدی علی خان نے ایک بڑی اچھی چھوٹی سی نظم لکھی تھی۔ نظم میں بھول گیا ہوں۔ اس کا مفہوم یہ نکلتا تھا کہ اے گنگا میں اشنان کرنے والے گندے مندے لوگو! تم نے تو گنگا میں نہا کر اپنا جسم صاف کر لیا' اب یہ بتاؤ کہ گنگا کہاں جا کر اشنان کرے؟

دریائے گنگا پر بھی انگریزوں نے بہت بڑا ریلوے پل بنایا ہوا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ٹرین دریائے گنگا کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ دریا کی ایک جانب بنارس شہر کے مکان اور مندر نظر آ رہے تھے اور دوسری جانب شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی بنوائی ہوئی تاریخی عالمگیری مسجد تھی جو سب سے الگ اور سب سے بلند ایک پرجلال اور باوقار انداز میں ایستادہ تھی۔ اس کے گنبدوں اور میناروں کے کلس غروب ہوتے سورج کی ارغوانی روشنی میں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کے بعد صوبہ بہار کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں صوبہ بہار کے شمال میں بھاگلپور سے 24 میل دور ایک قدیم یونیورسٹی وکرم شیلا ہوا کرتی تھی۔ نالندہ اور ٹیکسلا کے بعد یہ سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ اس یونیورسٹی کی چار دیواری اتنی بلند اور مضبوط تھی کہ علاؤ الدین خلجی نے اسے کافروں کا کوئی قلعہ سمجھ کر اس پر چڑھائی کر دی تھی۔ اس زمانے کے لوگ اپنی زبان میں یونیورسٹی کو وہار کہتے تھے جو بگڑتے بگڑتے بہار میں تبدیل ہو گیا اور پھر یہی اس صوبے کا نام پڑ گیا۔

ٹرین گیا کے سٹیشن پر ٹھہر گئی۔

صوبہ بہار میں گیا کا شہر گوتم بدھ کے ماننے والوں کا بڑا مقدس مقام ہے۔ اس

مقام پر برگد کے ایک درخت کے نیچے گیان دھیان میں مشغول گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ درخت آج بھی موجود ہے اور بدھ مذہب کے ماننے والے وہاں آکر نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اس موقع پر فائدہ اٹھاتے ہوئے گوتم بدھ کی زندگی پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

گوتم بدھ کا نام سدھارتھ تھا۔ وہ ساکیہ قبیلے کے سردار اور کپل وستو نام کی چھوٹی سی شہری ریاست کے راجہ کا بیٹا تھا۔ بچپن میں ایک کوڑھی فقیر اور ایک مردے کو دیکھ کر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آدمی کی زندگی کس قدر مصیبتوں اور دکھوں سے بھری ہوئی ہے۔ پھر جب سدھارتھ بڑا ہوا تو سچائی کی تلاش میں محل چھوڑ کر جنگلوں میں نکل گیا۔ سادھوؤں کی طرح جنگلوں میں پھرتا رہا۔ برہمنوں کی شاگردی کی‘ سخت تکلیفیں برداشت کیں۔ آخر قصبہ گیا کے قریب کہتے ہیں کہ ایک درخت کے نیچے اسے گیان حاصل ہوا اور اس نے زندگی کا راز پالیا۔ اس کے بعد گوتم کو بودھ یعنی جس نے عقل حاصل کر لی ہو‘ سچائی حاصل کر لی ہو‘ کہا جانے لگا۔

بودھ مذہب ذات پات کی تقسیم اور بتوں کی پوجا کے سخت خلاف ہے۔ بدھ مت کی تعلیم آدمی کو راست بازی اور نیک دلی کی ہدایت کرتی ہے۔ گوتم بدھ نے پانچویں صدی قبل از مسیح کے اواخر میں 80 سال کی عمر میں وفات پائی۔ ایک انگریز مصنف سر ایڈون آرنلڈ نے گوتم بدھ کی زندگی اور اس کی تعلیمات پر ”فائیٹ آف ایشیا“ کے نام سے انگریزی میں ایک طویل نظم کتابی صورت میں لکھی جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

آرنلڈ سنسکرت اور پالی زبان کا عالم تھا۔ اس نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی تھی اور اس کا انتقال 1904ء میں ہوا۔ اس نے پالی زبان میں لکھی ہوئی بدھ مت کی تعلیمات کو نظم کی شکل میں انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہاں اس طویل نظم کے دو ایک بند ترجمہ کر کے پیش کرتا ہوں۔

”تم جو بوگے وہی کاٹو گے

کسی کا حق نہ چھینو۔ جھوٹی گواہی نہ دو

کسی پر تہمت نہ لگاؤ۔ نہ جھوٹ بولو۔ منشیات سے دور رہو

دل میں نیک خواہشات رکھو

پتھر کے بت نہ سن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں

اپنے حواس پر قابو پائے رکھو

ٹرین گیا کے سٹیشن سے بھی چل پڑی۔

صوبہ بہار کے بعد بنگال کی سرزمین شروع ہو جاتی ہے۔ بنگال کے شروع ہوتے ہی مکانوں اور جھونپڑوں کے آگے تالاب دیکھے جن کی پتھر کی سیڑھیاں پانی میں اترتی تھیں۔ دھان کے کھیت ہی کھیت تھے۔ تاڑ اور ناریل کے درخت جگہ جگہ نظر آنے لگے تھے۔ ایک ہی دھوتی (ساڑھی) سے سارا جسم ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہوئی دیہاتی عورتیں جھونپڑوں کے باہر اور کھیتوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ دیہاتی مردوں کے بدن پر بھی گھٹنوں سے اونچی ایک دھوتی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

کالے کالے ننگ دھڑنگ بچے ریل گاڑی کو دیکھ کر کھیتوں میں اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔ تالابوں میں ماہی گیر جال ڈال کر مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ میں نے بنگال کی سرزمین اور بنگال کے کلچر کو نیو تھیٹرز کی فلموں میں دیکھا تھا۔ پہلی بار ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈھلانی چھتوں والے مکان تھے۔ مکانوں کی دیواریں بارش اور دھوپ کی مار سہہ سہہ کر کالی ہو رہی تھیں۔ بھائی جان نے مجھے بتایا کہ بنگال کے دو بڑے مشہور شاعر ہیں۔

ایک کا نام رابندر ناتھ ٹیگور ہے وہ ہندو ہے۔ دوسرے مسلمان بنگالی شاعر کا نام نذر الاسلام ہے۔ نذر الاسلام بنگالی مسلمانوں میں اور رابندر ناتھ ٹیگور بنگالی ہندوؤں میں مقبول ہے۔ نذر الاسلام کی نظمیں ایک خاص طرز میں گائی جاتی ہیں۔ اس کو نذر الگیتی کہتے ہیں۔ ٹیگور کی نظمیں بھی ایک خاص طرز میں گائی جاتی ہیں جس کو رابندر سنگیت کہتے ہیں۔

نذر الاسلام اپنی نظموں میں اسلام کی عظمت بیان کرتا ہے اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہو جانے کی تلقین کرتا ہے۔ دوسری بار جب میں اکیلا گھر سے بھاگ کر کلکتے آیا تو میں نے نذر الگیتی بھی سنی اور رابندر سنگیت بھی سنا۔ رابندر سنگیت کے مقابلے میں نذر الاسلام کے گیتوں میں ایک جوش' ولولہ اور گھن گرج کا عنصر غالب تھا۔

کلکتہ قریب آ رہا تھا۔ بہت بڑا شہر تھا۔ کئی سال پہلے اس شہر کی آباد کاریاں کارخانے وغیرہ شروع ہو گئے تھے۔ میں خدا کا شکر بجا لا رہا تھا کہ سارا راستہ ٹرین کے سفر میں میری آنکھوں میں انجن کے کوئلے کا کوئی ذرہ نہیں پڑا تھا۔ دھوئیں کی وجہ سے چہرے کا حلیہ ضرور بدل گیا تھا۔ بھائی جان ممتاز کا تعلق چونکہ چنیوٹ سے تھا اور کلکتے میں چنیوٹ کے سوداگروں کا بہت وسیع کاروبار تھا چنانچہ بھائی جان کو کلکتے میں چنیوٹ کے اپنے ایک عزیز کے ہاں قیام کرنا تھا۔

کلکتے کے دو سٹیشن ہیں۔ ایک کا نام ہوڑہ ہے' دوسرے کا نام سیالدہ ہے۔ ہماری ٹرین ہوڑہ کے سٹیشن پر رکی۔ وسیع و عریض پلیٹ فارم تھا۔ بھائی جان کے عزیز اور ان کی بیگم ہمیں لینے سٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ ایک بڑی سی پرانی گاڑی میں بیٹھ کر ہم بھائی جان کے عزیز کے چھ سات کمروں والے فلیٹ پر آ گئے۔ میزبان کو بھائی جان ملک صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ ملک صاحب کا خشک میووں کا کاروبار تھا اور لوئر چت پور روڈ پر ان کا گودام اور دفتر تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم کلکتے میں ملک صاحب کے ہاں دو دن ٹھہرے یا چار دن ٹھہرے۔ میں کلکتے کے بازاروں میں گھومتا رہا تھا۔ مگر چت پور روڈ اور لوئر چت پور روڈ کے آس پاس ہی رہتا تھا کہ اتنا بڑا شہر ہے کہیں بھٹک نہ جاؤں۔ لوئر چت پور روڈ پر ٹرام چلتی تھی۔ ابھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس علاقے میں ذکریا سٹریٹ بھی ہے جہاں امرتسر کے کشمیری شال مرچنٹ' شال باف اور رفوگر کاروبار کرتے ہیں اور وہاں مسجد ناخدا بھی ہے اور امجدیہ ہوٹل بھی ہے۔

ان ساری جگہوں کا انکشاف مجھے میرے کلکتے کے دوسرے پھیرے پر ہوا۔ اس

وقت میرے لئے کلکتہ صرف چت پور روڈ تک ہی محدود تھا۔ اسی سڑک پر کافی آگے جا کر جہاں ڈلہوزی سکوائر شروع ہوتا تھا۔ ایک سینما ہاؤس بھی تھا جہاں بیسے ٹاکیز کی اشوک کمار اور لیلا چٹنس والی فلم کنگن اپنے 75 ویں ہفتے میں چل رہی تھی۔

رنگون جانے کے لئے کسی پاسپورٹ ویزے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ایک روز ہم بندرگاہ پر جا کر محکمہ امیگریشن والوں سے اپنا میڈیکل چیک اپ کروا آئے تھے۔ ہمیں ٹیکے بھی لگا دیئے گئے تھے۔ رنگون کے بحری سفر کے ٹکٹ بھی منگوا لئے گئے تھے۔ اب اس دن کا انتظار کر رہے تھے جس دن جہاز نے اپنے شیڈول کے مطابق کلکتے سے رنگون روانہ ہونا تھا۔

◆......◆......◆

لوئر چت پور روڈ کے چوک میں ایک بہت بڑی بلڈنگ تھی جس میں بے
ایک ایک دو دو کمروں والے فلیٹ تھے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس بلڈنگ کا نام سرا
بلڈنگ ہے۔ سراج بلڈنگ کے بڑے گیٹ کی دونوں جانب پان سگریٹ کی دکانیں تھیں
بنگالی گانوں کی ریکارڈنگ ہوتی رہتی تھی۔ بنگالی دکاندار احمد آبادی اور بنارسی پان لگا لگا
رکھے جاتے تھے۔ ان کے دو شاگرد لڑکے انہیں لپیٹ لپیٹ کر گاہکوں کو تھما دیتے تھے۔
بنارسی پان کا رنگ زرد ہوتا تھا۔ احمد آبادی پان کا پتا چوڑا اور خستہ ہوتا تھا۔
پان کبھی کبھار ہی کھاتا تھا۔ ہاں لک چھپ کر سگریٹ ضرور پیتا تھا۔ یہ سگریٹ پینے کی
عادت مجھے سکول کے زمانے سے ہی پڑ گئی تھی۔ اس زمانے میں جو سگریٹ ہوتے تھے
کے نام یہ ہیں۔ اعلیٰ کوالٹی کے سگریٹ کریون اے' کیتھڈرل' گولڈ فلیک' سٹیٹ ایکسپ
اور کیپسٹن۔ درمیانے درجے کے سگریٹ قینچی' پاسنگ شو وغیرہ بہت مقبول تھے۔ تیسر
درجے کے سگرٹوں میں سپورٹس' نیوی بلیو تھے اور سب سے کم تر کوالٹی کے سگرٹوں
ٹیلیگراف نام کا سگریٹ محنت کش طبقے میں بڑا مقبول تھا۔ اس کو تار کا سگریٹ بھی
تھے۔ اس کے دھوئیں کی بو اس قدر ناگوار ہوتی تھی کہ اچھا سگریٹ پینے والا آدمی
سگریٹ پینے والے کے پاس نہیں بیٹھ سکتا تھا۔
یہ سگریٹ چاہے کتنے گھٹیا تھے مگر ان میں یہ خوبی ضرور تھی کہ جو کچھ بھی ان
اندر بھرا ہوا ہوتا تھا اصلی ہوتا تھا۔ نقلی نہیں ہوتا تھا۔ درمیانے اور اعلیٰ درجے کے سگر
میں ہر برانڈ کا ذائقہ اور اس کی خوشبو الگ ہوتی تھی۔ اس کے دھوئیں سے آدمی کو

جاتا تھا کہ یہ شخص فلاں سگریٹ پی رہا ہے۔ بھائی جان کریون اے اور گولڈ فلیک کے
سگریٹ پیتے تھے۔ جس کے پیکٹ بھی ہوتے تھے اور بند گول ڈبوں میں بھی ملتا تھا۔ یہ
گول ڈبے ائر ٹائٹ یعنی ہوا بند ہوتے تھے۔ ہر ڈبے میں پچاس سگریٹ ہوتے تھے اور
انہیں جب کھولا جاتا تھا تو اندر سے جو پہلی خوشبو نکلتی تھی اسے سگریٹ پینے والے بڑی
اہمیت دیتے تھے۔ کینسر اور ہارٹ اٹیک کا نام ہم نے کبھی نہیں سنا تھا۔ صرف ٹی بی کی بیماری
ہوتی تھی جس سے لوگ بڑا خوف کھاتے تھے اور یہ مرض اس زمانے میں لاعلاج سمجھا جاتا
تھا۔

اس زمانے کی فلموں میں بھی ہیرو کو ٹی بی کا مرض ہی لاحق ہوتا تھا۔ کبھی کوئی ہیرو یا
ہیرو کا باپ کینسر یا ہارٹ اٹیک سے نہیں مرا تھا۔ اس زمانے کی سب سے مشہور فلم جس نے
کامیابی کے ریکارڈ قائم کیے تھے مشہور گلوکار سہگل کی فلم "دیوداس" تھی۔ اس فلم میں بھی ہیرو کو
ٹی بی ہو گئی تھی اور اسی مرض نے اس کی جان لے لی تھی۔ اس زمانے میں بمبئی کی فلم کمپنی بمبے
ٹاکیز اور کلکتے کی فلم کمپنی نیو تھیٹرز کے فلمی گانے بہت مشہور تھے۔ فلم "دیوداس" کا گانا "بالم
آئے بسو میرے من میں" اور بمبے ٹاکیز کی فلم نوجوان کا گانا۔ "چل چل رہے نوجوان" ہر
نوجوان کی زبان پر تھا۔

خال خال گھروں میں پرانی ٹائپ کا کوئی ریڈیو ہوتا تھا۔ گراموفون ضرور ہوتے
تھے جن پر فلمی گانوں اور اندو بالا' کملا جھریا' بھائی چھیلا پٹیالے والا' اختری بائی فیض آبادی'
ہگل' کانن بالا اور پنکج ملک کے ریکارڈ بجا کر سنے جاتے تھے۔ پان سگریٹ کی دکانوں اور
وٹلوں' ریستورانوں میں بھی گراموفون پر ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ ابھی لاؤڈ سپیکروں کا رواج
ہیں چلا تھا۔ سینما گھروں میں لاؤڈ سپیکر پر ضرور ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ کولمبیا کمپنی کے گرامو
ن کے مقابلے میں ہز ماسٹرز وائس کا گراموفون کی کوالٹی بہت اعلیٰ ہوتی تھی۔ ان کے
ماؤنڈ بکس میں سے آواز بڑی صاف اور سریلی نکلتی تھی۔ ہز ماسٹر وائس کا گراموفون بڑے
مائز کا بھی ہوتا تھا اور اٹیچی کیس کی طرح کا بھی ہوتا تھا۔ ہز ماسٹرز وائس کی ریکارڈ بجانے
لی سوئیاں بھی الگ ڈبی میں آتی تھیں جس پر ہز ماسٹرز وائس کے گراموفون اور کتے کی

تصویر بنی ہوئی ہوتی تھی۔

گراموفون چابی دینے سے چلتا تھا۔ اس کے اندر سپرنگ ہوتا تھا جو چابی د
سے کس جاتا تھا۔ چابی دیتے وقت بڑی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ چابی دینے والی ہتھی کا
ایک چکر بھی زیادہ ہو جاتا تھا تو گراموفون کا سپرنگ جسے لر کہتے تھے ٹوٹ جاتا تھا اور
نیا سپرنگ ڈلوانا پڑتا تھا۔ چابی کم دی جاتی تو گھومتے ہوئے ریکارڈ کی رفتار دھیمی ہو
تھی اور ایسے لگتا تھا جیسے گانے والا گاتے گاتے سو گیا ہو۔ اس وقت فوراً چابی دی جاتی
اور گانے والے کی آواز ایک بار تیز ہو کر دوبارہ نارمل ہو جاتی تھی۔

جس روز ہم کلکتے سے رنگون روانہ ہوئے اس روز آسمان پر بادل چھائے ہو
تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ ہم لوگ اپنے ساز و سامان
ساتھ کلکتے کی بندرگاہ خضر پور جیٹی پر پہنچ گئے۔ رنگون جانے والے مسافر ایک بہت کا
ہال کمرے میں اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ ان میں ہندوستان کے تقر
صوبے کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ سورتی میمن لوگوں اور پوربیوں اور مدراسیوں کی تع
زیادہ تھی۔ ایک سردار جی بھی اپنے اہل خانہ کے ساتھ فرش پر دری بچھائے بیٹھے کوئی ک
پڑھ رہے تھے۔ جنگ لگی ہوئی تھی اور ہٹلر کی آپ بیتی ''میری جدوجہد'' اس زمانے
بڑی مشہور کتاب تھی۔ یہ سردار جی بھی ہٹلر کی آپ بیتی والی کتاب کا اردو ترجمہ ہی پڑھ
تھے۔ ہماری فیملی بھی ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ عورتیں آپس میں باتیں کرنے لگ
سردار جی بھائی جان سے باتیں کرنے لگے۔ سردار جی کا رنگون میں کوئی کاروبار تھا۔
انہیں معلوم ہوا کہ رنگون سے جو اردو اخبار شائع ہوتے ہیں بھائی جان ان اخبارو
ایڈیٹر ہیں تو وہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے ہٹلر کی کتاب دکھا کر بھائی جان سے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ نے ہٹلر کی 'میری جدوجہد' پڑھی ہے؟''

اردو میں اس کتاب کا نام ''میری جدوجہد'' تھا۔ بھائی جان نے بتایا کہ ا
نے وہ کتاب پڑھ رکھی ہے۔ سردار جی بولے۔

''بڑی زبردست کتاب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آج کے زمانے میں ہمیں

ایسے لیڈر کی ضرورت ہے۔ یہ بکری کا دودھ پینے والے دھوتی پوش کانگریسی لیڈر ہمیں
انگریزوں کی غلامی سے آزاد نہیں کرا سکتے۔ کیا خیال ہے ملک صاحب؟''

بندرگاہ کے ہال کمرے میں مسافروں کے رش کی وجہ سے حبس ہو رہا تھا۔ لوگوں
کا شور بھی بہت تھا۔ میں نے ایک مسافر کو دیکھا کہ وہ پریشانی کے عالم میں کبھی ہال کے
اس گیٹ پر جاتا تھا جہاں ہمیں ٹکٹ اور میڈیکل کے کاغذات دکھا کر جہاز کے پاس جانا تھا
اور کبھی دوڑ کر دوسرے گیٹ کی طرف چلا جاتا۔ اس آدمی کا گھبرایا ہوا پسینے میں شرابور زرد
چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ گجراتی ہے اور ہندوستان سے
جو مال برما لے جا رہا تھا اس کو بندرگاہ کے حکام نے کسی وجہ سے عین وقت پر روک لیا ہے۔

معلوم نہیں اس گجراتی تاجر کے ساتھ بعد میں کیا ہوا۔ ہم سپیکر پر اعلان ہونے
کے بعد ٹکٹ اور میڈیکل کے کاغذات دکھا کر بندرگاہ کے وارف یعنی پلیٹ فارم پر آ گئے۔
بہت بڑا بحری جہاز جیٹی کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ دو جگہوں پر سیڑھیاں لگی تھیں۔ ایک سیڑھی
درمیانے اور نچلے ڈیک والے مسافروں کے لئے تھی اور دوسری سیڑھی اوپر والے ڈیک
یعنی عرشے کے لئے تھی۔ سیکنڈ اور فرسٹ کلاس کے مسافر نچلی سیڑھی کے ذریعے جہاز پر سوار
ہو رہے تھے اور تھرڈ کلاس کے مسافر اوپر والی سیڑھی کے ذریعے عرشے پر جا رہے تھے۔
ہمارے ٹکٹ سیکنڈ کلاس کے تھے۔ جیٹی کے قلیوں نے ہمیں اپنے نمبر دے کر ہمارے کیبن کا
نمبر لے لیا تھا۔ سامان ایک اور تختہ نما سیڑھی کے ذریعے جہاز پر چڑھایا جا رہا تھا۔

میں پہلی بار کسی بحری جہاز میں داخل ہو رہا تھا۔ جہاز کے خلاصی نیلی وردیوں
میں ملبوس گھوم پھر کر اپنے اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔ ہر طرف ایک ہنگامہ برپا تھا۔
مسافر ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے۔ جہاز کی گیلری میں آتے ہی مجھے کافی'
تمباکو اور مشین کے جلے ہوئے تیل کی ملی جلی بو محسوس ہوئی۔ ہمارے کیبن کے آگے لمبی راہ
داری تھی۔ میں راہ داری کے جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور نیچے مسافروں کو ادھر ادھر
دوڑتے بھاگتے' بچوں کو سنبھالتے اور قلیوں کو سامان اٹھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ میں نے
جھک کر جہاز کے پینڈے پر نگاہ ڈالی۔ پلیٹ فارم کی دیوار اور جہاز کے پینڈے کے

درمیان جگہ جگہ بڑے بڑے ربڑ کے ٹائر پھنسے ہوئے تھے۔ یہ اس لئے رکھے جاتے تھے ک جہاز کی دیوار پلیٹ فارم کی دیوار سے رگڑ نہ کھائے۔

میں سیکنڈ کلاس کی راہ داری کا زینہ چڑھ کر اوپر عرشے یعنی کھلے ڈیک پر آ گیا آسمان پر بادل تھے۔ سفید پرندے جہاز کی ایک جانب اڑ رہے تھے اور دریا میں مسافروں کے گرائے ہوئے ڈبل روٹی وغیرہ کے ٹکڑے غوطہ لگا کر اٹھاتے اور اوپر کو نکل جاتے تھے۔ جہ دریا میں کھڑا تھا۔ یہ جمنا دریا ہے جو بنگال میں داخل ہونے کے بعد ہگلی کے نام سے پکارا جا ہے۔ یہ دریا آگے جا کر خلیج بنگال کے سمندر میں گرتا ہے۔ خلیج بنگال کے سمندر کو کالا پانی بھ کہا جاتا ہے۔

بھائی جان کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اس سمندر کا پانی کالا سیاہ ہے مگر صرف دیکھنے میں کالا سیاہ نظر آتا ہے۔ چلو میں بھر کر دیکھو تو وہ کالا نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا ک اس کی وجہ خلیج بنگال کے سمندر کی تہہ میں اگی ہوئی سیاہ جھاڑیاں اور سیاہ چٹانیں ہیں بہر حال میں اس سمندر کے سیاہ پانی کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھا کیونکہ میں نے ا وقت تک یہی سنا اور پڑھا تھا کہ سمندر نیلا ہوتا ہے۔ سمندر کالا بھی ہوتا ہے یہ میں نے کہ نہیں پڑھا تھا۔

میں دریا کی دوسری طرف عرشے کے جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر دریا کا نظا کرنے لگا۔ دریا کا پاٹ اتنا کشادہ نہیں تھا۔ دور کنارے پر درختوں کے جھنڈ دکھائی د رہے تھے۔ دریا کا پانی گدلا تھا۔ کچھ فاصلے پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں چل رہی تھیں۔ دریا سطح کافی نیچی تھی۔ یہ تین چار منزلہ جہاز کافی بڑا تھا۔ مجھے جنگلے پر جھک کر دریا کی سطح دیکھنا پڑتا تھا۔

آبی پرندے اڑ رہے تھے۔ چکر لگا رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے اور غوطے لگا لگا دریا کی سطح پر سے اپنی خوراک اٹھا رہے تھے۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ عرشے کے د میں بہت بڑی آہنی چھت کے نیچے تھرڈ کلاس کے مسافروں نے اپنے اپنے سامان لگا کر ب وغیرہ لگا لئے تھے۔ ان مسافروں میں زیادہ تعداد مدراسیوں اور پوربیوں کی تھی۔ ان کی عورت

اور بچے بھی ساتھ ہی تھے۔ کچھ مسافروں نے چادریں تان کر پردہ کیا ہوا تھا۔ ذرا آگے لوہے کا ایک گول چکر تھا جس کے ساتھ لنگر کی موٹی زنجیر لپٹی ہوئی تھی۔ یہ سمندر میں لنگر پھینکنے والی مشین تھی۔

میں جہاز کے اس مقام پر جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سامنے کی جانب جہاز کی دونوں طرف کی دیواریں آ کر مل جاتی تھیں۔ یہ جہاز کا شمالی سرا تھا۔ یہاں ایک لمبے پول پر جہاز کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہاں بیٹھنے کی چھوٹی سی جگہ بنی ہوئی تھی۔ میں وہاں بیٹھ گیا اور جھانک کر دریا کی گدلی لہروں کو دیکھنے لگا جو بے معلوم انداز میں جہاز کے پیندے سے آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ یہاں جہاز کے اوپر والے حصے کے ایک گول سوراخ میں سے لنگر کا موٹا سنگل نیچے جا کر دریا میں اتر گیا تھا۔ جہاز لنگر انداز تھا۔

کچھ دیر یہاں بیٹھے رہنے کے بعد میں نیچے کیبن میں آ گیا۔ بھائی جان کہنے لگے۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے؟ آؤ بیٹھو۔ تھوڑی دیر میں کھانے کا ٹائم ہو جائے گا۔ میں نے کھانا کیبن میں ہی منگوایا ہے۔“

مگر میرے پاؤں نہیں ٹکتے تھے۔ میں تھوڑی دیر کے بعد کیبن سے نکل آیا اور کیبن کے سامنے جو گیلری تھی اس کے جنگلے کے ساتھ لگ کر جیٹی کے پلیٹ فارم کو دیکھنے لگا جہاں ابھی تک مسافروں کی ریل پیل لگی ہوئی تھی۔ میں بڑی بے چینی سے جہاز کے چلنے کا منتظر تھا۔ پھر پلیٹ فارم پر ایک سفید اور نیلی وردی والا کوئی آفیسر نمودار ہوا۔ وہ جہاز کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا اور گلے میں لٹکی ہوئی سیٹی دو تین بار زور زور سے بجائی۔ پلیٹ فارم پر ہلچل سی مچ گئی۔ میں نے دیکھا کہ نیلی وردیوں والے قلی جہاز کی سیڑھیوں سے جلدی جلدی اتر رہے تھے۔ اس کے بعد پلیٹ فارم مسافروں سے تقریباً خالی ہو گیا۔ سیکنڈ کلاس کے دوسرے مسافر مرد عورتیں بھی کیبن سے نکل کر گیلری میں آ گئے۔ بھائی جان بھی باہر آ گئے۔ کہنے لگے۔

”لو بھئی جہاز چلنے لگا ہے۔“

میں بہت خوش ہوا کہ اب میرا پہلا سمندری سفر شروع ہونے والا ہے۔ میں نے

بھائی جان سے پوچھا کہ جہاز سمندر میں کس وقت پہنچے گا۔ کہنے لگے۔

''رات کو کسی وقت پہنچے گا۔''

جہاز کی سیڑھیاں اتاری جانے لگیں۔ پھر جہاز کے خلاصیوں نے اوپر جہاز ساتھ بندھے ہوئے موٹے موٹے رسے کھول کر نیچے پھینکنے شروع کر دیئے۔ جہاز ابھی ساکن تھا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد گڑ گڑ گڑ کی آ آنے لگی۔ بھائی جان بولے۔

''جہاز کا لنگر اٹھایا جا رہا ہے۔''

لنگر اٹھائے جانے کی آواز غائب ہوئی تو جہاز کے انجن چلا دیئے گئے۔ جہا گیلری کے فرش پر لرزش پیدا ہونے لگی۔ انجنوں کی آواز دبی دبی سی تھی۔ جیسے دور نیچے تہہ خانے میں چل رہے ہوں۔ جہاز نے ہارن بجانا شروع کر دیئے۔ بڑی زوردار آواز تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جہاز نے چھ سات بار ہارن بجایا اور جہاز کو ہلکا سا جھٹکا اس وقت پلیٹ فارم یعنی جیٹی پر مسافروں کو الوداع کہنے والے لوگوں کا ایک ہجوم ہو گیا جس میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔ اوپر ڈیک پر کلاس کی گیلری اور فسٹ کلاس کی گیلری کے جنگلے کے ساتھ بھی مسافروں کا ایک ہجو تھا۔ وہ بھی ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے عزیزوں اور دوستوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ میں جہا دیوار کو نیچے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جہاز نے ہلنا شروع کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ جیٹی پیچھے ہٹ رہا تھا۔

جیٹی کی دیوار اور جہاز کے درمیان فاصلہ پیدا ہو رہا تھا اور یہ فاصلہ آہستہ آ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ جہاز نہ دائیں طرف مڑ رہا تھا نہ بائیں طرف مڑ رہا تھا۔ وہ پور پورا آہستہ آہستہ پیچھے کو ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ یہ جہاز کافی پیچھے چلا گیا تو وہ بے معلوم انداز دائیں جانب سے بائیں جانب گھومنے لگا۔ جہاز اپنا رخ موڑ رہا تھا۔ بندرگاہ پیچھے ہو رہی تھی۔

بھائی جان کیبن میں چلے گئے تھے۔ میں راہ داری کا زینہ چڑھتا ہوا اوپر

ڈیک پر آ گیا اور جہاز کے سرے پر جا کر بیٹھ گیا۔ جہاز کی تکونی نوک دریا کی لہروں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ آبی پرندے جہاز کے اوپر چکر لگا رہے تھے۔ دریا کافی نیچے تھا۔ بندرگاہ کی عمارت کافی پیچھے ہو گئی تھی۔ اور پلیٹ فارم سمیت پوری کی پوری نظر آنے لگی تھی۔ جہاز دریا میں آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ عرشے پر جہاز کے خلاصی کل پرزوں کی طرح اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ پوربیے ایک طرف اپنے سامان کے پاس بیٹھے ڈھولک بجا کر کچھ گانے لگے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کھانا کیبن میں آ گیا ہو گا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں کیبن میں آیا تو کھانا لگ چکا تھا۔ میں نے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ جہاز کا کھانا بڑا مزیدار تھا۔ بھائی جان کے چنیوٹ والے دوست ملک صاحب نے خشک میووں کی ایک ٹوکری بھر کر ساتھ کر دی تھی۔ ہمشیرہ صاحبہ نے کھانے کے بعد خشک میوے نکال کر پلیٹ میں رکھ دیئے۔ میں نے تھوڑے سے میوے اور بادام جیب میں ڈالے اور یہ کہہ کر اوپر ڈیک پر آ گیا کہ میں جہاز کو چلتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔

اس وقت جہاز کلکتہ کی خضر پور جیٹی سے کافی آگے نکل آیا تھا اور اس کی عمارت بائیں جانب کھلونے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ سورج بدستور بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ دریا کے کنارے کافی دور دور ہو چکے تھے۔ جیٹی کے کنارے کی جانب کچھ جہاز بہت فاصلے پر کھڑے آہستہ آہستہ چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔ دوسرے کنارے درخت اب ایک سیاہ لکیر میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا تھا۔ سامنے کی جانب دریا ہی دریا تھا اور کوئی شے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

آبی پرندوں کے جمگھٹے ختم ہو گئے تھے۔ صرف چند ایک پرندے ابھی تک جہاز کے اوپر منڈلاتے ہوئے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ خوشگوار ہوا کے جھونکے معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ ہوا میں دریا کی نمی کی خوشبو تھی۔ جہاز بڑے معمولی انداز میں کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب ڈول رہا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے موٹر اور لاری میں سفر کرتے ہوئے چکر آ جایا کرتے تھے۔ مجھے یہ فکر بھی لگی ہوئی تھی کہ اگر جہاز میں چکر آنے لگے تو کیا کروں گا۔ موٹر میں یا لاری میں چکر آتے تھے تو لاری رکوا کر نیچے اتر جاتا تھا لیکن اگر جہاز میں چکر

آنے لگے تو کیا کروں گا؟ نہ میں جہاز کو رکوا سکوں گا' نہ نیچے اتر سکوں گا۔ جہاز کے ڈولنے
کے باوجود جب مجھے ایک بھی چکر نہ آیا تو میں بڑا خوش ہوا کہ سفر بڑے آرام سے کٹ
جائے گا اور میں اس سے خوب لطف اندوز ہوں گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ابھی جہاز سمندر
میں داخل نہیں ہوا۔ سمندر میں داخل ہونے کے بعد جہاز جس طرح ڈولے گا اور مرا جو حال
ہوگا وہ میرا حلیہ بگاڑ دے گا۔

جہاز کی تکونی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے جب میں تھک گیا تو نیچے اپنے کیبن میں آ گیا۔
دن گزرتا جا رہا تھا۔ میں کیبن کی اوپر والی برتھ پر لیٹ کر سو گیا۔ کافی دیر سویا رہا۔ جب اٹھا
تو سب سے پہلے میں نے یہ محسوس کرنے کی کوشش کی کہ جہاز کے ڈولنے کی کیا کیفیت
ہے۔ جہاز اسی طرح معمول کے مطابق ڈول رہا تھا۔ ہمشیرہ صاحبہ نے بتایا کہ شام کے پانچ
بجنے والے ہیں۔ ہم دس گیارہ بجے دن کے وقت کلکتے سے چلے تھے۔ میں اوپر ڈیک پر آ
گیا۔ دریا کے دونوں کنارے غائب ہو چکے تھے۔

◆......◆......◆

میں نے دن کی ڈھلتی روشنی میں نیچے جھانک کر دریا کو دیکھا اور دریا کے پانی کا
رنگ جو پہلے گدلا تھا اب اس میں نیلاہٹ آنا شروع ہو گئی تھی۔ ایک آدمی میرے پاس ہی
کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ سمندر ہے؟ اس نے مسکرا کر کہا۔

''سمندر ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو سمندر بہت دور ہے۔ ابھی تو دریا' سمندر کی
لہروں سے مل رہا ہے۔''

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاز کے اوپر اب کوئی آبی پرندہ نہیں منڈلا رہا
تھا۔ آبی پرندے جہاز کو الوداع کہہ کر واپس جا چکے تھے۔ جہاز بھی کچھ زیادہ ڈولنے لگا تھا۔
مجھے چکر تو نہیں آ رہے تھے۔ لیکن اس خیال سے کہ عرشے پر رہ کر چکروں کا احساس زیادہ
نہ ہو جائے میں نیچے کیبن میں آ گیا۔ بھائی جان کپڑے بدل چکے تھے۔ کہنے لگے۔

''چلو یار! ٹی روم میں چل کر چائے پیتے ہیں۔''

ہم کیبن سے نکل کر جہاز کی بائیں طرف والی گیلری میں آ گئے۔ یہاں سے دریا
نظر آ رہا تھا۔ دن کی روشنی شام کے بڑھتے ہوئے دھندلکے میں غائب ہو رہی تھی۔ جہاز
کے ٹی روم میں چھوٹی چھوٹی گول میزوں پر گلدان سجے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔
بڑے سنجیدہ قسم کے لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں ہندوستانی بھی تھے اور دو تین
انگریز بھی نظر آ رہے تھے۔ بڑی خاموشی تھی فضا میں۔ وردی پوش بیرے ٹرے میں چائے
اور کھانے پینے کی چیزیں رکھے بے آواز قدموں سے ہر میز پر جا کر چیزیں وغیرہ رکھ رہے
تھے۔ میں اور بھائی جان بھی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے چائے اور چکن سینڈوچز کا

آرڈر دیا۔ یہاں بیٹھ کر جہاز کی حرکت بہت خفیف محسوس ہو رہی تھی۔ بھائی جان کو علم تھا کہ مجھے لاری میں ہی چکر آ جاتے ہیں کہنے لگے۔

''فکر نہ کرو...... جہاز میں اگر چکر آئے تو یہاں کے ڈاکٹر دوائی سے اسے بالکل ٹھیک کر دیتے ہیں۔''

پھر چائے آ گئی۔ اس وقت تک چائے کے ساتھ میری دوستی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ بس دور دور سے سلام دعا ہی ہوتی تھی۔ میرے مزاج میں چائے کا ذوق ضرور موجود تھا مگر مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ اتنا یاد ہے کہ چائے بڑی مزیدار تھی۔ کچھ دیر ٹی روم کی پرسکون فضا میں بیٹھنے کے بعد ہم واپس اپنے کیبن کی طرف چل پڑے۔ میں نے گیلری کے جنگلے کی طرف دیکھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور دریا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہوا بھی تیز اور ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ رات کا کھانا بھی ہم نے کیبن میں ہی منگوا کر کھایا۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ ساری رات سویا رہا۔ کافی دن چڑھے مجھے بھائی جان نے جگایا اور کہا۔

''اوپر جا کر دیکھو جہاز سمندر میں داخل ہو گیا ہوا ہے۔''

سب سے پہلے میں نے برتھ کی زنجیر کو پکڑ کر یہ دیکھا کہ جہاز زیادہ تو نہیں ڈول رہا لیکن جہاز زیادہ نہیں ڈول رہا تھا۔ اس کی رولنگ میں صرف اتنا فرق پیدا ضرور ہوا تھا کہ پہلے دائیں اور بائیں خفیف انداز میں ڈولتا تھا اب تھوڑا تھوڑا اوپر نیچے بھی ہو رہا تھا مگر مجھے کوئی چکر نہیں آ رہا تھا۔ میں جلدی سے جہاز کے عرشے پر آ گیا۔ وہاں اور مسافر بھی جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔

کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف کالا سیاہ سمندر ہی سمندر ہے۔ سامنے کی جانب سے سمندر کی لہروں کو چیرتا ہوا جہاز اوپر نیچے ہوتا' کبھی تھوڑا سا آگے کو جھکتا اور پھر اوپر کو اٹھتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جہاز کی تکون سے سمندر کی سیاہ فام تارکول ایسی لہریں ٹکرا ٹکرا کر سفید جھاگ پیدا کر رہی تھیں۔ ہوا بھی تیز ہو گئی تھی۔

اس وقت مجھے پہلا جو خیال آیا تھا' وہ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اگر میں کسی لاری وغیرہ میں سفر کر رہا ہوتا اور لاری بے قابو ہو کر آگے کسی

درخت سے یا کسی دوسری لاری سے ٹکرانے لگتی یا اس میں اچانک آگ لگ جاتی تو میں لاری میں سے چھلانگ لگا کر جان بچا سکتا تھا لیکن یہاں تو چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ ہیبت ناک سمندر ہی سمندر ہے۔ اگر جہاز ڈوب گیا تو میں بھی اس کے ساتھ ہی ڈوب جاؤں گا۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کرہ ارض پر سمندر ہی سمندر ہے۔ زمین کہیں نہیں ہے۔ مجھ پر کالے سیاہ اور بڑی بڑی موجوں والے سمندر کی ہیبت سی طاری ہو گئی۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا اور میں جلدی سے نیچے کیبن میں آ گیا۔ اس وقت میرے دل میں زمین کی محبت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

ایک بات کی وضاحت میں ایک بار پھر اپنے قارئین کرام کے سامنے کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ اس سے پہلے میں نے برما اور سری لنکا کے سفر کے بارے میں چند ایک کتابیں لکھی ہیں جن میں ایک تو افسانوی اور ناول کا رنگ غالب تھا۔

دوسرے بعض جگہوں پر مصلحت کی بنا پر میں نے کچھ نام حذف کر دیئے تھے اور بعض واقعات کو افسانوی انداز میں پیش کیا گیا تھا لیکن اس سفرنامے کو میں پوری تفصیل کے ساتھ اپنے حقیقی روپ میں پیش کر رہا ہوں اور کسی مصلحت سے کام نہیں لیا جا رہا۔ تاکہ قارئین کرام کو اس زمانے کے حالات و واقعات اور لوگوں کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کی جا سکیں۔

اس وقت ہمارا جہاز کلکتے کے دریائے ہگلی کے ڈیلٹے سے نکل کر خلیج بنگال کے سمندر میں' جس کو کالا پانی کہتے ہیں داخل ہو چکا ہے۔ اس کالے سمندر کو دیکھنے سے ہی بدن پر خوف سا طاری ہوتا تھا۔ کئی کئی میل لمبی موجیں دور دور سے آ کر جہاز سے ٹکرا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جہاز سمندر کے رحم و کرم پر ہے۔ جہاز کی رولنگ شروع ہو گئی تھی لیکن اس نے ابھی شدت اختیار نہیں کی تھی۔ موجیں کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب سے تھوڑا سا اوپر اٹھا کر پھر نیچے لے آتی تھیں۔ جہاز کی ایک اور حرکت بھی تھی وہ تھوڑا سا آگے کو جھک کر پھر اوپر اٹھ آتا تھا۔ مجھے معمولی سے چکر آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہوا بھی

بڑی تیز چل رہی تھی۔ اس ہوا میں سمندر کی نمکین نمی تھی جو چہرے اور کپڑوں سے چپک رہی تھی۔ آسمان پر بادل گھرے ہو رہے تھے۔ پھر بونداباندی شروع ہو گئی۔ میرے چکروں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نیچے آ گیا اور برتھ پر لیٹ گیا۔

جہاز کی رولنگ جاری تھی۔ بھائی جان نے کہا کہ کچھ کھا لو۔ کھانے سے چکر ختم ہو جائیں گے۔ انہوں نے مجھے تھوڑا سا خشک میوہ دیا۔ میرا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر بھی ایک دو بادام اور میوے کھا لئے۔ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ اٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ باتھ روم سے واپس آیا تو طبیعت قدرے زیادہ خراب ہونے لگی تو بھائی جان مجھے جہاز کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے مجھے دوائی کی ایک ایک ڈبل خوراک پلائی جس کے بعد چکر آہستہ آہستہ غائب ہو گئے اور طبیعت کچھ سنبھل گئی۔

ساری رات جہاز بری طرح ڈولتا رہا۔ کبھی ایک دم نیچے چلا جاتا اور پھر سے اوپر کو اٹھنے لگتا۔ دائیں بائیں بھی رولنگ کر رہا تھا۔ ہمشیرہ صاحبہ نے مجھے بتایا کہ سمندر میں طوفان آیا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ یہ برسات کا موسم تھا۔ اس موسم میں خلیج بنگال کے سمندر میں بڑی بارشیں ہوتی ہیں اور طوفان اٹھتے ہیں۔ ہمیں بھائی جان کی رنگون میں اخباری ذمے داریوں کی وجہ سے اس موسم میں سفر کرنا پڑا تھا۔

ڈاکٹر نے مجھے جو دوائی پلائی تھی اس کی وجہ سے مجھے چکر آنا تو بند ہو گئے تھے لیکن یہ خوف پیدا ہو گیا تھا کہ اگر جہاز سمندر میں ڈوب گیا تو ہم سب اس کے ساتھ ہی ڈوب جائیں گے۔ وہاں بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ساری رات اس ڈر خوف میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو جہاز کی رولنگ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا بلکہ رولنگ زیادہ ہو گئی تھی۔ چونکہ میرے سر کے چکر بند ہو گئے تھے اس لئے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اوپر جہاز کے عرشے پر جا کر دیکھنا چاہئے کہ سمندری طوفان کیسا ہوتا ہے؟

میں کسی بہانے کیبن سے نکل کر راہ داری کی سیڑھیوں کا سہارا لیتا اوپر ڈیک پر آ گیا۔ بارش ہو رہی تھی۔ دن کا وقت تھا۔ میں زینے کی سب سے اوپر والی سیڑھی پر دونوں ہاتھوں سے آہنی زینے کو پکڑ کر کھڑا تھا۔ کالے سیاہ سمندر کی دیوہیکل موجیں جہاز کو کھلونے

کی طرح ادھر ادھر اچھال رہی تھیں۔ عرشے کے تھرڈ کلاس کے سارے مسافر نیچے لوئر ڈیک میں جا چکے تھے جو جہاز کے اس حصے میں ہوتا ہے جو پانی میں ڈوبا ہوتا ہے اور جہاں عرشے پر باہر کو نکلی ہوئی بڑی بڑی چمنیوں سے تازہ ہوا پہنچائی جاتی ہے۔

جہاز کے خلاصی دوڑ دوڑ کر چیزوں کو سمیٹ رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کیا کام کر رہے تھے جس وقت جہاز سمندر میں داخل ہوا تھا تو پانی جہاز کے اتنا نیچے تھا کہ عرشے کے جنگلے پر سے جھک کر اسے دیکھنا پڑتا تھا مگر اب اس کی بپھری ہوئی موجیں جہاز سے ٹکرا کر شور مچاتی ڈیک کے فرش پر آ رہی تھیں۔

اس منظر نے مجھے زیادہ خوفزدہ کر دیا۔ یہ ساری علامتیں جہاز کے ڈوبنے کی تھیں بلکہ جہاز اوپر والے ڈیک تک سمندر میں پہلے ہی ڈوب چکا تھا۔ سمندر کا طوفان غیض و غضب کے عالم میں تھا۔ چیختی چلاتی، شور مچاتی تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ خدا کی خدائی یاد آ رہی تھی۔ میں زینے میں دونوں ہاتھوں سے ریلنگ کو پکڑے کھڑا تھا اور جہاز کے ساتھ ہی دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ جہاز ایک بار ایک جانب سے اتنا اونچا ہو گیا کہ لگتا تھا الٹ جائے گا۔ میرا ایک ہاتھ چھوٹ گیا۔ میں گرتے گرتے بچا اور وہیں زینے میں لوہے کی ریلنگ سے چمٹ کر بیٹھ گیا۔

کافی اونچا جانے کے بعد جہاز ایک دم نیچے کو آ گیا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ میں ایک ایک سیڑھی کر کے آہستہ آہستہ زینے پر سے نیچے آ گیا۔ راہ داری میں رولنگ کے پیش نظر دونوں جانب کیبنوں کی دیواروں کے ساتھ لکڑی کی ریلنگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں اس کو پکڑ پکڑ کر بڑی مشکل سے اپنے کیبن کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اب کیبن کے دروازے کی ہتھی پر میرا ہاتھ نہیں پڑ رہا تھا۔ طوفانی موجوں نے جہاز کو میری بائیں جانب سے اونچا کیا تو میں خود بخود کیبن کے دروازے سے جا ٹکرایا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر اندر گیا تو ہمشیرہ اور بھائی جان نے مجھے سخت ڈانٹا کہ میں اس قدر طوفان میں کہاں نکل گیا تھا۔ وہ ساری رات اور اگلا سارا دن جہاز سمندری طوفان میں سے گزرتا رہا۔

دوسرے دن میں لوئر ڈیک پر اتر کر گیا۔ یہاں فرش لوہے کا تھا اور نیچے جہاز

کے انجنوں کے چلنے کی گڑگڑاہٹ بھی کافی سنائی دے رہی تھی۔ اور فرش پر لرزش بھی محسوس ہو رہی تھی۔ تھرڈ کلاس کے مسافر جگہ جگہ ٹولیاں بنا کر بیٹھے تھے۔ ایک طرف چھوٹا سا کاؤنٹر تھا جہاں ایک بنگالی یا مدراسی بڑے سے حمام کے پاس بیٹھا تھا اور پیتل کے گلاسوں میں کافی ڈال کر گاہکوں کو دے رہا تھا۔ میں نے بھی ایک گلاس کافی کا لیا اور وہیں ایک طرف فرش پر بیٹھ کر پینے لگا۔

عجیب بات تھی کہ ڈاکٹر کی دوائی نے طلسمی اثر کیا تھا اور میرے چکر بالکل غائب ہو گئے تھے۔ بھائی جان وہ دوائی میرے لئے اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے اور صبح کو انہوں نے مجھے اس کی ایک خوراک پلا دی تھی۔ کافی کڑوی تھی۔ دودھ اور چینی اس میں برائے نام ہی تھی۔ اس سے پہلے کلکتے میں بھائی جان کے ساتھ ایک جگہ کافی پی تھی مگر وہ کافی بڑی میٹھی تھی اور اس میں دودھ کے ساتھ کریم بھی ملی ہوئی تھی۔

یہ کافی سخت کڑوی تھی مگر اس نے میری طبیعت پر اچھا اثر ڈالا۔ تیسری رات کو جا کر کہیں سمندر کا طوفان تھم گیا۔ رولنگ کی شدت بھی ختم ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے جہاز کے ساتھ غرق ہونے سے بچا لیا تھا۔

یہ تین دن کا سمندری سفر تھا۔ تیسرے دن صبح صبح جہاز رنگون کے دریائے ایراوتی کے ڈیلٹے میں داخل ہو گیا۔ سمندر کے سیاہ پانی میں دریا کی گدلی لہریں گھل مل رہی تھیں جہاز کی رولنگ بھی ختم ہو گئی تھی۔ جہاز کے اوپر ایک بار پھر آبی پرندوں نے منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ یہ ملک برما کے آبی پرندے تھے۔ دریا کے کنارے ابھی دکھائی نہیں دے تھے۔ دوسرے مسافر بھی عرشے پر کھڑے زمین کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھے۔ دور پہلے دائیں جانب ایک سیاہ لکیر سی نمودار ہوئی اس کے بعد ایسی ہی ایک لکیر آہستہ آہستہ بے معلوم انداز میں قریب آنے لگی۔

دوپہر کے بعد یہ لکیریں ملک برما کے مشہور دریا ایراوتی کے کنارے تھے۔ کہیں کہیں کشتیاں اور دور کھڑے جہاز بھی نظر آ جاتے۔ پانی کے رنگ سے سیاہی غائب ہو تھی اور ہم دریا میں سے گزر رہے تھے۔ کنارے پر بڑے بڑے پیگوڈا یعنی بدھ مندر

کے کلس غروب ہوتے سورج کی گلابی روشنی میں چمک رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے بدھ مندر زمین کے اندر سے ابھرے ہوئے ہوں۔ اس کے بعد برما شیل والوں کے بڑے بڑے دیوہیکل ٹینک زمین سے باہر نکلے ہوئے نظر آنے لگے۔ جہاز دریا میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ دو سٹیمر جہاز سے کچھ فاصلے پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک جانب کئی جہاز کھڑے تھے جن پر اپنے اپنے ملک کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ہوا میں تازگی تھی اور پاکیزہ لمس کا احساس ہو رہا تھا۔

کناروں پر ناریل کے درختوں کے جھنڈ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ جہاز کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ دور رنگون کی بندرگاہ کی عمارتیں اور گوداموں کی سرخ چھتیں نظر آنے لگیں۔ آخر خدا خدا کر کے جہاز رنگون کی بندرگاہ میں داخل ہو گیا اور پھر بندرگاہ کی جانب پہلو کے رخ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد پہلو کی جانب سے بندرگاہ کی جیٹی کی سمت بڑھنے لگا۔ وہ بڑی ہلکی رفتار سے بندرگاہ کے پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیٹی پر کھڑے لوگ نظر آنے لگے تھے۔

یہ مسافروں کے دوست اور عزیز و اقارب تھے جو انہیں لینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ آخر جہاز پلیٹ فارم کے ساتھ لگ گیا۔ جہاز کے اوپر سے موٹے موٹے رسے نیچے پھینکے جانے لگے۔ جہاز کا آہنی لنگر گرا دیا گیا۔ پلیٹ فارم پر موجود آدمیوں نے جہاز کے رسوں کو پلیٹ فارم کے لوہے کے بڑے بڑے کھمبوں کے ساتھ باندھ دیا۔ بھائی جان میرے قریب ہی سیکنڈ کلاس کے ڈیک پر جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ انہوں نے جیٹی پر کسی کو دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلایا۔ کہنے لگے۔

"حاجی صاحب آئے ہیں۔ ساتھ انجم صاحب بھی ہیں۔"

ہمارے ڈیک کو بھی سیڑھی لگا دی گئی۔ ہم جہاز سے اتر کر زمین پر آ گئے۔ مجھے اس وقت بھی زمین گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دراز قد گورے رنگ کے خوش شکل اور شلوار قمیص میں ملبوس آدمی آگے بڑھ کر بھائی جان سے ملے۔ بھائی جان نے مجھے بھی ان سے ملایا۔ یہ صاحب رنگون کے مشہور سوداگر حاجی رحیم بخش صاحب تھے جن کا رنگون

میں فروٹ کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔

حاجی صاحب کا تعلق پشاور سے تھا۔ ان کے ہمراہ گورے چٹے رنگ
گھنگریالے سنہری بالوں اور سنہری چشمے والے ایک اور جوان رعنا بھی تھے۔ یہ صاح
حاجی رحیم بخش صاحب کے قریبی عزیز تھے اور ان کا نام انجم صاحب تھا۔ بعد میں معلوم
کہ وہ شاعر بھی تھے اور انجم غالباً ان کا تخلص تھا۔ دو گاڑیوں میں بیٹھ کر ہم حاجی رحیم
صاحب کے بنگلے پر آ گئے۔ رنگون کی سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ فٹ پاتھ
اونچے اونچے درخت تھے جن کے پیچھے ماڈرن طرز کی عمارتیں تھیں۔ برمی عورتیں او
سروں پر زرد رومال باندھے ہوئے تھے۔ ایک سڑک پر سے گزرے جہاں ٹرام چل
تھی۔ کہیں کوئی بند گھوڑا گاڑی تھی اور کہیں موٹر کار تھی۔

ہاتھوں سے کھینچے والے رکشا چلتے تھے۔ رکشا چلانے والے کالے رنگ کے
زدہ انسان لگتے تھے۔ ان کے نقش اور رنگ مدراسیوں کے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ
مدراس کے رہنے والے تامل لوگ ہیں جنہیں یہاں فرنگی کہا جاتا ہے۔ رکشا کھینچنے وا
برمی نہیں تھا۔ عمارتوں کے درمیان اور فٹ پاتھ پر ناریل کے جھنڈ بھی تھے۔ رنگون کا
بھی ویسا ہی تھا جیسا کلکتے کا موسم تھا۔ آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ مجھے ابھی تک ایسے
ہو رہا تھا جیسے میں بحری جہاز میں بیٹھا ہوں اور جہاز رولنگ کر رہا ہے۔ طبیعت پوری
بحال نہیں ہوئی تھی۔ ہم ایک کشادہ چوک میں سے گزرے جہاں ایک عظیم الشان
مندر یعنی پیگوڈا تھا۔

بھائی جان نے بتایا کہ یہ رنگون کا سب سے بڑا پیگوڈا سولی پیگوڈا ہے۔
ایک بہت بڑے اور بلند چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ اوپر تک سیڑھیاں جاتی تھیں۔ پیگو
گنبد اور کلس سارے کا سارا سنہری تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور بھی پیگوڈے تھے
رحیم بخش صاحب کا بنگلہ بڑا خوبصورت تھا۔ چینی طرز کی دو منزلہ عمارت تھی۔ س
ساری لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ سرسبز گھاس والے باغ میں پھول کھل رہے تھے۔
حاجی صاحب نے بڑی پرتکلف دعوت دی۔ پشاور کے مشہور کھانے پکے ہوئے تھ

لک یعنی ملک بھائی جان کے دونوں اخباروں کا سٹاف بھی موجود تھا۔ میں رات کو جلدی سو
گیا۔ صبح اٹھا تو کمرے کی کھڑکی میں سے تازہ سبزے کی خوشبو خوشگوار جھونکوں کے ساتھ
ندر آ رہی تھی۔ میں باہر آنے کے لئے بنگلے کی لابی میں سے گزر رہا تھا کہ لکڑی کی خوشنما
یڑھیوں پر سے سرخ و سفید، سنہری بالوں اور سنہری چشموں والے انجم صاحب سیڑھیاں
ترتے ہوئے فارسی کا یہ شعر گنگنا رہے تھے۔ عجیب بات ہے ان کا یہ شعر مجھے پورے کا پورا
ی وقت یاد ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ گھر میں والد صاحب کے اصرار پر مجھے
شروع ہی سے فارسی زبان سکھائی جاتی رہی تھی۔

◆......◆......◆

پانچویں جماعت میں والد صاحب نے مجھے محلے کے غلام محمد رفوگر کے پا
فارسی پڑھنے کے لئے بٹھا دیا تھا۔ والد صاحب کو شوق تھا کہ میں فارسی پڑھ کر انہیں
سعدی کی گلستان بوستان کی حکایات سنایا کروں۔ سکول میں بھی میں فارسی ہی پڑھتا تھا
سکول کی فارسی مجھے فارسی زبان نہ سکھا سکی۔ آج اگر فارسی مجھے تھوڑی بہت آتی ہے تو
صرف میرے محسن استاد غلام محمد رفوگر کی وجہ سے ہی آتی ہے۔ اس وقت میں آٹھو
جماعت میں تھا چنانچہ اتنی فارسی زبان جان گیا تھا کہ جب نسواری سوٹ میں ملبوس
صاحب بنگلے کی دوسری منزل کی سیڑھیوں پر سے فارسی کا شعر گاتے اتر رہے تھے تو وہ
فوراً یاد ہو گیا تھا۔ وہ شعر یہ تھا۔

علی الصباح چوں مردم بہ کاروبار روند
بلا کشان محبت بہ کوئے یار روند

میں بنگلے کے لان میں آ کر رنگون کے آسمان، درختوں اور سرسبز لان کے پھو
کو دیکھنے لگا۔ یہ پھول اور درخت امرتسر کے کمپنی باغ کے پھولوں اور درختوں سے مخ
تھے۔ یہ درخت سنبل کے درخت کی طرح بڑا گھنا اور اونچا درخت تھا اور اس کی
ساری شاخیں سرخ رنگ کے پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بھائی جان نے بتایا کہ
پیکل یعنی استوائی درخت ہے اور صرف جنوبی ایشیا کے گرم مرطوب ملکوں میں ہوتا ہے۔
قیام پاکستان کے بعد ایک ایسا ہی درخت میں نے لاہور میں دیکھا تو میں
تک سڑک کے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ یہ درخت مزنگ چونگی سے

آباد کی طرف جاتے ہوئے دائیں جانب ادبستان صوفیہ سکول کے اندر کہیں تھا۔ سڑک پر
سے اس کا اوپر والا آدھے سے زیادہ حصہ صاف دکھائی دیتا تھا جس کی ٹہنیاں سرخ پھولوں
سے لدی ہوئی تھیں۔ میں یادوں کا مسافر ہوں۔ مجھے رنگون یاد آ گیا۔ گاڑی یا رکشے میں
آتے جاتے میں اس درخت کو ضرور دیکھا کرتا تھا۔

رنگون کی صبح کلکتے کی صبح کی طرح مرطوب تھی۔ دو دن پہلے رنگون میں بڑی بارش
ہوئی تھی۔ سبزہ درخت اور پھولوں کے چہرے دن کی روشنی میں دھلے ہوئے لگ رہے تھے
کیونکہ رنگون میں گرد کہیں بھی نہیں اڑاتی تھی۔ کلکتے کی طرح اس شہر کی سڑکیں بھی رات کو
روزانہ دھوئی جاتی تھیں۔ ویسے بھی شہر میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پپیتے' تاڑ اور ناریل
کے درخت عام تھے۔ حاجی رحیم بخش صاحب کے بنگلے کے آگے ایک چھوٹی سی سڑک تھی۔
سڑک کے پار کھلا میدان تھا جس میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔

حاجی صاحب کا ایک کولڈ سٹوریج بنگلے کے عقب میں تھا۔ انہوں نے مجھے کولڈ
سٹوریج دکھایا۔ کولڈ سٹوریج میں سیبوں کی خوشبو تھی۔ یہ سیب حاجی صاحب آسٹریلیا سے
درآمد کرتے تھے۔ اندر سیبوں کے ڈھیر لگے تھے۔ کولڈ سٹوریج میں مجھے بڑی جلد ٹھنڈ لگنے
لگی۔ حاجی صاحب مسکراتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ باہر لے آئے۔ جہاں تک مجھے یاد
ہے حاجی رحیم بخش صاحب نسواری رنگ کی قراقلی ٹوپی پہنتے تھے۔ فریئر اسٹریٹ میں ان کا
آفس تھا۔ ان کی بڑی سی خوشنما میز پر پلیٹ میں دو تین سبز اور سرخ سیب ضرور رکھے
ہوتے تھے اور ان کے آفس میں بھی سیبوں کی خوشبو پھیلی رہتی تھی۔ جس سڑک پر حاجی
صاحب کا آفس تھا میں نے اس کا نام فریئر سٹریٹ لکھا ہے۔ مجھے مغالطہ تھا کہ شاید اس
سڑک کا نام فریئر سٹریٹ تھا۔ میں نے بڑی ہمشیرہ صاحبہ سے ٹیلی فون پر تصدیق کی تو انہوں
نے کہا کہ اس سٹریٹ کا نام فریئر سٹریٹ ہی تھا اور اس سڑک کے آخر میں ڈاک خانہ بھی
تھا۔ اس تصدیق کے بعد میں سفرنامہ آگے شروع کرتا ہوں۔

حاجی رحیم بخش صاحب کے بنگلے پر ایک یا دو دن رہنے کے بعد ہم لوگ لیوس
سٹریٹ کے ایک کشادہ فلیٹ میں آ گئے۔ نام اس کا سٹریٹ ہی تھا مگر یہ کوئی گلی نہیں تھی۔

یہ فریئر سٹریٹ ہی کے پہلو میں تھی اور بالکل ایسی سٹریٹ تھی جس طرح لاہور کی مال روڈ پر سے بیڈن روڈ نکلتی ہے۔ لیوس سٹریٹ بیڈن روڈ سے کچھ زیادہ ہی کشادہ تھی۔ فریئر سٹریٹ سے لیوس سٹریٹ میں داخل ہوں تو کونے پر ایک ریستوران تھا جس کا نام ماتری بھنڈار تھا۔ یہاں بیٹھ کر لوگ چائے پیتے تھے۔ کافی بھی پیتے تھے۔ ماتری بھنڈار میں' میں نے زندگی میں پہلی بار کوکو مشروب پیا۔ یہ کافی سے زیادہ سٹرونگ تھی اور ذائقہ کڑوا کڑوا تھا۔ مجھے کوکو اس لئے پسند آئی تھی کہ اس میں سے بانس کے پتوں کی خوشبو آتی تھی۔ رنگون میں ان دنوں لاہور کی بنی ہوئی فلم ''خزانچی'' ایک سینما ہاؤس میں سترہویں ہفتے میں چل رہی تھی۔ اس فلم میں ایم اسماعیل نے کیدو کے بعد اپنی زندگی کا یادگار رول ادا کیا تھا۔ اس فلم کا گانا (ساون کے نظارے ہیں) امرتسر میں بچے بچے کی زبان پر تھا۔ رنگون کے انڈین اور برمی اور گجراتی ریستورانوں میں دوسری زبانوں کے ریکارڈوں کے ساتھ اس فلم خزانچی کے گانے ضرور بجائے جاتے تھے۔ ماتری بھنڈار ریستوران میں بھی اس وقت یہی گانا لگا ہوا تھا جب میں اپنے ایک دوست ارجن دیو رشک کے ساتھ وہاں بیٹھا کوکو پی رہا تھا۔ ارجن دیو رشک گوالمنڈی لاہور کا رہنے والا تھا اور کافی دیر سے رنگون میں مقیم تھا۔ شاعر بھی تھا۔ اس کے بارے میں آگے چل کر ذکر کروں گا۔

اس وقت میں آپ کو وہ خاص بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں جسے میں نے ابھی تک آپ سے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ چونکہ میں نے عہد کیا ہے کہ میں اس سفرنامے میں کسی مصلحت یا مبالغے سے کام نہیں لوں گا اور جو بات بتانے کے لائق ہو گی اسے سچ سچ بتا دوں گا۔ اس لئے یہ بات بھی میں اپنے قارئین کو بتانا اپنا ادبی فرض سمجھتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ ان دنوں میرے سر پر میری زندگی کی پہلی محبت کا بھوت بری طرح سوار تھا۔ میں اس محبت کی دل گداز یادیں اپنے ساتھ ہی لے کر رنگون آیا تھا۔ مجھے یاد ہے جس وقت ہم اپنے مکان سے نکل کر سٹیشن کی طرف جا رہے تھے تو میں نے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے اس مکان کی طرف دیکھا تھا جو میری بچپن کی اور میری زندگی کی پہلی محبت کا مکان تھا۔ اپنی محبت کے بارے میں بتانے کے لائق ہر بات بتا دوں گا مگر اس لڑکی کا اصلی نام نہیں

بتاؤں گا۔ اور اس کے مکان کا حدود اربع بھی بیان نہیں کروں گا۔ میں اپنی بچپن کی اور پہلی محبت کا نام رضیہ رکھ لیتا ہوں۔ اس زمانے میں لڑکیوں کے نام اسی قسم کے ہوتے تھے۔ یہاں میں یہ پیشگی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میری یہ محبت اتنی پاکیزہ' معصوم اور لطیف تھی کہ آج بھی میں یاد کرتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میں کسی لڑکی سے محبت نہیں کر رہا تھا بلکہ کمپنی باغ کے کسی پھول سے محبت کر رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے جب محبت...... گلاب سوسری اور موتیا اور کنول کا پھول بن جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ میں آپ کو بتاؤں گا نہیں۔ آپ ایسا خود کر کے دیکھیں۔ یہ سننے' سنانے' سمجھنے اور سمجھانے والی بات نہیں ہے۔ یہ اپنے اوپر طاری کرنے والی ایک کیفیت ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اپنے جسم سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ کون اپنا جسم چھوڑتا ہے۔ چھوڑیں اس بات کو...... بس یوں سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ آدمی کو اس کی توفیق کے لئے دعا مانگنی چاہئے۔ میری روح کے گلستان آج بھی پہلی محبت کی خوشبوؤں سے مہک رہے ہیں۔ میں اپنی پہلی محبت کی کچھ خوشبوئیں آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی پہلی محبت پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں بلکہ اپنی پہلی محبت کی کچھ روشنی اپنی سیاہ تحریر پر ڈالنا چاہتا ہوں۔

میری عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی ہو گی۔ ایم اے او ہائی سکول امرتسر کی آٹھویں کلاس سے اٹھ کر رنگون آیا تھا۔ کمپنی باغ کے آم کے درخت' چھوٹی نہر' امرود کے باغ' کٹھے کے درختوں کی سفید کلیوں کی خوشبوئیں اور چالی کھوہ کے زرد اور کیسری گیندے کے پھول اور منہ اندھیرے لوکاٹ کے باغوں سے آنے والی گولڈن اور نارنجی لوکاٹوں کی دھیمی دھیمی گرم خوشبوئیں اور رضیہ کی اداس محبت میں اپنے ساتھ ہی رنگون لے آیا تھا۔ یہ سب خوشبوئیں' سب محبتیں دل کو گداز کر دینے والی تھیں' اداس کر دینے والی تھیں۔ رضیہ کی محبت میں عدم سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس جہان فانی میں آنکھیں کھولتے ہی رضیہ کو دیکھا تھا اور اپنی محبت کو پہچان لیا تھا۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر امرتسر کے کشمیری گھرانوں کی رونق اور چہل پہل سب سے الگ ہوتی تھی۔ تیل کی رات کو وڑی بھتہ پکتا۔ ایک ہفتہ پہلے ہی گھروں میں باسمتی'

زعفران، پلاؤ، قہرے کے مصالحے اور حنا کے عطر کی خوشبوئیں اڑنے لگتی تھیں۔ دوسری چیزوں کے علاوہ کھنڈ قلچوں اور باقر خانیوں کے بھرے ہوئے تھال خاص طور پر منگوا کر رکھ لئے جاتے۔ تین دن پہلے ہی لڑکیاں ڈھولک لے کر بیٹھ جاتیں۔ اس زمانے میں لڑکیاں ڈھولک پر فلمی گیت نہیں گاتی تھیں۔ پنجابی کے لوک گیت گائے جاتے تھے۔ جیسے ۔

لنگ آ جا پتن چناں دا
تساں نوں مان وطناں دا
آیا نی لاڑیئے تیرا سہریاں والا
اج رکھ لے میری ڈولی نی ماں

ہر لڑکی کو ڈھولک بجانا آتا تھا۔ ہر لڑکی کو پنجابی کے لوک گیت یاد تھے۔ ایک لڑکی گردن ایک طرف ڈالے ڈھولک بجا رہی ہے۔ سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی چھوٹے سے پتھر یا چمچ سے ڈھلوک پر تال دے رہی ہے۔ بھولے بھالے معصوم چہرے ہیں۔ گرمیوں کا موسم ہے تو کرائے پر منگوائے ہوئے پیڈسٹل فین چل رہے ہیں۔ سردیوں کا موسم ہے تو کاربائیڈ مسالے والے گیس روشن ہیں۔ بڑی آپو اور بڑی خالہ چولہے کے پاس بیٹھی ہیں۔ چولہے پر سبز چائے کا بڑا دیگچہ چڑھا ہوا ہے۔ دیگچے میں سے سبز چائے کی خوشبو بھاپ بن کر اڑ رہی ہے۔ ہمارے بچپن کے زمانے میں گلی کو جھنڈیوں سے نہیں سجایا جاتا تھا۔ کیلے کے دو بڑے درخت کاٹ کر لائے جاتے اور ان کا دروازہ بنایا جاتا تھا۔ آم کے پتوں کے گچھوں کو رسی میں پرو کر گلی میں جھنڈیوں کی جگہ سجا دیا جاتا تھا۔ آم کے پتوں کی جھنڈیوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے کیلے اور آم کی بہت ہلکی ہلکی خوشبو آتی تھی۔ امرتسر کے کشمیری مسلمانوں میں رواج تھا کہ جس دیوان خانے میں برات نے بیٹھنا ہوتا تھا اس کی دیواروں پر پشمینے کی فردین (شالیں) اس طرح لٹکا دی جاتی تھیں کہ دیواریں چھپ جاتی تھی۔

فلمی گانوں کی ریکارڈنگ نہیں ہوتی تھی۔ صرف شادی بیاہ والے گھر سے لڑکیوں کے ڈھولک بجانے اور پنجابی لوک گیت گانے کی دبی دبی سی آوازیں آتی تھیں۔ رضیہ بڑی مہارت سے ڈھولک بجاتی تھی۔ ڈھلوک اس نے دونوں گھٹنوں کو جوڑ کر ساتھ لگائی ہوتی۔

گردن ایک طرف کو جھکی ہوئی ہوتی۔ بالوں کی ایک لٹ جسم کے ساتھ ہل رہی ہوتی تھی۔ اس وقت مجھے سر کی پہچان نہیں تھی اور معصوم انداز میں لوک گیت گانے والیاں مجھے گلاب اور گیندے کے پھولوں کی طرح لگتی تھیں۔ اب سر کے اکار کو تلاش کرتا رہ جاتا ہوں اور گلاب اور گیندے کے پھولوں ایسے چہرے آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

میرے بچپن کی محبت کے یہ وہ طلسمی رنگ اور خوشبوئیں اور اداس دوپہریں اور تیز بارشیں اور طلوع ہوتے، غروب ہوتے آفتاب تھے جو میرے ساتھ ہی رنگون آ گئے تھے۔ رنگون کے بازاروں میں گزرتی ہر بڑی لڑکی میں مجھے اپنی محبت کی شکل دکھائی دیتی تھی۔ میں اپنی محبت کی ڈائری لکھا کرتا تھا۔ میں یہ ڈائری بھی ساتھ ہی لے آیا تھا۔

رنگون آئے ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ گھر سے ہمشیرہ صاحبہ کے نام خیر خیریت کا خط آیا جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ رضیہ کی ایک جگہ منگنی ہو گئی ہے۔ یہ خبر میرے لئے آسمانی بجلی سے کم نہیں تھی۔ حالانکہ رضیہ مجھ سے چھ سات سال بڑی تھی اور اس کے ساتھ میری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کی منگنی کا سن کر مجھے ایسے لگا جیسے کوئی زبردستی سے رضیہ کو چھین کر لے گیا ہے۔ اداس اداس رہنے لگا۔ ان ہی دنوں میں شاعر ارجن دیو رشک سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی مجھ سے بڑا تھا۔ لیکن انتہائی ہنس مکھ اور خوش گفتار تھا۔ لاہور کے محلے گوالمنڈی میں ان کا آبائی مکان تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ برما میں شائد ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے بھائی جان سے ملنے ہمارے لیوس سٹریٹ والے فلیٹ پر آتا تھا۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے تھے۔ مجھے یاد ہے وہ بھائی جان کو اپنی اردو کی نظمیں سنایا کرتا تھا۔ میں نے اس سے غزل کبھی نہیں سنی تھی۔

رشک انگریزی اور برمی زبان بڑی روانی سے بول لیتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ بمبئی جا کر آباد ہو گیا تھا اور اس نے جس دیس میں گنگا بہتی ہے کے مکالمے بھی لکھے تھے۔ بمبئی کا فلمی رسالہ فلم فیئر میری نظر سے گزرا تھا۔ جس میں اس فلم کا اشتہار چھپا تھا۔ اشتہار میں مکالمے سکرین پلے کے ساتھ ارجن دیو رشک کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کا بمبئی میں

ہی انتقال ہو گیا تھا۔ بہر حال ابھی وہ میرے ساتھ رنگون میں ہوتا تھا اور رنگون کی بارشو
میں سڑکوں پر پھرا کرتے تھے۔ رشک کے ساتھ ہونے سے میرا غم کسی حد تک بہل جاتا ا
کچھ دیر کے لئے میں بھول جاتا کہ رضیہ کی منگنی ہو گئی ہے۔ ایک روز رشک نے کہا چ
دریائے ایراوتی کی سیر کرتے ہیں۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ جس ڈائری پر میں ا
محبت کی باتیں لکھا کرتا تھا اسے میں دریا میں پھینک دوں گا۔ جب رضیہ مجھ سے چھین لی گ
ہے تو پھر اس کی محبت کی ڈائری کو اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گا۔ رشک نے کہا کہ سور
غروب ہونے سے ذرا پہلے چلیں گے۔ دریائے ایراوتی میں سورج کے غروب ہونے
نظارہ بڑا دلفریب ہوتا ہے۔ عین وقت پر رشک آ گیا۔ میں نے ڈائری اپنی قمیص کے اند
چھپا کر رکھ لی تھی۔ اس وقت میری ذہنی کیفیت ایسی تھی جیسے میں اپنے ہاتھوں اپنی محبت
دفن کرنے جا رہا ہوں۔ رشک نے میرے چہرے سے میری اداسی کا اندازہ لگا لیا تھا۔
فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر لیوس سٹریٹ میں آئے تو رشک نے مجھ سے پوچھا۔

''تم بہت اداس لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟'' میں نے پرانی فلموں کے ناکا
محبت ہیروں کی طرح غمگین مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کوئی بات نہیں ویسے ہی اداس ہو گیا ہوں۔''

''وطن یاد آیا ہو گا'' رشک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''یہی سمجھ لو۔''

ہم نے لیوس سٹریٹ ہی سے ایک رکشا لے لیا۔ رنگون میں جو رکشا چلتے
انہیں پنجہ کہا جاتا تھا اور اسے آدمی چلاتے تھے۔ یعنی یہ انسانی رکشے تھے۔ رکشا چلا
والے سبھی جنوبی ہند کے رہنے والے تامل لوگ تھے جنہیں وہاں کی زبان میں قرنگی کہتے
تھے۔ ان کے رنگ کالے ہوتے تھے۔ بڑے دبلے پتلے ہوتے تھے اور سر کے بال چھوٹی
سی گت کی شکل میں پیچھے بندھے ہوتے تھے۔

مجھے یاد نہیں کہ ہم کن کن بازاروں میں سے گزرے۔ رشک، رنگون کے سار
شہر سے واقف تھا۔ ہم دریا کے گھاٹ پر پہنچ گئے۔ دریا کنارے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بند

ہوئی تھیں۔ ملاح سب کے سب برمی تھے۔ ان کشتیوں میں دو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش
تھی۔ برمی زبان میں ان کشتیوں کو سمیان کہتے تھے۔ ہم ایک سمیان میں بیٹھ کر دریا کی سیر
کرنے لگے۔ ایراوتی برما کا سب سے بڑا دریا ہے جو خدا جانے پیچھے کن پہاڑیوں میں
سے نکل کر آتا ہے۔ رنگون میں آ کر یہ سمندر میں جا گرتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جب
میں رنگون کی یادوں کو ایک کتاب میں لکھنے بیٹھا تو مجھے ایک رسالہ مل گیا جس میں دریائے
ایراوتی کا ایک گیت درج تھا۔ میں نے وہ گیت ترجمہ کر کے رنگون کی یادوں پر مشتمل اپنے
ناول جھیل اور کنول کے شروع میں دیا تھا۔

گیت یہ تھا۔

ایراوتی! میری ایراوتی!
میری محبوب ایراوتی!
سب ندیاں پیاری ہیں مگر
سب سے پیاری ہے ایرواتی

☆......☆......☆

دن بھر میں ناؤ کھیتا ہوں
تیرے پانیوں پر ایراوتی
ملاح کی زندگی بجائے خود ایک گیت ہے
تیرے پانیوں پر، او ایراوتی!
خوبصورت لڑکیاں ناچ رہی ہیں
جھوم رہی ہیں
تیزی سے، کبھی دھیرے دھیرے
تم نے یہ ناچ کہاں سیکھا؟
بتاؤ ایراوتی کی بیٹیو!
دریا کے اس موڑ پر ناچ سیکھا تھا

یا اس پہاڑ پر جہاں سے ایراوتی نکلتی ہے؟
بتاؤ ایراوتی کی بیٹیو!

☆......☆......☆

ایراوتی میں ہمارے آنسو سماتے رہے ہیں بھائیو!
ایراوتی کتنی میلی ہو رہی ہے
اور جب غریبی ہمارے گلے گھونٹ دے گی
ایراوتی اسی طرح بہتی رہے گی

جس وقت میں اپنے دوست کے ساتھ کشتی میں بیٹھا دریائے ایراوتی کی سیر کر رہا تھا تو میں نے ایراوتی کے جفاکش ملاحوں کا یہ گیت نہیں سنا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ غروب ہوتے سورج کی ارغوانی روشنی نے دریا کو بھی روشن کر دیا تھا۔

◆......◆......◆

جب کشتی دریا کے درمیان پہنچی تو میں نے اپنے ساتھی رشک کی آنکھ بچا کر قمیص سے ڈائری نکالی اور دریا میں ڈال دی۔ رشک نے مجھے ایسا کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”یہ کاپی تم نے دریا میں کیوں پھینک دی؟“

میں نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”یونہی فضول سی کاپی تھی۔“

”نہیں نہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔“ رشک بولا۔ ”ضرور کوئی خاص بات ہے مجھے بے شک بتا دو۔ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔“

اور میں نے رشک کو اپنی ناکام محبت کی کہانی بیان کر دی۔ کشتی دریا کی لہروں پر ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتی بہے جا رہی تھی۔ اس دریا کی لہروں میں برمی ملاحوں کے آنسوؤں کے ساتھ میری محبت کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے۔ شاعر دوست میری محبت کی روداد سن کر خود بھی اداس ہو گیا۔ کہنے لگا۔

”محبت کی ناکام کہانیاں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مجھ پر بھی یہ صدمہ گزر چکا ہے جس لڑکی سے میں محبت کرتا تھا اس کا نام شکنتلا تھا۔“

اس کے بعد ہمارے درمیان کیا کیا باتیں ہوئیں مجھے یاد نہیں۔

اتنا یاد ہے کہ تیز ہوا چلنے لگی تھی اور ہماری کشتی زیادہ ڈولنے لگی تھی۔ رشک نے برمی زبان میں ملاح سے کچھ کہا۔ اس نے جس رخ پر کشتی جا رہی تھی اس کے اخیر میں دیکھا

اور جلدی سے کشتی واپس موڑنی شروع کر دی۔

رشک مجھے کہنے لگے کہ آگے منکی پوائنٹ تھوڑی دور رہ گیا تھا۔ منکی پوائنٹ وہ جگہ ہے جہاں سے دریا کا ڈیلٹا شروع ہو جاتا ہے۔ آسمان پر بادل بھی چھا رہے تھے۔ ایراوتی کے گھاٹ سے ہم رکشا میں بیٹھ کر فلیٹ پر واپس آئے تو سارا رستہ بارش ہوتی رہی۔ رنگون کی بارشیں' بارش کا پورا حق ادا کرتی ہیں۔ رنگون کی بارشیں مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی اور ان کی یادیں بارشوں کے ساتھ میری محبت میں خوشبوئیں اور موسیقی شامل کرتی رہیں گی۔

رنگون کی بارشوں پر میں پہلی نظر میں عاشق ہو گیا تھا۔ برما کے جنگلوں کی بارشیں میں نے بعد میں دیکھی تھیں۔ ابھی رنگون شہر کی بارشوں میں بھیگ رہا تھا۔ بارش میں بھیگنا اپنے آپ کو فطرت یا نیچر کے حوالے کر دینا ہے اور رنگون کی شہر کی بارشوں میں تو خوشبوئیں جنم لیتی تھیں۔ کچھ اس لئے بھی میرے جذبات میں شدت کا احساس تھا کہ لڑکپن میں جنوب مشرقی ایشیا کی وہ پہلی بارشیں تھیں۔ جن سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ بارش میں رنگون کے جامع مسجد والے بازار مغل سٹریٹ کی خوشبو الگ ہوتی تھی۔ جیسے چیڑھ کے درختوں کی خوشبو میں صندل کی خوشبو شامل ہو گئی ہو۔ فریئر سٹریٹ بارش میں ایسی خوشبو دیتی تھی جیسے دیودار کے درختوں کے تازہ کٹے ہوئے تنوں کے پاس بیٹھا کوئی اس زمانے کا کریون اے کا سگریٹ پی رہا ہے۔ سپارک سٹریٹ بارش میں بنارسی پان اور لکھنؤ کے زردے کی خوشبو اڑتی تھی اور ہماری لیوس سٹریٹ میں سے بارش میں گزرو تو تازہ سگاروں اور کافی کی خوشبو آتی تھی۔

کہتے ہیں رنگون کے بازاروں اور گلی کوچوں سے بھی بارشوں کی یہ خوشبوئیں رخصت ہو چکی ہیں۔ لیکن میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں وہ نیچرل بارشوں' خالص محبتوں' معصوم محبتوں میں چھپ چھپ کر راتوں کو آنسو بہانے والوں اور گہری اور روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والی خوشبوؤں کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس کے لئے تاریخ کو کئی صدیوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے اور جب یہ زمانہ گزر جاتا ہے تو پیچھے پھول رہ جاتے ہیں۔

خوشبو غائب ہو جاتی ہے۔ سائے رہ جاتے ہیں۔ آدمی غائب ہو جاتے ہیں۔ جسم زندہ روحوں سے خالی ہو جاتے ہیں اور محبتیں آنسوؤں کی معصومیت سے محروم ہو جاتی ہیں۔

رنگون کی مغل سٹریٹ میں ہی اقبال فرنیچر مارٹ' فرنیچر کی ایک کافی بڑی دکان تھی۔ اقبال نام کا ایک خوش شکل سنہری بالوں والا سرخ وسپید نوجوان اس دکان کا مالک تھا۔ اقبال صاحب کے سرخی مائل سپید چہرے پر کہیں کہیں نسواری رنگ کے تل تھے۔ وہ سگار پیا کرتے تھے۔ ان کی دکان میں پالش اور پرانی لکڑی کی خوشبو ہر وقت پھیلی رہتی تھی۔ میں بھائی جان کے ساتھ ان کی دکان پر جاتا تو وہ بڑی آؤ بھگت کرتے۔ چائے' بسکٹ اور پان سگریٹ سے تواضع کرتے۔ وہ بھائی جان کے دوستوں میں سے تھے۔

اقبال صاحب کا تعلق بھی مردم خیز خطے یعنی پنجاب کے گجرات شہر سے تھا۔ اگر میں بھولا نہیں تو شاید اقبال فرنیچر مارٹ کے ہی اوپر دوسری منزل میں ایک لائبریری ہوا کرتی تھی جس کی الماریاں اردو کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی اس لائبریری میں ادبی مجلس اور مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ جس میں احمد رنگونی جو برمی تھا مگر علامہ اقبال کی پیروی میں اردو کی نظمیں کہتا تھا۔ اپنا کلام سناتا تھا۔

رنگون میں اردو کی دو فلمیں بڑے زور و شور سے چل رہی تھیں۔ ایک پنچولی آرٹ سٹوڈیو لاہور کی فلم خزانچی اور دوسری غالباً رنجیت موی ٹون کی فلم پردیسی۔ پردیسی میں خورشید اور موتی لعل نے کام کیا تھا۔ ان دونوں فلموں کے گانوں کی ہوٹلوں' ریستورانوں میں اکثر ریکارڈنگ ہوتی رہتی تھی۔ خزانچی فلم کا گانا ساون کے نظارے ہیں اور پردیسی فلم کا گانا پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا رنگون کے برمی بھی گنگناتے تھے۔

ایک دن رشک اور میں یلاڈیم سینما ہاؤس میں انگریزی فلم دیکھنے گئے۔ بڑا خوبصورت سینما ہاؤس تھا۔ سینما ہاؤس کے سامنے رنگون کی مشہور شاپنگ مارکیٹ سکاٹ ارکیٹ تھی۔ یہاں دنیا کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ فریئر سٹریٹ میں مسلمانوں کی بہت سی دکانیں تھیں۔ ان میں سورتی میمن مسلمانوں کی دکانیں بھی تھیں۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کی کپڑے کی بڑی بڑی دکانیں بھی تھیں اور ترکی ریسٹورنٹ بھی اس سٹریٹ میں

تھا۔ ترکی ریسٹورنٹ کے مالک کی شکل کسی بھولے بسرے خواب میں دیکھی ہوئی شکل ک
طرح میرے ذہن میں ابھرتی ہے۔ شیشے کے شوکیسوں میں کریم رول اور پیسٹریوں س
بھری ہوئی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ جب رنگون پر جاپانی بمبار جہازوں نے پہلی بمبار ک
ان شوکیسوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی کرچیاں اور کریم رول اور پیسٹریاں میں نے فر
سٹریٹ میں بکھری ہوئی دیکھی تھیں۔ یہ سب کچھ پوری تفصیل کے ساتھ میں آگے چل ک
بیان کروں گا۔ ترکی ریسٹورنٹ میں فلمی اور غیر فلمی گانوں اور قوالیوں کی ریکارڈنگ ہوا کر
تھی۔ اس زمانے میں کالو قوال یا شاہد کلن قوال کی قوالی

"سکھی ری ڈولی میں ہو جا سوار" بہت مشہور تھی۔

اس قوالی کا ریکارڈ ترکی ہوٹل میں اکثر بجتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی میں بھی بھائی جا
اور ظہور شاہ جی کے ساتھ اس ہوٹل یا ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ مجھے
نہیں ترکی ہوٹل کی چائے کا ذائقہ کیسا ہوتا تھا۔ ویسے بھی ابھی چائے کا اتنا شعور میر
اندر پیدا نہیں ہوا تھا۔ چائے کا سورج قیام پاکستان کے بعد لاہور آ کر میرے ذہن
افق پر طلوع ہوا تھا۔ ترکی ہوٹل سے ذرا آگے تین چار دکانیں چھوڑ کر ایک سردار جی کا ہو
یا ڈھابا تھا۔ ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر ایک بہت بڑی چارپائی پر ایک بھاری بھرکم توند
بوڑھا سکھ ٹانگیں پھیلائے بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی صورت سے سخت بیزاری ٹپکتی تھی۔

جاپانی بمبار طیاروں کی فائرنگ نے اس سکھ کو چارپائی پر بیٹھے بیٹھے موت کی
سلا دیا تھا۔ جاپانی طیاروں نے فریئر سٹریٹ میں بہت نیچے آ کر گولیوں کا مینہ برسایا ت
بوڑھے سردار جی کی لاش سارا دن فٹ پاتھ کی چارپائی پر پڑی رہی تھی۔ اس کے بعد س
جی کے لواحقین لاش اٹھا کر لے گئے تھے۔ فریئر سٹریٹ میں ہی گرینڈ ہوٹل ہوتا تھا جو
کے گرینڈ ہوٹل کی شاخ تھی۔ میرا شاعر دوست رشک اس ہوٹل میں بھی بیٹھ کر شراب
کرتا تھا۔

گرینڈ ہوٹل کے سامنے میکسم سٹریٹ تھی۔ یہ سٹریٹ فریئر سٹریٹ والی س
سے پھوٹ کر اندر کو جاتی تھی اور یہ سٹریٹ بھی ہماری لاہور کی بیڈن روڈ جتنی کشادہ تھی

آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ جہاں یہ سٹریٹ بند ہو جاتی تھی وہاں سرکاری ریڈیو سٹیشن
ریڈیو رنگون کے دفاتر اور سٹوڈیوز واقع تھے۔ یورپ میں دوسری عالمگیر جنگ پوری شدت
سے لڑی جا رہی تھی۔ برما کا ملک چونکہ انگریزوں کی عمل داری میں تھا اس لئے حکومت نے
ریڈیو رنگون سے ایک گھنٹے کی اردو سروس جاری کی ہوئی تھی۔ اس سروس میں اردو اور پنجابی
میں خبروں کے بلیٹن نشر ہوتے تھے۔ برطانوی افواج کی ہندوستانی رجمنٹوں کے لئے اردو
بنگالی، تامل، تلیگو اور پشتو گانے اور قوالیوں کے ریکارڈ بجائے جاتے تھے اور چھوٹے
چھوٹے پراپیگنڈا فیچر نشر ہوتے تھے اور اتحادیوں کے حق میں پراپیگنڈا تقریریں بھی نشر
ہوتی تھیں۔ ریڈیو سٹیشن ایک دو منزلہ عمارت میں تھا۔ دروازے میں سے گزر کر اندر داخل
ہوں تو بائیں ہاتھ کو ڈیوٹی روم تھا۔ یہاں ایک ڈیوٹی آفیسر برمی لڑکی بیٹھی ہوتی تھی۔ اس کا
کام ریڈیو پروگرام کو مانیٹر کرنا تھا۔ اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے شام 4 بجے تک ہوتی تھی۔
چار بجے کے بعد ایک مدراسی عورت ڈیوٹی سنبھالتی تھی۔ ڈیوٹی سنبھالنے کے علاوہ یہ مدراسی
عورت ہر وقت اپنی ساڑھی سنبھالتی رہتی تھی۔

ڈیوٹی آفیسر برمی لڑکی بڑی پاکیزہ اور شفاف تھی۔ چاندی اور شیشے کی بنی ہوئی
لگتی تھی۔ اس لڑکی کے چاندی اور شیشے سے بنے ہوئے جسم کا جاپانیوں کی بمباری کے بعد
کیا حال ہوا۔ یہ بھی میں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا۔ ریڈیو رنگون سے اردو، بنگالی اور
دوسری ہندوستانی زبانوں کے علاوہ برمی زبان میں بھی پروگرام ہوتے تھے۔ ریڈیو کے
سٹیشن ڈائریکٹر کا نام مسٹر میکاؤ تھا۔ جو ریڈیو انجینئر ہمارے اردو پروگرام کے لئے ہمیں ملا
ہوا تھا وہ بھی بنگالی تھا۔ اور اس کا نام مسٹر ڈی کوسٹا تھا۔ ان لوگوں کے نام اور شکلیں مجھے
پوری طرح یاد ہیں۔ مسٹر میکاؤ تو کالے رنگ کا تھا مگر مسٹر ڈی کوسٹا کا رنگ زرد تھا۔ درگا
پوجا کا تہوار آیا تو بنگالی اور مدراسی لڑکیاں پروگرام کرنے سٹوڈیو میں آئیں۔ وہ سب ننگے
پاؤں آتی تھیں۔ بھڑکیلے رنگوں والی ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ اس روز رنگون ریڈیو پر
خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔

یہ ساری لڑکیاں بڑی خوبصورت تھیں۔ خوبصورت تھیں یا نہیں تھیں مگر مجھے بڑی

خوبصورت لگ رہی تھیں۔ وہ بنگلہ، تامل، تلیگو اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں باتیں کر رہی تھیں۔ سٹیشن ڈائریکٹر کی جانب سے ان لڑکیوں کی کافی اور رس گلوں سے تواضع کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانے کی طرح میں ہر لڑکی سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں صرف حسن پرست تھا میرے دل میں حسن پرستی کے سوا اور کوئی خیال نہیں تھا۔ ان لڑکیوں کے تازہ و شاداب اور جوانی کی تپش میں تمتمائے ہوئے چہرے آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ میں سن 1941/42ء کی بات کر رہا ہوں اس بات کو ساٹھ برس سے قریب زمانہ گزر چکا ہے۔ ان لڑکیوں میں سے شاید ہی کوئی زندہ ہو اگر زندہ بھی ہو گی تو پہچانی نہیں جاتی ہو گی۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس کے خوبصورت چہرے پر لکیریں ڈال دی ہوں گی۔ جھریاں ڈال دی ہوں گی۔ پھول مرجھا بھی جائے تو پہچانا جاتا ہے کہ یہ گلاب کا پھول ہے، یہ گیندے کا پھول ہے، یہ موتیے کا پھول ہے۔ آدمی بوڑھا ہو جائے تو پہچانا نہیں جاتا کہ یہ وہی خوبصورت لڑکا ہے جو چھپ چھپ کر اپنی محبوبہ کو محبت بھرے خط لکھا کرتا تھا۔ ہم گیندے گلاب اور موتیے کے پھولوں کی طرح کیوں نہیں زند
رہتے؟

ریڈیو رنگون والی سٹریٹ میں داخل ہوں تو نکڑ پر شراب کی ایک بار تھی۔ اس ک
نام میکسم بار تھا۔ یہ شراب خانہ ہی تھا۔ یہاں لوگ بیٹھ کر شراب سے جی بہلاتے تھے۔ اس
سے مجھے یاد آ گیا قیام پاکستان سے پہلے گوالمنڈی لاہور کے چوک میں دارالاشاعت وال
سڑک کے کونے میں جہاں آج کل مٹھائی کی دکان ہے وہاں ایک سکھ کا ہوٹل ہوا کرتا تھا
اس نے ہوٹل کی پیشانی پر اردو کے بڑے بڑے الفاظ میں لکھ کر بورڈ لگایا ہوا تھا، اس پر لک
ہوا تھا۔

''یہاں بیٹھ کر شراب پینے کی اجازت ہے۔''

پاکستان بننے کے بعد دو تین ماہ تک یہ بورڈ ویسے ہی لگا رہا پھر اتار دیا گیا۔ م
رنگون کے میکسم بار کی بات کر رہا تھا۔ اس بار میں زیادہ تر غیر ملکی ملاح اور جہازی وغ
بیٹھا کرتے تھے۔ مسٹر ہمپٹی اس بار کا منیجر تھا۔ جب جاپانی فوجیں رگون کی طرف بڑھ ر

تھیں اور رنگون سے ہندوستانیوں کا ہمہ گیر انخلا شروع ہوا اور لوگ اپنی سجی سجائی دکانیں اور بھرے پڑے مکان چھوڑ کر پیدل ہندوستان کے کاکسز بازار کی طرف ایک سیلاب کی طرح چل پڑے تھے تو مسٹر ہمپٹی بار کی چابیاں پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا تھا اور مقامی برمیوں میں شراب خانے کو اس احتیاط سے لوٹا تھا کہ ایک بوتل بھی ٹوٹنے نہیں پائی تھی۔ مقامی برمیوں نے گھر چھوڑ کر بھاگے ہوئے ہندوستانیوں کے مکان اور دکانیں بھی لوٹ لی تھیں۔ اس کی تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی۔

ابھی تو رنگون میں امن و امان تھا۔ جنگ رنگون سے ہزاروں میل دور یورپ میں لڑی جا رہی تھی۔ ابھی جاپان میدان جنگ میں نہیں اترا تھا۔ رنگون کے بازاروں، مارکیٹوں میں بڑے زور و شور سے کاروبار ہو رہا تھا۔ ملٹری کے ٹھیکیدار جنگی ضروریات کا سامان تیار کر کے دھڑا دھڑ یورپ کو سپلائی کر رہے تھے اور خوب دولت کما رہے تھے۔ ان میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بہت جلد انہیں یہ ساری دولت ساری ٹھیکیداریاں، ساری دل داریاں اور ساری گرم بازاریاں چھوڑ چھاڑ کر صرف تین کپڑوں میں جانیں بچا کر بنگال کی طرف پیدل مارچ کرنا پڑے گا اور ان میں سے سینکڑوں لوگ برما کے دشوار گزار جنگلوں میں صعوبتیں برداشت نہ کر سکیں گے۔ اور کسمپرسی کے عالم میں راستے میں ہی مر کھپ جائیں گے۔

ابھی تو دونوں ہاتھوں سے دولت کمائی جا رہی تھی اور بنکوں میں جمع کی جا رہی تھی۔ ابھی رنگون میں رات کو بلیک آؤٹ بھی نہیں ہوتا تھا۔ رنگون شہر کی روشنیاں راتوں کو جگمگ جگمگ کرتی تھیں۔ ابھی سب خیر خیریت تھی۔ ہر طرف سکون تھا۔ بہت کم لوگوں کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ سکون ایک بہت بڑے خونیں طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

ریڈیو رنگون کے پراپیگنڈا ایکشن سے منسلک ہونے کی وجہ سے بھائی جان کو اپنی اخباری مصروفیات میں سے وقت نکال کر کچھ دیر کے لئے رنگون کے سیکرٹریٹ جانا پڑتا تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ رنگون کا سیکرٹریٹ شہر میں ہی تھا۔ عمارتوں کے کئی بلاک تھے۔ بہت بڑے چھتے ہوئے پورچ کے باہر اردو میں لکھا ہوا تھا۔

"یہاں گاڑیاں کھڑی کرنے کا نہیں ہے۔"

بس اسی قسم کی گلابی اردو رنگون کے برمی اور تامل لوگ بولا کرتے تھے۔ دفتر میں برمی کلرک وغیرہ بڑی آزادی سے اپنی مرضی کے مطابق کام کرتے تھے۔ وہ انگریزوں کی غلامی سے ہر ممکن طریقے سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ انہیں دو قومیں لوٹ رہی ہیں۔ ایک ہندوستان کے لوگ، جنہوں نے ان کے کاروبار پر قبضہ جمایا ہوا ہے اور دوسرے انگریز جنہوں نے ان کے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے یہی وجہ تھی کہ جب جاپانی فوجیں ایک طوفان کی طرح سنگاپور ملایا پر قبضہ کرنے کے بعد رنگون کی طرف بڑھ رہی تھیں تو برمی لوگ جاپانیوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ انہیں یقین کہ جاپانی انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائیں گے۔ برمیوں نے جنگ کے اوائل میں اور دوران جنگ جاپانیوں کے لئے بڑی کارآمد جاسوسی کی تھی۔

تن آسانی اور لاابالی پن برما کے لوگوں کے مزاج میں شامل ہے۔ سیکرٹریٹ میں بھی وہ انگریزوں سے دب کر کام نہیں کرتے تھے۔ میں نے سیکرٹریٹ کے دفاتر میں منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے کہ برمی کلرک تھوڑا سا کام کرنے کے بعد سگار سلگا کر میز ٹانگیں رکھ کر ایک دوسرے سے لطیفے بازیاں شروع کر دیتے تھے۔ ان کا کوئی افسر بھی آ تو وہ ٹانگیں میز سے نیچے نہیں کرتے تھے۔ دوسری بات ان میں یہ تھی کہ یہ لوگ جس انہیں تنخواہ ملتی تھی کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ پہلی تاریخ سے لے کر دس پندرہ تاریخوں ان کے گھروں میں بریانی پکتی تھی اور برمی کلرک بڑے قیمتی سگار پیتے تھے۔ پندرہ تا کے بعد جب پیسے ختم ہو جاتے تھے تو سگار کی جگہ بیڑیاں پیتے تھے اور ایک دوسرے قرض مانگ کر باقی کے دن گزارتے تھے۔ پہلی تاریخ کے بعد پھر یہی چکر شروع ہو تھا۔

◆......◆......◆

میں نے برمیوں کے گھروں میں جا کر بھی دیکھا ہے۔ مڈل کلاس سے لے کر اپر کلاس تک کے لوگوں کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ گھروں میں زیادہ سامان رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ جاپانی گھروں کی طرح ان کے گھروں میں بھی فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھی۔ چوکی رکھ کر کھانا کھاتے تھے اور وہیں رات کو سو جاتے تھے۔ بانس کے دو تین اٹیچی کیس ہوتے تھے جن میں روزمرہ کے استعمال کے کپڑے ہوتے تھے۔ ان کا لباس بھی بڑا سادہ تھا۔ لنگی، کرتہ اور سر پر زرد یا گلابی رومال بندھا ہوتا۔ میں نے اس زمانے میں کسی برمی کو کوٹ پتلون میں نہیں دیکھا۔ چاول ان کی اہم غذا تھی۔ روٹی نہیں کھاتے تھے اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ بارشوں کا گرم مرطوب خطہ ہے اور جہاں سارا سال بارشیں ہوتی ہیں وہاں فضا میں ہر وقت رطوبت رہتی ہے اور روٹی مشکل سے ہضم ہوتی ہے۔ پھلوں میں آم بھی ہوتا تھا مگر اناناس اور ناریل اور پپیتے کی بھرمار تھی۔ مچھلی ان کی من پسند ڈش تھی۔ برما کے لوگ مچھلی کا اچار بھی بناتے تھے جس مکان میں مچھلی کے اچار کی چاٹی کا منہ کھلتا تھا اس گلی میں اس کی تیز بو پھیل جاتی تھی۔

برمی ٹیکسی ڈرائیور بڑی تیز گاڑی چلاتے تھے۔ جرائم پیشہ برمی چوریاں عام کرتے تھے۔ سیڑھیوں میں لگے ہوئے گھروں کے بجلی کے میٹر اتار کر لے جاتے تھے۔ تن آسانی ان میں بہت زیادہ تھی اور مشقت سے بہت گھبراتے تھے۔ چنانچہ کوئی برمی رکشا نہیں کھینچتا تھا۔ رکشا کھینچنے والے سب جنوبی ہند کے تامل لوگ تھے۔ برمی لوگ کاروبار سے بھی جی چراتے تھے۔ ان کی ان ہی کمزوریوں کی وجہ سے ہندوستانیوں خاص طور پر تامل،

سورتی، میمن اور پنجابیوں نے سارا کاروبار سنبھالا ہوا تھا۔

تامل لوگ بھی پنجابی کی طرح جفاکش لوگ تھے اور یہ تو قدرت کا اصول ہے ک
جو محنت کرے گا جفاکشی کے کام کرے گا وہی کامیاب ہوگا۔ یہاں میں سری لنکا کے لوگو
کی مثال ضرور دوں گا۔ سری لنکا کے لوگ بھی سخت تن آسان ہیں۔ سری لنکا کا شمال کا ی
جافنا کا علاقہ چونکہ ہندوستان کے قریب ہے اس لئے محنت مزدوری اور مشقت کا کا
کرنے والے جنوبی ہندوستان کے تامل لوگ ہی آتے ہیں۔ وہاں یہ بات مشہور تھی ک
دھان کی فصل سری لنکا والے بوتے ہیں اور کٹائی تامل لوگ آ کر کرتے ہیں۔ یہ سلس
شمالی لنکا میں سالہا سال سے چل رہا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ تامل مزدور صبح سری لنکا م
آئیں اور دھان کی کٹائی کر کے شام کو واپس ہندوستان چلے جائیں۔ یہ لوگ آہستہ آہ
سری لنکا میں ہی آباد ہو گئے۔ شمالی علاقے جافنا میں ان کی اکثریت ہو گئی۔ چنانچہ آج ی
تامل لوگ شمالی لنکا میں اپنی ایک الگ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے لڑ ر
ہیں لیکن برما میں یہ صورت حال اس لئے پیدا نہیں ہوئی کہ برما کا شمالی بارڈر ہندوستان ک
صوبہ بنگال سے ملتا ہے اور بنگالی خود کاہل اور سست الوجود ہیں۔

وہ زمانہ ویسے بھی بڑا سستا زمانہ تھا۔ روپے کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ لاہور
لے کر رنگون تک انگریزوں کے روپے، آنے اور پیسوں کے سکے چلتے تھے۔ تازہ اور شیر
اناس دو پیسے میں مل جاتا تھا۔ ناریل تو اس سے بھی زیادہ سستا تھا۔ ناریل برمی لوگوں
گھریلو دستکاریوں میں بڑا نمایاں کردار ادا کرتا تھا اور آج بھی کر رہا ہے۔ ناریل کی چھا
کی چٹائیاں بنتی تھیں۔ رسیاں بنتی تھیں۔ دریاں بنتی تھیں۔ ناریل کے خشک کھوپے سے
پیالے اور ڈوئیاں بنائی جاتی تھیں۔ میں نے رنگون میں ناریل کے کھوپوں سے بنا
ہوئے پاندان دیکھے ہیں۔ بانس بھی برما کے جنگلوں میں عام اگتا تھا اور بانس سے بڑ
کام لئے جاتے تھے۔ اٹیچی کیسوں، سوٹ کیسوں سے لے کر فرنیچر تک بانس سے تیار
تھا۔

یورپ میں جنگ کی شدت میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا اس بات کو محسوس

جانے لگا کہ جنگ مشرق بعید تک بھی پھیل سکتی ہے۔

برما کی انگریز حکومت نے تمام سرکاری ملازمین کے لئے فوجی ٹریننگ لازمی قرار دے دی۔ یہ حکم صرف نوجوانوں کے لئے تھا۔ چنانچہ مجھے بھی ٹریننگ حاصل کرنی پڑ گئی۔ اگرچہ میں باقاعدہ سرکاری ملازم نہیں تھا لیکن رنگون ریڈیو سے ہفتے میں تین بار اردو خبروں کے سات منٹ کے دورانیے کے بلٹن پڑھتا تھا۔ چونکہ بمباری کی صورت میں دشمن سب سے پہلے ریلوے سٹیشن اور ریڈیو سٹیشن کو نشانہ بناتا ہے اس لئے ہمارے لئے فوجی تربیت بہت ضروری سمجھی گئی۔

رنگون کے مضافات میں شہر سے دس پندرہ میل دور شمال کی جانب جنگل میں ایک جگہ برطانیہ کی ہندوستانی فوج کی ایک چھوٹی سی چھاؤنی تھی جس کا نام سیلز بیرکیس تھا۔ میں روز صبح بس میں بیٹھ کر وہاں جاتا تھا۔ یہ برٹش انڈین آرمی کی کسی رجمنٹ کی سپلائی کور تھی۔ درمیانے قد کا چوڑے منہ اور نیلی آنکھوں والا ایک انگریز کیپٹن ہمیں لیکچر دیا کرتا تھا۔ ہمیں قواعد کرائی جاتی۔ آگ بجھانے اور بمباری کی صورت میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے طریقے بتائے جاتے۔ رائفل چلانی سکھائی جاتی۔ دستی بم کا پن کیسے نکالا جاتا ہے اور اسے کیسے دشمن کے ٹھکانے پر پھینکا جاتا ہے یہ سکھایا جاتا۔

اس زمانے میں فوجیوں کے بھاری جوتوں کے تلوؤں میں لوہے کے کیل اور کوکے لگے ہوتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ بھاری جوتے پہن کر پٹرول گیسولین کے ذخیروں میں نہیں جائیں گے۔ ہمارے جوتوں کے کیل کانٹوں سے چلتے وقت رگڑ کھا کر جو چنگاری نکلتی ہے وہ پٹرول کے ذخیرے کو آگ لگا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر روز پندرہ منٹ کے لئے ہمیں ایمونیشن اور راشن کی سپلائی کا کورس بھی پڑھایا جاتا۔ انگریز کیپٹن یہ سارے لیکچر انگریزی میں دیا کرتا تھا۔

جنگل میں ایک جگہ درختوں کو کاٹ کر تین چار فوجی بارکیں بنا دی گئی تھیں۔ یہاں گولہ بارود اور پٹرول وغیرہ کا زمین دوز ذخیرہ بھی تھا۔ ایک طرف چاند ماری کے لئے اونچی دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس رجمنٹ میں پوٹھوہار جہلم اور میرپور کے فوجی جوان سب سے

زیادہ تھے۔ مدراسی بھی تھے مگر وہ کلرک وغیرہ تھے۔ یا لانگری تھے۔ انگریزوں کو معلوم تھا کہ
جنوبی ہند کے لوگ میدان جنگ میں لڑ نہیں سکتے چنانچہ ان سے وہ فوجی دھوبیوں اور
لانگریوں کی ڈیوٹی لیتے تھے۔ مجھے نہ تو برٹش انڈین آرمی سے کوئی دلچسپی تھی' نہ فوجی تربیت
سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں سیلز بیریکس کے فوجی کیمپ میں ایک طرح سے پھنس گیا تھا۔ مجھے
یاد ہے جو انگریز فوجی ہمیں لیکچر دیا کرتا تھا اس کا نام کیپٹن لیوس تھا۔ اس انگریز کی شکل
بالکل پہلے روز کی طرح آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

وہ پلیئرز کے سگریٹ پیا کرتا تھا۔ وہ زمانہ ہی خالص چیزوں کا تھا۔ سگریٹ بھی
خالص ملا کرتے تھے۔ ابھی سگریٹوں کے پیچھے فلٹر نہیں لگے تھے اور جیسی تلخی اور خوشبو
سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے سے چلتی تھی۔ ویسی کی ویسی بلکہ کچھ اضافے کے ساتھ
سگریٹ کے دوسرے سرے سے ہو کر سگریٹ پینے والے تک پہنچتی تھی۔ خیر سے میں نے
سگریٹ اس زمانے میں ہی شروع کر دیئے تھے۔

برما میں وائٹ ہارس نام کا ایک سگریٹ بڑا چلتا تھا۔ میں یہی سگریٹ پیا کرتا تھا
مگر ہمیں لیکچروں اور فوجی ٹریننگ کے دوران سگریٹ پینے کی اجازت نہیں تھی جبکہ انگریز
کیپٹن لیکچر دیتے وقت برابر سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ اور پلیئرز کے اعلیٰ سگریٹ کی خوشبو لیکچر
روم میں پھیلی ہوتی تھی۔

ایک دن ہمیں فوجی ٹرانسپورٹ طیارے میں بٹھا کر رنگون سے کافی دور دریا کے
دوسرے کنارے پر تیل کے کنوؤں پر لے جایا گیا۔ ہمارے فوجی جوتوں پر ربڑ کے غلاف
چڑھا دیئے گئے تا کہ ہمارے جوتوں میں لگے ہوئے کیل سے چنگاری پیدا نہ ہو۔ اب میں
آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کیا کرتا تھا۔ جب لیکچر سنایا جاتا تو میں لیکچر روم کی قریبی کھڑکی میں
سے نظر آنے والے ناریل اور بانس کے درختوں کو دیکھا کرتا تھا۔ حرام ہے جو مجھے معلوم ہو
کہ یہ انگریز کیپٹن کیا چیز ہے اور کس چیز کے بارے میں لیکچر دے رہا ہے۔

اس کی انگریزی برابر میری سمجھ میں آتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزی کے
مضمون میں میں شروع ہی سے ہوشیار ہوتا تھا اور انگریزی کے پرچہ "بی" یعنی انگریزی سے

اردو میں ترجمہ اور اردو سے انگریزی میں ترجمے میں سو میں سے ہمیشہ 80 پچاسی نمبر لیا کرتا
تھا۔ یہی پرچہ مجھے انگریزی میں پاس کراتا تھا لیکن مجھے اس انگریز کی انگریزی سمجھ کے کیا
لینا تھا۔ وہ کوئی کیٹس یا شیلے کی شاعری یا چارلس ڈکنز کے فن پر تو لیکچر دے نہیں رہا تھا۔

ان پڑھ قسم کا دیہاتی ٹائپ کا انگریز فوجی تھا۔ مجھے اگر اس کی کوئی چیز اچھی لگتی
تھی تو پلیئرز سگریٹ کا پیکٹ ہوتا تھا جو ماچس کے ساتھ اس نے میز پر اپنے سامنے رکھا
ہوتا تھا۔ ایک روز انگریز کیپٹن ہمیں بانس کی اونچی چھت کے نیچے لیکچر دے رہا تھا کہ ایک
دم بارش شروع ہو گئی۔ یہ جنوبی سمندروں سے اٹھے ہوئے سیاہ بادلوں کی بارشیں ہوتی
تھیں۔ بارش نے ایسا شور مچایا کہ انگریز کیپٹن کی آواز غائب ہو گئی۔ ہمیں صرف اس کے
ہونٹ ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ اوپر سے چھت ٹپکنے لگی۔ اس نے ہمیں فال ان ہونے
کا آرڈر دیا اور کوئیک مارچ کراتا سٹور روم کے برآمدے میں لے آیا۔ برآمدے تک پہنچتے
پہنچتے ہماری فوجی وردی بارش میں شرابور ہو گئی۔

میں پہلی بار جنگل کی بارش میں بھیگا تھا۔ جنوبی ایشیا کے جنگلوں کی بارش نے
میرے خون کو گرم کر دیا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بارش سے پہلی بار مل رہا
ہوں۔ جیسے یہ بارش زمین کی پہلی بارش تھی۔ جس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ بارش کے
ساتھ ہی اس جنگل کے درختوں کی الگ الگ خوشبوؤں نے بیدار ہو کر ایک خوشبو کی شکل
اختیار کر لی تھی۔ اس میں بانس' ناریل' دارچینی' بادیان خطائی اور الائچی کی خوشبو بھی تھی۔
معلوم ہوتا تھا جیسے بارش جنگل کے بھیگتے ہوئے درختوں کے ساتھ بیٹھ کر موتیا رنگ کا کشمیری
قہوہ پی رہی ہے۔

آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس وقت میں کیا محسوس کر رہا تھا۔ میں زندگی کی
انتہائی لطافتوں کا ادراک کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا جسم روح سے بھی زیادہ
لطیف ہو گیا ہے۔ انتہائے لطافت کا یہ مقام تھا جہاں روح بھی مادے کا ایک حصہ لگتی تھی۔
میرا جسم جیسے بارش کی خوشبو بن کر سارے جنگل میں پھیل گیا تھا۔ میں خود اپنے مادی جسم
کے آر پار دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ موت کے بعد کی کیفیات ہیں جن کا تجربہ مجھے

زندگی میں ہو رہا تھا۔

جہاں اس فوجی کیمپ سیلز بیریکس کا جنگل شروع ہوتا تھا وہاں بڑی سڑک پر سے ایک پتلی سڑک جنگل میں جاتی تھی۔ یہ سڑک فوج نے بنائی تھی۔ میں بڑی سڑک کے بس سٹاپ پر اتر جاتا تھا اور پتلی سڑک پر سے پیدل گزر کر فوجی کیمپ یا ٹریننگ سنٹر تک جاتا تھا۔ اس سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے درخت تھے جنہوں نے سڑک پر چھت ڈال رکھی تھی۔ یہاں دن کے وقت سبز روشنی پھیلی رہتی تھی۔ جہاں یہ سڑک بل کھا کر کیمپ کی طرف مڑتی تھی وہاں درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان مہاتما گوتم بدھ کا زمین پر لیٹا ہوا ایک بہت بڑا مجسمہ تھا۔ یہ اتنا بڑا مجسمہ تھا کہ اس کے پاؤں کے انگوٹھے میں کسی برمی نے چائے کا کھوکھا بنا رکھا تھا۔

خدا جانے یہ کس زمانے سے یہاں پڑا تھا۔ بارشوں کی وجہ سے مجسمے کا رنگ کالا پڑ چکا تھا۔ گوتم بدھ اس طرح ایک پہلو پر لیٹا ہوا تھا کہ اس نے اپنے بہت بڑے سر کو اپنے بازو کی ہتھیلی کا سہارا دے رکھا تھا۔ گلہریاں اس بت پر ادھر سے ادھر دوڑتی رہتی تھیں۔ اونچے درختوں کی چھت والی جنگل کی یہ پتلی سی نازک اندام سڑک مجھے اتنی اچھی لگتی تھی کہ میں بہت ہی آہستہ آہستہ وہاں سے گزرا کرتا تھا۔ یہاں سبزے اور درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو ہر وقت پھیلی رہتی تھی۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ہر بار میرا سگریٹ پینے کو جی چاہتا تھا لیکن میں اس خیال سے وہاں کبھی سگریٹ نہیں لگاتا تھا کہ سگریٹ کے دھوئیں سے درختوں کی پاک صاف فضا آلودہ نہ ہو جائے اور ننھی ننھی کونپلوں کا دم نہ گھٹنے لگے۔

رنگون میں دو اخباروں کا ایڈیٹر ہونے کے ناطے بھائی جان کے ملنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ لیکن ان کے ذاتی دوستوں کا ایک حلقہ الگ تھا۔ جس میں بشیر صاحب کمائیٹ والے، حکیم رشید صاحب، ظہور الحسن شاہ جی، احمد رنگونی کے علاوہ حاجی رحیم بخش صاحب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شاہ جی اور بشیر احمد صاحب کمائیٹ والے کا تعلق گجرات (پنجاب) سے تھا۔ کمائیٹ نام کا ایک قصبہ رنگون سے شاید بیس پچیس میل

کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سب دوست ہفتے میں ایک بار ایک دوسرے کو دعوت پر اپنے گھر بلاتے تھے۔

کمائیٹ میں بشیر صاحب کا بڑا خوبصورت دو منزلہ بنگلہ تھا۔ وہاں ایک طرف انہوں نے ایک چھوٹا سا کارخانہ لگا رکھا تھا جہاں ربڑ کے فلیٹ شوز تیار ہوتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بشیر صاحب نے گجرات میں باسکو کے نام سے ایک مشہور فرم قائم کی جس نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ بھائی جان کے دوسرے دوستوں کی ہفتہ وار دعوتوں میں تو میں شاذ و نادر ہی کبھی جاتا مگر جس ہفتے کمائیٹ میں بشیر صاحب کے ہاں دعوت ہوتی تو ضد کر کے میں بھی بھائی جان کے ساتھ جاتا۔

اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ بشیر صاحب کے ہاں ایک کافی بڑا ریڈیو گرام ٹائپ کا بڑا ماسٹرز وائس کا گراموفون تھا اور ساتھ میں تھیٹرز اور رنجیت مووی ٹون کی فلموں کے ان گانوں کے ریکارڈز کافی تعداد میں تھے جو مجھے بے حد پسند تھے۔ یہ بڑا گراموفون کوٹھی کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ میں جاتے ہی گراموفون کو چابی دیتا۔ ساؤنڈ بکس میں نئی سوئی لگاتا ڈبے میں سے پنکج ملک کا گایا ہوا پیا ملن کو جانا ریکارڈ نکال کر لگا دیتا۔ اس کے بعد خورشید کے گائے ہوئے گانے۔

"پہلے جو محبت سے انکار کیا" اور "اب کہاں بشیرا اپنا" کا ریکارڈ بجا کر سنتا۔ اس کے علاوہ امیر بائی کرناٹکی کا ایک گانا ہوتا تھا "من بھولی وفائیں یاد نہ کر" اور سہگل کا گانا "میں کیا جانوں کیا جادو ہے ان دو متوالے نینوں میں" بار بار لگا کر سنتا۔ بشیر صاحب کی کمائیٹ والی کوٹھی کا گراموفون والا کمرہ اور اس کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والے ناریل اور کیلے کے سرسبز درخت ہی یاد ہیں اور میرے نزدیک اس کوٹھی کی یہی دو چیزیں یاد رکھنے والی تھیں۔ ایک روز دعوت کے موقع پر بڑی بارش ہو رہی تھی۔ اس بارش میں کیلے اور ناریل کے درخت بھیگ رہے تھے۔ اس منظر کو میں کیسے بھلا سکتا ہوں۔ اگر انہیں بھلا دوں تو میرے پاس یاد رکھنے کو کیا باقی رہ جائے گا۔

◈......◈......◈

جب رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو شہر اور شہر کے مضافات اور قصبات ۔
تقریباً سبھی ہندوستانی برما چھوڑ کر قافلوں کی شکل میں کاکسز بازار بنگال کی جانب پی
روانہ ہو چکے تھے۔ مگر بشیر صاحب اپنے کمائٹ والے بنگلے پر ہی رہے تھے۔ اس کی وجہ
تھی کہ وہ سیاسی اعتبار سے سبھاش چندر بوس کی فارورڈ بلاک پارٹی سے منسلک تھے ا
جب سبھاش چندر بوس انگریزوں کے ہندوستان سے بھیس بدل کر فرار ہوا تھا تو دورا
بشیر صاحب کے ہاں کمائٹ میں بھی ٹھہرا تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے بعد میں معلوم ہ
تھیں۔ چنانچہ بشیر صاحب کا خیال تھا کہ جاپانی انہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن جیسا کہ
میں بھائی جان نے بتایا کہ جاپانیوں نے شروع شروع میں بشیر صاحب پر تھوڑا تشدد کیا
لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ واقعی سبھاش چندر بوس کے خیر خواہوں میں سے ہیں
انہیں ان کی کوٹھی بھی واپس کر دی اور جاپانی فوجیوں کے لئے ربڑ کے فلیٹ شوز بنانے
آرڈر بھی دے دیا۔

سولی پیگوڈا رنگون شہر کا سب سے بڑا بدھ معبد تھا۔ اس کے بیٹھے ہوئے چھو
بڑے گنبدوں اور ان کے کلس پر سونے کا پترا چڑھا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ سنگین سیڑھیوں
سلسلہ اوپر مندر کے وسیع و عریض لان تک چلا گیا تھا۔ ان سیڑھیوں کی دونوں جانب
عورتیں بیٹھی پھول بیچتی تھیں۔ پانی سے بھری ہوئی لکڑی کی بالٹیوں میں رنگ برنگ پھول
کے گلدستے رکھے ہوتے تھے۔ ان میں کنول کے پھول اور کنول کے پھولوں کی کلیاں
ہوتی تھیں اور گیندے اور موتیا اور رتنا کلی کے کاسنی پھول بھی ہوتے تھے۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ان پھولوں کی خوشبو ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ لوگ ان
عورتوں سے پھول خرید کر لے جاتے تھے اور مہاتما بدھ کی مورتیوں پر چڑھاتے تھے۔ سولی
پیگوڈا کی ان سیڑھیوں پر ہی میں نے پہلی مرتبہ پھول بیچنے والی برمی لڑکی ساتیں کو دیکھا۔
اس کا نام ساتیں تھا۔ وُہ سفید ململ کی کرتی اور سبز ریشمی لہنگا پہنے پھولوں سے بھری ہوئی
ٹوکریوں کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ کنول کے پھول ایسا زرد تھا۔ پھولوں کے پاس بیٹھی
وہ خود ایک پھول کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

اس کے معصوم چہرے پر کنول کے زرد پھولوں ایسی گہری اداسی اور تازگی تھی۔
اس بھولی بھالی پاک صاف شفاف چہرے والی برمی لڑکی کو دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا
کہ کنول کا پھول دیکھتا بھی ہے۔ کنول کا پھول بات بھی کرتا ہے اور کنول کا پھول محبت کی
باتیں سنتا بھی ہے۔ پھول محبت چاہتے ہیں۔ عزت و احترام چاہتے ہیں اور جب محبت میں
عزت و احترام کا نور شامل ہو جاتا ہے تو وہ پھولوں کی پاکیزگیوں اور معصومیتوں سے بھی
آگے بہت آگے نکل جاتی ہے۔ پھر وہ روشنی کی رفتار کے ساتھ پرواز کرتی ہے اور آسمانوں
کے تمام ستارے' سیارے اور سورج اور چاند اس کے نورانی حلقے میں آ جاتے ہیں۔

پھول بیچنے والی اس برمی لڑکی ساتیں کو دیکھ کر مجھے اسی نورانی محبت اور انسانیت
کی عزت و احترام کا احساس ہوا تھا۔ جس طرح روشنی اندھیروں کو دور کر دیتی ہے۔ اسی
طرح ساتیں کے تصور نے میرے دل کے تمام منفی اور برے خیالات کے اندھیروں کو مجھ
سے دور کر دیا تھا۔ ابھی تک میں نے اس برمی لڑکی' اس کنول کے زرد پھول سے کوئی بات
نہیں کی تھی۔ ابھی تک اس نے بھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس روز میں پہلی بار رنگون کے اس
عالی شان پیگوڈا کو دیکھنے جا رہا تھا۔ اس معبد کا شمار رنگون کی مقدس تاریخی عمارتوں میں ہوتا
تھا اور سیاح اسے دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ پیگوڈا کے کئی دالان تھے۔ ہر دالان میں جگہ جگہ
مہاتما بدھ کے چھوٹے بڑے سنہری مجسمے لگے ہوئے تھے۔ جن کے آگے عقیدت مند
پھولوں کے گلدستے رکھتے اور اگر بتیاں سلگاتے تھے۔

معبد کے تین چار ہال کمرے تھے۔ ہر ہال کمرے میں گوتم بدھ کے بیٹھے ہوئے

اور نیم دراز مجسمے تھے جن پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا۔ سب سے بڑے ہال کمرے میں گ
بدھ کا سب سے بڑا مجسمہ تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سارے کا سارا سونے
ہے۔ زرد کپڑوں والے بدھ بھکشو جگہ جگہ بیٹھے گوتم بدھ کی تعلیمات کے اشلوک پڑھ رہ
تھے۔ ساری فضا پر ایک تقدس چھایا ہوا تھا۔ اس معبد میں ہر عقیدے اور مذہب کے ما
والوں کو آنے کی اجازت تھی۔

سولی پیگوڈا کے چھت سات قطعے تھے جو تھوڑی تھوڑی اونچائی پر بنے ہو
تھے۔ ہر قطعے کے چار چار دالان تھے۔ لگتا تھا کہ یہ معبد ایک ٹیلے پر بنایا گیا ہے۔ تیسر
قطعے کے دالان میں ایک بہت بڑا درخت تھا جہاں چڑیوں کی چہکار گونج رہی تھی۔ ہزاروا
چڑیاں درخت کی شاخوں پر اور درخت کے نیچے بیٹھی دانہ دنکا چن رہی تھیں۔ درخت ا
ٹہنیوں کے ساتھ بے شمار مٹی کے پیالے لٹک رہے تھے۔ کسی میں دال چاول تھے تو کس
میں پانی بھرا ہوا تھا۔

کہتے ہیں کہ گوتم بدھ جب سچائی کی تلاش میں جنگل جنگل پھرا کرتے تھے اور کوا
انہیں کھانے کو کچھ دے جاتا تھا تو وہ آدھا سے زیادہ کھانا چڑیوں کو ڈال دیا کرتے تھے
عورتیں اور بچے یہاں آ کر چڑیوں کو دانہ ڈالتے تھے۔ یہاں چڑیوں نے اس قدر شور مچا
ہوا تھا کہ واقعی کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

چوتھے قطعے کے دالان کی مشرقی جانب نیچے زمین پر اُگے ہوئے ناریلوں کے
درختوں کے جھنڈ دالان کی پتھریلی منڈیروں کو چھو رہے تھے۔ ان درختوں کے سبز کچ
ناریلوں کو آپ ہاتھ سے چھو سکتے تھے مگر ان ناریلوں کو کوئی نہیں توڑتا تھا۔ وہ پک پک کر
خود بخود نیچے گر پڑتے تھے۔

میں دیر تک معبد کے دالانوں اور قطعوں میں پھرتا رہا۔ اس کے بعد واپس
جانے کے لئے سیڑھیاں اترنے لگا۔ دوسرے قطعے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میری نگاہیں
اپنے آپ پھول بیچنے والی لڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ایک عورت کو پھول دے رہی تھی۔
پانی کی بالٹی میں سے اس نے گیندے اور رتنا کلی کے لمبے ڈنٹھل والے پھول نکالے اور ان

کا ایک گلدستہ سا بنا کر عورت کو دیدیا۔

میں سیڑھیوں کی چھوٹے چھوٹے ستونوں والی منڈیر کے ساتھ لگ کر کھڑا پھول
بیچنے والی لڑکی ساتین کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آ گیا کہ اس نے بھی میری
طرف دیکھ لیا تو وہ میرے بارے میں کیا خیال کرے گی کہ میں کتنی بدتمیزی سے اسے گھور
رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے اپنی نگاہیں ہٹانا چاہیں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ مجھے ایسا لگا اگر
میں نے ساتین کے چہرے سے نگاہیں ہٹا لیں تو وہ میری نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
غائب ہو جائے گی۔ عین اسی وقت ٹوکری میں پھولوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے پھول
بیچنے والی کی نگاہ مجھ پر بھی پڑ گئی۔ میں گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے دل
کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

میں جلدی جلدی اس قطعے کی سیڑھیاں اتر کر سب سے آخری قطعے کی سیڑھیوں
پر آ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن ابھی تک معمول پر نہیں آئی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے پھول
بیچنے والی میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرا دی ہو۔ جیسے بادلوں میں ذرا سی بجلی چمک جاتی
ہے۔ حقیقی محبت کی اس ننھی سی بجلی نے چمک کر میری روح کو اس کی گہرائیوں تک منور کر دیا
تھا۔ مجھے اپنے سینے میں ایک ارتعاش سا محسوس ہوا۔ میں نے پیچھے مڑ کر پھول بیچنے والی کو
دوبارہ دیکھنے کی خواہش کی مگر مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اس دیدار کا متحمل نہیں ہو سکوں گا۔
اگر میں نے اسے دیکھا تو میری آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی۔

آہ! مجھے دانتے کی محبت بھری نظم کا ایک شعر یاد آ گیا۔

”تو کس لئے اس خاتون سے محبت کرتا ہے
جب تو اس کے دیدار کا متحمل نہیں ہو سکتا“

اس لئے مجھے عشقِ حقیقی اور قلبِ سلیم ایک ہی شکل میں دکھائی دے رہے تھے۔
عشقِ حقیقی کا مقام قلبِ سلیم میں ہی ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر دونوں میں سے کسی کا وجود
ممکن نہیں۔ یہ میرے اس وقت کے اس چھوٹی عمر کی پاکیزہ محبتوں کے محسوسات تھے۔ ان
کے نام اور ان محسوسات کے حدود اربعے سے میں بالکل ناواقف تھا۔ یہ ساری وضاحتیں یہ

ساری تشریحات اب میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔ جب میں ایک زمانہ گزر جانے
بعد آج ان محسوسات کا تجزیہ کرنے بیٹھا ہوں۔ تجزیہ کرتے وقت عقل اور علم کو شامل
کرنا پڑتا ہے اور محبت کے دودھ میں علم اور عقل کا پانی شامل ہو جاتا ہے اور پھر محبت کی
خوشبو تو غائب ہو جاتی ہے اور عقل اور علم کے کاغذی پھول باقی رہ جاتے ہیں۔ علامہ
کیا خوب فرما گئے ہیں ۔

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

برمارنگون کے بارے میں جب میں نے اپنا پہلا ناول لکھا تھا تو اس میں
بیچنے والی اس لڑکی ساتیں کو میں نے بطور ہیروئن پیش کیا تھا اور اس سے اظہار محبت
تھا اور بہت باتیں بھی کی تھیں۔ ایسا میں نے ناول کے ادبی تقاضوں کے تحت کیا
فکشن تھی۔ وہاں مبالغہ آرائی کی گنجائش تھی مگر یہ میں فکشن نہیں لکھ رہا۔ یہ حقیقی واقعا
مشتمل سفرنامہ ہے۔ یہاں میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے سکتا۔ چنانچہ میں واق
اسی پیرائے میں بیان کروں گا جس طرح وہ رونما ہوئے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرے لئے اس پھول بیچنے والی برمی لڑکی ساتیں کے
چہرے کو ایک نظر دیکھنا ہی بہت تھا۔ اس ایک نگاہ کے سورج نے میری روح کو
گہرائیوں تک روشن کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ روشنی میری بصارت کی برداشت سے
تھی۔ جسم کی روحانیت اور مجازی محبت کا شاید یہ کوئی اعلیٰ درجہ تھا۔ کوئی بلند ترین
جس نے مجھے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہ جسم نواز مگر بلند پرواز محبت کا جذبہ تھا
میرے کردار کو زندگی کے عام تجربات سے بلند کر دیا تھا۔ کہتے ہیں محبت کا سوز و گدا
انسانی کی اصلاح کرتا ہے اور انسانی سیرت کو بدل دیتا ہے۔ مجھے اس کا علمی شعور
لیکن چونکہ میرے دل کا آئینہ شفاف اور بغیر کدورت کے تھا اس لئے پھول بیچنے وا
کو ایک نظر دیکھنے سے میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی کے لاط
برنارڈو نے مشرق کے اسی تصور حسن و عشق سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

"ایک بار اپنی محبوبہ کا جلوہ دیکھ لوں تو پھر جنت کی آرزو نہ کروں۔"

اس پھول بیچنے والی کنول کے پھول ایسی لڑکی کی محبت کے شعلے نے اچانک
میرے اندر بھڑک کر میرے دل کو تمام آلائشوں سے پاک کر دیا تھا۔ اس وقت میں اپنی
نفسیات کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی میں ان کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ آج میں اپنی اس
وقت کی جذباتی حالت کا تصور کرتا ہوں تو یہی کچھ میری سمجھ میں آتا ہے جو میں بیان کر چکا
ہوں۔ اس وقت میں نے اقبال اور رومی نہیں پڑھا تھا۔ اب پڑھا ہے اور مجھے رومی کا یہ
شعر بے اختیار یاد آ رہا ہے۔

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

میں پیگوڈا کے آخری قطعے کی بھی سیڑھیاں اتر کر وہاں سے واپس اپنے فلیٹ
والی لیوس سٹریٹ کی طرف چل پڑا۔

دوسرے دن ٹھیک اسی وقت میرے قدم اپنے آپ سولی پیگوڈا کی طرف اٹھتے
چلے گئے۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اس قطعے پر آ گیا جہاں دونوں جانب پھول
بیچنے والیاں بیٹھتی تھیں۔ میں دل میں فیصلہ کر کے آیا تھا کہ آج میں ساتیں سے کچھ پھول
خریدوں گا۔ اس کنول کے پھول ایسی لڑکی کو قریب سے دیکھوں گا۔ میں نے نظر اٹھا کر
دیکھا ساتیں پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریوں اور بالٹیوں کے پاس بیٹھی پھولوں کے
چھوٹے چھوٹے گلدستے بنا رہی تھی۔

جیسے میں اس کی طرف بڑھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی مگر میں نے بہت
جلد اپنے جذبات کو سنبھال لیا۔ اب میں ساتیں کے سامنے کھڑا پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس
لڑکی نے برمی زبان میں کچھ کہا۔ ساتیں کے چہرے پر گلابی روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ شاید
یہ پھولوں کی شبنمی پنکھڑیوں سے طلوع ہونے والی روشنی کا عکس تھا۔ ساتیں نے کچھ
ہندوستانی یعنی اردو اور کچھ اپنی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میں کون سے پھول پسند کروں
گا۔ میں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ لکڑی کی بالٹی میں رکھے ہوئے کنول کے گلابی پھولوں کی

طرف اشارہ کیا۔ ساتیں نے بالٹی میں سے کنول کے تین چار پھول نکال کر ان کے گر
دھاگا لپیٹا اور میری طرف بڑھائے۔

میں نے پوچھا۔ ''کتنے پیسے؟''

اس نے کچھ پیسے بتائے۔ میں نے اسے دے دیئے۔ ساتیں نے مسکرا
ہوئے ذرا سا سر جھکا کر میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ میں کنول
گلدستہ لئے پیگوڈا کے پہلے دالان میں آ کر ناریل کے درختوں والی منڈیر کی طرف
گیا۔ ساتیں کی آواز کا ترنم ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں نے منڈیر
ایک طرف کر کے پھول رکھ دیئے اور کچھ دیر دالان میں پھرتا رہا۔ پھر واپس جاتے ہو
ساتیں کے قریب سے ہو کر سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ ساتیں کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ ذرا
مسکرائی اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ ذرا سی بجلی چمکی اور پھر بادل چھا گئے۔

میں نے روز پیگوڈا جانا شروع کر دیا اور روز ساتیں سے کنول کے پھول خرید
اور اس کی آواز سنتا۔ اس کے روشن اور پھولوں کی طرح شگفتہ چہرے کا دیدار کرتا اور او
کر پیگوڈا کے کبھی دوسرے اور کبھی تیسرے قطعے کے دالان میں ادھر ادھر پھرتا رہتا۔ معب
میں جا کر پھولوں کا گلدستہ واپس لے جانا مناسب نہیں تھا چنانچہ میں کبھی کسی منڈھیر پر ا
کبھی کسی درخت کے پاس پھول رکھ کر واپس چل پڑتا۔

واپسی پر سیڑھیاں اترتے ہوئے ساتیں کے قریب سے گزرتا تو دل کی دھڑکن
تیز ہو جاتی۔ کبھی وہ میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتی اور کبھی اپنے کام میں لگی رہتی۔ کچھ دن
گزرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جب میں ساتیں سے پھول خرید رہا ہوتا ہوں تو
دوسری پھول بیچنے والیاں مجھے گھور کر دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ شاید انہیں شک پڑ گیا تھا کہ میں
ہر روز ساتیں ہی سے پھول خریدتا ہوں تو ضرور میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔

اس کے بعد میں ایک دن چھوڑ کر جانے لگا اور دوسری عورتوں سے بھی پھول
خرید لیتا تھا۔ لیکن دوسری پھول بیچنے والیوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ سمجھ گئی ہیں کہ
میں صرف ساتیں کو دیکھنے وہاں آتا ہوں۔ میری وجہ سے کوئی اس معصوم پھول بیچنے والی

لڑکی ساتیں پر اس قسم کا گمان دل میں لائے۔ یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں نے پیگوڈا جانا
ترک کر دیا۔ لیکن دل میں پھول بیچنے والی لڑکی ساتیں کا خیال برابر لگا رہا۔ تین دن بڑی
کشمکش میں گزارے چوتھے دن قدم اپنے آپ پیگوڈا کی طرف اٹھنے لگے۔

پہلے قطعے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر آیا تو نگاہیں ساتیں کو تلاش کرنے لگیں۔
سب پھول بیچنے والیاں موجود تھیں مگر وہ جس کو میری نظریں تلاش کر رہی تھیں کہیں دکھائی
نہیں دے رہی تھیں۔ میں خاموشی سے سر جھکائے دوسرے قطعے کی سیڑھیاں چڑھ کر پیگوڈا
کے پہلے دالان میں آ کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

آج میں نے کوئی پھول نہیں خریدے تھے جس سے پھول خریدنے تھے جس
کے لئے پھول خریدنے تھے جب وہ ہی نہیں تھی تو پھر پھول کس کے لئے خریدتا؟ دیر تک
بیٹھا سوچتا رہا کہ ساتیں یہیں کہیں ادھر ادھر ہو گی۔ تھوڑی دیر بعد آ جائے گی۔ جب مزید
انتظار کی طاقت نہ رہی تو اٹھ کر سیڑھیاں اترنے لگا دور سے دیکھا۔ ساتیں دکھائی نہ دی۔
میں نے کسی کو نظر اٹھا کر نہ دیکھا سر جھکائے سیڑھیاں اتر کر سولی پیگوڈا چوک میں آ گیا۔

کس سے پوچھتا کہ پھول بیچنے والی آج کیوں نہیں آئی؟ وہ کہاں چلی گئی ہے؟
وہ خیریت سے تو ہے؟ سارا دن اداس اداس سا پھرتا رہا۔ کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ رنگون سے
باہر تھوڑے فاصلے پر جھیلوں کا سلسلہ تھا جس کی جھیلیں ایک دوسری کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔
ان جھیلوں کے کنارے کنارے سفید، زرد اور ہلکے قرمزی رنگ کے کنول کے بے شمار پھول
کھلے ہوئے تھے۔ میں وہاں جا کر جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھ گیا۔

اس روز ساتیں کا دیدار نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ایسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے
میری محبت جو امرتسر میں مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔ رنگون میں ساتیں کی شکل میں مجھے دوبارہ مل
گئی تھی مگر وہ ایک بار پھر مجھ سے جدا ہو گئی ہے۔ چھوٹی عمر کی محبتوں کے اثر بڑے گہرے
ہوتے ہیں۔ ہر جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ ابھرتا ہے اور وارث شاہ کیا درست کہہ گئے
ہیں۔

چھوٹی عمر دیاں یاریاں بہت مشکل

پتر مہراں دے مجھیاں چار دے نی

جب سورج غروب ہونے لگا تو میں اخبار ''شیر رنگون'' اور ''مجاہد برما'' کے دفتر میں آ گیا۔ بھائی جان اپنی میز پر بیٹھے تیز تیز قلم چلاتے ہوئے شاید اداریہ یا اداراتی نوٹ لکھ رہے تھے۔ ظہور شاہ جی اپنی میز کے پہلو میں آرام کرسی پر بیٹھے اخبار کی کاپیاں دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ حقہ بھی پی رہے تھے۔ دفتر کا سٹاف اپنے اپنے کام میں مصروف تھا۔ میں شاہ جی کے پاس بیٹھ گیا۔ جب وہ کاپیاں دیکھ چکے تو حقے کے دو ایک کش لگا کر مجھ سے علامہ اقبال کا کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میری آواز اچھی تھی۔ موسیقی سے لگاؤ بھی تھا۔ میں علامہ اقبال کا کلام ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔ شاہ جی مجھ سے علامہ اقبال کی ایک غزل

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا
عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا
وہ راز اب آشکار ہو گا

بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے انہیں علامہ صاحب کی ساری غزل جو مجھے زبانی یاد تھی ترنم سے سنائی۔ وہ بڑے انہماک سے حقہ بھی پیتے رہے اور اقبال کا کلام بھی سنتے رہے۔

◆......◆......◆

شاہ جی کے حقے کے لئے سوکھا تمباکو خاص طور پر گجرات سے آیا کرتا تھا۔ اس تمباکو کی مخصوص خوشبو دفتر میں پھیلی رہتی تھی۔ شاہ جی ایک بار جنگ کے حالات پر رنگون ریڈیو کے اردو پروگرام میں تقریر کرنے گئے۔ انہیں ریڈیو پر چھ تقریروں کا ایک سلسلہ پورا کرنا تھا۔ اس روز ان کی پہلی تقریر تھی۔ میں بھی ڈیوٹی روم میں موجود تھا۔ شاہ جی کی تقریر کا دورانیہ پانچ منٹ تھا۔ انہوں نے السلام علیکم سے تقریر شروع کی اور اس جملے پر تقریر ختم کی کہ ''اس موضوع پر انشاء اللہ اگلی بار تفصیل سے بات کی جائے گی۔'' ان دنوں پروگرام کی ریکارڈنگ کا رواج نہیں تھا۔ تقریر جوں کی توں براڈ کاسٹ ہوتی تھی۔ سٹیشن ڈائریکٹر مسٹر بیکاؤ نے شاہ جی سے کہا کہ ریڈیو رنگون کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہے اس لئے آپ تقریر شروع کرنے سے پہلے السلام علیکم اور آخر میں انشاء اللہ نہ بولا کریں۔ شاہ جی نے کہا۔

''آپ اپنی پالیسی اور پروگرام اپنے پاس ہی رکھیں میں السلام علیکم اور انشاء اللہ ضرور کہوں گا۔''

اور شاہ جی نے اس کے بعد ریڈیو رنگون کا کبھی رخ نہ کیا۔ اخبار ''شیر رنگون'' اور ''مجاہد برما'' کے خوش نویس حضرات کا تعلق بھی زیادہ تر پنجاب کے ضلع گجرات سے تھا۔ اسرائیل احمد اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے جن کا تعلق صوبہ بہار سے تھا اور جو کلکتہ کے اخبار ''عصر جدید'' میں بھی کام کر چکے تھے۔

عبدل نامی منشی ضلع بدایوں کے رہنے والے تھے۔ یہ سب لوگ ایک عرصے سے رنگون میں آباد تھے۔ ایک روز انہوں نے بھائی جان سے کہا۔

"جناب مجھے ایک ماہ کی رخصت عنایت کیجئے وطن کی یاد بہت ستانے لگی ہے
کچھ روز وہاں رہ لوں گا تو طبیعت سنبھل جائے گی۔"

عبدل صاحب چھٹی لے کر ایک روز بحری جہاز میں سوار ہو کر اپنے وطن روانہ
گئے۔ جس روز وہ گئے اسی روز شام کو شاہ جی نے بھائی جان سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے
عبدل میاں کو وطن کی مٹی نے بلایا ہے۔"

اور ان کا کہنا درست ثابت ہوا۔ عبدل کے جانے کے دو ہفتے بعد وطن سے ا
کی بڑی بیٹی کا خط آیا کہ ابا میاں کا انتقال ہو گیا ہے۔ کسی آتے جاتے کے ہاتھ ان
سامان بھجوا دیجئے گا۔ مارچ کے مہینے سے لے کر اکتوبر نومبر تک رنگون میں بڑی بارش
ہوتی تھیں۔ لمبی لمبی جھڑیاں لگتیں اور سورج کئی کئی دن نظر نہیں آتا تھا۔

بارشوں میں کیلئے، ناریل، آم کے درخت ہرے بھرے ہو جاتے اور باغو
پارکوں کا سبزہ نکھر جاتا تھا۔ بارش میں برمی لڑکے بازاروں اور گلیوں میں بانس کے
ہوئے فٹ بال کھیلتے نظر آتے تھے۔ سڑکوں کے کنارے اور باغوں میں کوئی جگہ ایسی نہ
جسے سبزے نے نہ ڈھک دیا ہو۔ فٹ پاتھوں پر سایہ کئے ہوئے درخت ہر وقت گیلے
رہتے تھے اور ان میں رکے ہوئے بارش کے پانی کی بوندیں ٹپکتی رہتی تھیں۔ شہر کے ہر ف
پاتھ پر گھنے درخت سایہ کیے ہوئے تھے۔ باغوں میں نرم نرم گھاس کے خوشے مرطوب
میں لہرایا کرتے۔ شہر سے باہر نکلتے ہی دریا کی دونوں جانب دھان کے سرسبز کھیتوں، ب
سپاری، ساگوان اور ناریل اور تاڑ کے درختوں کے گنجان سلسلے شروع ہو جاتے تھے۔ ہ
سبز جھیلوں کے آئینے میں کنول کے پھول اپنا حسن و جمال دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اد
نیچے ٹیلوں پر کیلے کے درختوں کے درمیان ہو کر گزرنے والی پگڈنڈیوں کی زمین بارش
میں شروع ہو جاتی تھی۔ تیز بارشوں میں جھیلوں کی سطح پر ہلکی ہلکی دھند چھا جاتی اور کنول
پھول سر جھکا کر اپنی مخملیں نازک پنکھڑیاں سمیٹ لیتے۔

بارش...... بہت جلد رنگون پر جاپانی بموں کی بارش ہونے والی ؟
جاپان نے دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کے خلاف 2 دسمبر 1941ء

جنگ کا اعلان کیا تھا اور جاپانی فوجیں سیلاب کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے سنگاپور، فلپائن اور
ملایا پر چھا گئی تھیں۔ اب ان کے سامنے برما کا ملک تھا۔ جاپانیوں نے 24 دسمبر 1941ء
کو رنگون پر پمفلٹ گرائے جس پر لکھا تھا کہ ہم آپ کو کرسمس کا ایک خاص تحفہ دینے والے
ہیں اور دوسرے دن جاپانی بمبار اور لڑاکا طیارے رنگون کے آسمان پر نمودار ہوئے اور
انہوں نے ریڈیو سٹیشن، بندرگاہیں، فوجی تنصیبات کے علاوہ شہر پر بھی اندھا دھند بمباری اور
فائرنگ شروع کر دی تھی۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ بمباری سے رنگون شہر کی بیشتر
عمارتیں زمین بوس ہو گئیں اور جگہ جگہ آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ بندرگاہ پر ایک تیل بردار
جہاز کھڑا تھا۔ جاپانی طیاروں نے اسے نشانہ بنایا۔ جہاز میں آگ لگ گئی اور سارے شہر پر
کالی گھٹا کی طرح دھواں چھا گیا۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں دوسری یا شاید تیسری بمباری کے بعد شہر سے
ہندوستانی آبادی کا انخلا شروع ہو گیا تھا۔ برما رنگون میں مسلمانوں کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔
ان میں گجرات کاٹھیاوار کے سورتی میمن بھی تھے اور پنجاب کے تاجر پیشہ اور ٹھیکیدار بھی
تھے۔ برمی خود تو کاہل لوگ تھے اور زیادہ محنت سے جی چراتے تھے۔ بڑے آرام طلب
تھے لیکن باہر سے آئے ہوئے جن لوگوں نے خاص طور پر پنجابیوں نے اپنی شبانہ روز محنت
سے رنگون میں اپنے کاروبار کو وسیع کیا تھا اور وہاں جائیدادیں بنائی تھی۔ برمی لوگ ان کے
دشمن بن گئے تھے کہ ان لوگوں نے باہر سے آ کر ہمارے کاروبار پر قبضہ کر لیا ہے۔ جبکہ
حقیقت یہ تھی کہ برمی خود ست الوجود تھے اور ان کے مقابلے میں پنجاب کے مسلمان
جفاکش اور محنتی تھے۔

رنگون سے ان لوگوں کے انخلا کی ایک وجہ تو برمی لوگوں کی ان کے ساتھ دشمنی تھی
اور برمیوں نے سورتی میمن اور پنجابی مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا
تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ رنگون میں انگریزوں کا دفاع اور فوجی طاقت جاپانی یلغار کے
مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ جاپانی لڑاکا طیاروں اور بمبار طیاروں کا مقابلہ کرنے
کے لئے رنگون کے ہوائی اڈے سے انگریزوں کی رائل ایئر فورس کا ایک بھی جہاز نہیں چڑھا

تھا۔ چنانچہ غیر برمی شہری آبادی اپنی دکانیں، گھر اور جائیدادیں چھوڑ کر جنگل کی طرف پیدل چل پڑے تھے۔

یہ سن 47ء سے پہلے کی مسلمانوں کی بہت بڑی ہجرت تھی۔ یہ لوگ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اپنے بال بچوں سمیت لٹ پٹ کر کسمپرسی کی حالت میں رنگون سے نکلے تھے۔ ان کے اپنے آپ ہی چھوٹے بڑے قافلے بن گئے تھے۔ ان کی منزل کاکس بازار اور چٹاگانگ تھی جہاں انگریزوں کی حکومت تھی۔ انگریزوں کی برٹش انڈیا فوج خود بھاگ گئی تھی۔ ان بے یارومددگار لوگوں کو کون پوچھتا۔

لکھ پتی ایک ہی دن میں مفلس ہو گئے تھے۔ لاکھوں کے مال سے بھری ہوئی ان کی دکانوں اور گوداموں پر برمیوں نے یا قبضہ کر لیا تھا یا لوٹ کر لے گئے تھے۔ انہیں بنکوں سے اپنی رقوم نکلوانے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا۔ جو گھر میں یا پاس (پلے) تھا اسی کو لے کر نکل پڑے تھے۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ تھے۔ بھائی جان تھے، ہمشیرہ تھیں۔ باری علیگ تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی تھی۔ باری صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بیگم صاحبہ کی گود میں ڈیڑھ سال کی بچی تھی جس کا نام سعیدہ تھا۔ شاہ جی تھے۔ اخبار کے سٹاف کے کچھ لوگ تھے۔ اللہ توکل یہ قافلے چل پڑے تھے۔ کوئی راہنما نہیں تھا۔ صرف اتنا پتا تھا کہ اس طرف جنگل شروع ہوتا ہے اور اسی جانب بنگال اور کاکسز بازار ہے۔ اپنے آپ قافلے کا ایک راستہ بن گیا تھا۔ ہمارے آگے بھی کئی قافلے پیدل چل رہے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ سب سے آگے جو قافلے تھے انہیں جنگل میں جنگلی پھلوں کے جو درخت اور پانی کے چشمے مل جاتے وہ ان پھلوں اور چشمے کے پانیوں سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی بھوک اور پیاس مٹاتے رہتے۔ جب پچھلے قافلے وہاں پہنچے تو درختوں پر ایک بھی پھل نہیں تھا اور چشمے سوکھ گئے تھے یا پانی ان کی تہہ میں بیٹھ گیا تھا۔ لوگ بھوک اور پیاس سے مرنے لگے۔

بچوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ ہم لوگ گرتے پڑتے برما کے گنجان اور خطرناک جنگلوں میں پندرہ دن تک پیدل سفر کرنے کے بعد جنگل میں ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بھائی جان کے ایک دوست کا جنگلی درختوں کا ایک ذخیرہ تھا۔ ان کا نام عبدالعزیز مجھے یاد رہ

گیا ہے۔ یہاں ان کی جنگلی لکڑی کی چیرائی کی بہت سی آرا مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ عبدالعزیز صاحب بڑے امیر کبیر آدمی تھے اور پنجاب کے ہی رہنے والے تھے۔ جنگل میں انہوں نے اپنی رہائش کے لئے ایک ڈاک بنگلہ بنا رکھا تھا۔

عبدالعزیز صاحب نے ہماری بہت آؤ بھگت کی۔ بھائی جان چونکہ حکومت برما کے ملازم بھی تھے اور ایک اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے اور ریڈیو رنگون سے جاپانیوں کے خلاف پراپیگنڈا بھی کرتے رہے تھے اس لئے انہوں نے اپنا حلیہ بدلا ہوا تھا اور سر پر پگڑی باندھی ہوئی تھی تاکہ جاپانی انہیں پہچان نہ سکیں۔ اور دیہاتی مزدور ٹائپ آدمی سمجھ کر چھوڑ دیں۔ کیونکہ سارے برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور کوئی پتہ نہیں تھا کہ جنگل میں کہاں کہاں جاپانی فوج تعینات ہے۔ جنگلاتی لکڑی کے ٹھیکیدار عبدالعزیز صاحب کے پاس ہم لوگ دس بارہ روز رہے۔ یہاں باری علیگ صاحب ہم سے جدا ہو گئے۔ جب بھائی جان اور عبدالعزیز صاحب نے بتایا کہ آگے ایک دن اور ایک رات کا سمندر کا سفر ہے جو ایک کشتی کے ذریعے کرنا پڑے گا۔ باری علیگ صاحب چھوٹی کشتی میں ایک رات اور ایک دن کا سفر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی بیگم صاحبہ اور بچی کو لے کر ایک دوسرے قافلے میں شامل ہو گئے جو جنگل جنگل خشکی کا ایک بہت لمبا راستہ طے کر کے کاکسز بازار جا پہنچا تھا۔

کہنے کو تو ہم لوگ بھی بنگال میں کاکسز بازار کی طرف جا رہے تھے لیکن یہ سفر خطرناک، گنجان اور ہاتھیوں، شیروں اور سانپوں اور مہلک حشرات الارض سے بھرے ہوئے جنگلوں کا سفر تھا۔ اور ہم لوگ پیدل جا رہے تھے۔ جنگلی لکڑی کے ٹھیکیدار عبدالعزیز صاحب کا ارادہ ہجرت کا نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں یہیں رہوں گا۔ جاپانی آ گئے تو میں انہیں لکڑی سپلائی کروں گا۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔

انہوں نے ہمیں بھی اپنے ڈاک بنگلے والے مکان میں رک جانے کو کہا لیکن بھائی جان یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ جاپانی انہیں انگریزوں کا سرکاری افسر ہونے اور رنگون ریڈیو پر اپنے خلاف پراپیگنڈا کرنے کے جرم میں پکڑ کر شوٹ بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ عبدالعزیز صاحب کے ڈاک بنگلے سے آگے روانہ ہو گئے۔ ایک دن جنگل

میں پیدل سفر کرنے کے بعد سمندر آ گیا۔ یہ خلیج بنگال کے کالے پانی کا سمندر تھا۔ رار ہم نے وہیں آرام کیا۔ صبح ایک ذرا بڑی مگر خطرناک کشتی میں سوار ہو کر سمندر میں روانہ گئے۔

چاروں طرف سیاہ کالا سمندر، سمندر کی بڑی بڑی موجیں جو اوپر نیچے ہو ر تھیں۔ سمندر پرسکون تھا مگر اس کی وسعت اور اوپر نیچے ہوتی موجوں کو دیکھ کر خوف طار ہوتا تھا۔ کشتی بھی سمندری موجوں کے ساتھ ہچکولے کھا رہی تھی۔ سارا دن اور ساری رار سمندر میں ہمارا سفر جاری رہا۔ دوسرے دن سورج طلوع ہونے کے تھوڑی دیر بعد کنارا آیا تو جان میں جان آ گئی۔ یہاں سے اکیاب تک چار دن کا پیدل سفر تھا۔

جنگل کے ٹھیکیدار عبدالعزیز صاحب نے بہت سا خشک راشن ہمارے ساتھ کر تھا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ جنگل میں ایسے گاؤں بھی آئے جہاں برمی لوگوں قافلے والوں کو کیلے اور بھنے ہوئے چنے کھانے کو دیئے۔ قافلوں کا خود بخود ایک روٹ گیا تھا۔ اس روٹ پر ایسا بھی ہوا کہ درختوں میں سے اچانک ڈاکوؤں نے نکل کر قافلے حملہ کر دیا اور لوگوں کے پاس جو تھوڑی بہت نقدی رہ گئی تھی وہ لوٹ کر لے گئے۔

بعض جگہوں پر یہ بھی سنا کہ ڈاکو ایک دو عورتیں بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ ا بھی ہوتا تھا کہ قافلہ ایک گاؤں میں سے گزرا تو جنگلی لوگ اور ان کی عورتیں ہاتھوں کیلے کے گچھے اور بھنے ہوئے چنوں کے تھیلے پکڑے کھڑے ہیں۔ ستم رسیدہ قافلے والو کو پانی پلا رہے ہیں۔ اس طرح ہمیں بھی جنگل میں ایک جگہ ایک نیک دل جنگلی مل گیا۔ ہمیں اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ ہمیں کھانے کو ابلے ہوئے نمکین چاول دیئے اور چائے کر لے آیا۔ چائے میں دودھ ملا ہوا تھا۔ بھائی جان بڑے حیران ہوئے کہ وہاں کوئی بکر اور گائے بھینس بھی نظر نہیں آ رہی تھی پھر یہ شخص چائے کے لئے دودھ کہاں سے لایا ہے

تم نے چائے میں دودھ ڈالا ہے۔ یہ تم کہاں سے لائے ہو؟ کیونکہ یہ ناریل دودھ بھی نہیں تھا۔ جنگلی آدمی کے پاس اس کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مسکرا ہوئے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا کہ یہ میری بیوی کا دودھ تھا۔ افسوس کہ اس وقت

ہم چائے پی چکے تھے۔

برما کے گنجان جنگل سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ پہاڑی جنگل بھی تھے اور میل ہا میل تک میدانی جنگل بھی تھے۔ ان جنگلوں میں دریا بہتے تھے۔ ندیاں اور جھیلیں تھیں۔ جان لیوا دلدلی میدان بھی تھے۔ دشوار گزار جنگلی اور پہاڑی راستے تھے۔ ایسے تالاب بھی تھے جن کی سطح کنول کے خوبصورت پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ لیکن ان تالابوں میں آدمی کے جسم سے چمٹ کر خون پی جانے والی لاکھوں جونکیں بھی تھیں۔ ان تالابوں میں اگر کوئی انسان یا جانور گر پڑتا تھا تو لاکھوں جونکیں اس کے جسم سے چمٹ کر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سارا خون پی جاتی تھیں۔ بارشیں اتنی ہوتی تھیں کہ راستے جل تھل ہو جاتے تھے۔ رات کے وقت جھینگروں کے ساتھ سانپوں کی پھنکاریں بھی سنائی دیتی تھیں۔

ایسے دریا اور کشادہ ندی نالے تھے کہ جن کے اوپر کوئی پل نہیں تھا۔ درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کر کے بنائی گئی کشتیوں میں بڑے بڑے دریا اور ندی نالے عبور کرنے پڑتے تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں سے سبز رنگ کے باریک سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ یہ اتنے گھنے ڈراؤنے اور دشوار گزار جنگل تھے کہ ان کو دیکھ کر ہی بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہم کبھی ان جنگلوں کو پار کر کے بنگال پہنچ سکیں گے۔

جنگلوں کے بارے میں میرا تصور بڑا خوبصورت تھا۔ میں اس سے پہلے یہی جانتا تھا کہ جنگل ایک ایسی جگہ ہے جہاں کنول کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی جھیلیں ہوتی ہیں۔ جنگلی پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہوتے ہیں۔ شفاف میٹھے پانیوں کے چشمے بہتے ہیں۔ گنگناتے جھومتے جھرنے ہوتے ہیں۔ درختوں پر چڑھی ہوئی پھولوں بھری بیلیں ہوتی ہیں۔

برما کے جنگلوں نے میرے اس تصور کو خاک میں ملا دیا تھا۔ یہ ایسے خوفناک اور قاتل جنگل تھے کہ جہاں میلوں تک پینے کا پانی نہیں ملتا تھا اور آدمی پیاسا مر جاتا تھا۔ کہیں کہیں جنگلی سبز کیلے کے درختوں کے جھنڈ آ جاتے تھے۔ اس کے بعد آدمی صرف درختوں

کے پتے اور جھاڑیوں کی جڑیں کھا کر ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ جہاں برساتی چھپڑ ہوتے تھے وہاں کنکھجورے، بچھو اور سانپ بھی کثرت سے ہوتے تھے۔

ان برساتی پانی کے تالابوں میں لاکھوں جونکیں انسان کا خون پینے کے انتظار میں بیٹھی ہوتی تھیں۔ رات کو مکھیوں جتنے بڑے مچھر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ یہ بھی سن رکھا تھا کہ ان جنگلوں میں آدم خور پودے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ کانٹے دار پودے ہوتے ہیں۔ آدمی قریب سے گزرے تو یہ کانٹے دار خونی ٹہنیاں اسے دبوچ لیتی ہیں اور اپنے ہزاروں کانٹے اس کے جسم میں چبھو کر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا خون پی کر اور گوشت کھا کر اسے ہڈیوں کا پنجر بنا دیتی ہیں۔

اس کے بعد میرا سری لنکا اور وسطی ہند کے گھنے جنگلوں میں گزرنے کا اتفاق بھی ہوا لیکن ان علاقوں کے جنگل برما کے جنگلوں کے مقابلے میں اتنے خونخوار نہیں تھے۔ برما کے جنگلوں میں پیدل سفر کرتے ہوئے کبھی کبھی ہاتھیوں کے غول ضرور جنگل سے نکل کر دوسری طرف نکل جاتا تھا۔ ایک بار اس راستے میں دو دیو ہیکل قسم کے ہاتھی آ کر بیٹھ گئے۔ جس پر سے مہاجرین کا قافلہ گزر رہا تھا۔ قافلے والے ان ہاتھیوں سے بچ کر جنگل کے پہلو سے ہو کر گزرنے لگے۔

رات کو کبھی کبھی شیر کے دھاڑنے کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ لیکن چونکہ جنگل میں سے انسانوں کے ہجوم در ہجوم گزر رہے تھے اس لئے جنگلی جانور اس طرف نہیں آتے تھے۔ سینکڑوں لوگ بھوک پیاس اور سانپوں کے ڈسنے سے مر گئے۔ پیدل سفر کرتے ہوئے انسانوں کی بے گور و کفن لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

یہ وہ لوگ تھے جن کا کوئی والی وارث نہیں تھا اور اکیلے ہی قافلے کے ساتھ چل پڑے تھے۔ کسی خاندان کا کوئی آدمی بیماری سے مر جاتا تو اسے وہیں زمین کھود کر دفن کر دیا جاتا تھا۔

کئی دفعہ اوپر سے جاپانی طیارے گزرے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے قافلے والوں پر نہ تو بمباری کی نہ فائرنگ کی۔ شاید اس لئے کہ جاپانیوں کو معلوم تھا کہ یہ لوگ زندہ

حالت میں بنگال نہیں پہنچ سکیں گے۔ لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر رہے تھے۔ انسان انسان سے بیزار ہو گیا تھا۔ اپنی اپنی جان بچانے کے لئے انسان خود غرض بن گیا تھا۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کے ایسے ایسے عبرتناک منظر دیکھنے میں آئے کہ یقین نہیں آتا تھا کہ انسان اس حد تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انسانی ہمدردی کے ایسے مظاہرے بھی دیکھے کہ ایک انسان نے اپنی بوتل میں بچا ہوا پانی ایک پیاسے بچے کو پلایا اور خود خالی بوتل پھینک کر آگے چل پڑا۔

ہم بھی گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح اکیاب پہنچ گئے۔ اکیاب بڑا مختصر مگر صاف ستھرا شہر تھا۔ یہاں کے بعض مخیر اور انسان دوست لوگوں نے مہاجرین کے لئے کھانے پینے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اکیاب میں بھائی جان کے ایک دوست رہتے تھے۔ ان کی شہر میں چمڑے کے جوتوں کی بہت بڑی دکان تھی۔ یہ صاحب پنجاب کے رہنے والے تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ انہوں نے میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ ہم ان کے مکان پر چھ سات روز رہے۔ ہماری بگڑی ہوئی صحت کسی حد تک بحال ہو گئی۔ ہم نے نئے کپڑے اور نئے جوتے خرید کر پہنے۔ اکیاب سے آگے ایک بہت بڑا دریا تھا۔

یہ دریا بالکل سمندر کی طرح تھا۔ اس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ دریا ہم۔
ایک پرانے سٹیمر میں عبور کیا اور بوتھی ڈانگ پہنچے۔ بوتھی ڈانگ برما کے مغربی ساحل پر ایک
چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جو چاول اور ساگوان کی لکڑی کی بہت بڑی منڈی تھی۔ اچانک مجھے یا
گیا کہ رنگون پر پہلی بمباری کے بعد میں رنگون کے سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پھو
بیچنے والی لڑکی ساتیں کو دیکھنے اور اس کی خیر خیریت معلوم کرنے پیگوڈا گیا تھا تو وہ مج
وہاں نہیں ملی تھی۔ مگر ایک بوڑھی برمی عورت نے جو شکستہ اردو بول رہی تھی۔ مجھے بتایا تھا
ساتیں موسی کے گاؤں چلی گئی ہے جو بوتھی ڈانگ سے تین کوس مشرق میں واقع ہے۔ ا
خیال نے جیسے میرے قدم پکڑ لئے۔ اب میرے سر پر محبت کا بھوت پھر سوار ہو گیا۔ م
نے فیصلہ کرلیا کہ یہاں سے میں آگے چٹاگانگ نہیں جاؤں گا۔

بوتھی ڈانگ سے ہر ہفتے ایک سٹیمر لکڑیاں اور چاول لے کر چٹاگانگ جاتا تھ
بھائی جان وہاں بندرگاہ پر ہی ٹھہر گئے تھے اور سٹیمر کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ سٹیمر تین یا چ
دن میں چٹاگانگ پہنچتا تھا۔ اگرچہ بندرگاہ کے آدمیوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جاپانی او
آسام تک پہنچ گئے ہیں اور کوئی پتہ نہیں چٹاگانگ سے سٹیمر چاول وغیرہ لینے آئے یا نہ آ
اور اگر آئے تو واپس جانے کے بجائے یہیں رہ جائے کیونکہ جاپانی آبدوزیں اور ان
تباہ کن چھوٹے جہاز خلیج بنگال میں دیکھے گئے تھے۔ اس کے باوجود بھائی جان ہم کو لے
وہاں بیٹھ گئے تھے کہ اگر سٹیمر آ گیا تو اس کے کپتان کو پیسوں کا لالچ دے کر واپس جانے
آمادہ کرلیں گے۔

میں نے ساتیں کا خیال آتے ہی فیصلہ دل میں کرلیا تھا کہ میں یہاں ان لوگوں
سے الگ ہو جاؤں گا اور سب سے پہلے اپنی محبوبہ ساتیں سے ملنے ان کے گاؤں جاؤں گا
اور اس سے مل کر اگر واپس جانے کو دل چاہا تو بوتھی ڈانگ آ کر کوئی دوسرا سٹیمر پکڑ کر
چٹاگانگ چلا جاؤں گا۔ یہ تو مجھے معلوم ہو ہی گیا تھا کہ بوتھی ڈانگ سے ہر ہفتے ایک سٹیمر
چٹاگانگ جاتا ہے۔ قسمت میں محبت کے ہاتھوں جو سختیاں اور مصیبتیں اٹھانی لکھی تھیں
انہیں کون ٹال سکتا تھا۔ اب میں سوچنے لگا کہ ان لوگوں سے کس طرح الگ ہونا چاہئے۔
ظاہر تھا کہ اگر میں انہیں کہتا ہوں کہ میں ساتیں سے ملنے جاؤں گا اور ان کے ساتھ
چٹاگانگ نہیں جانا چاہتا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ بھائی جان مجھے اس کی اجازت
دیتے۔ بس ایک ہی طریقہ تھا کہ میں چپکے سے وہاں سے کھسک جاؤں۔

بھرا میلہ چھوڑ کر کھسک جانے کی مجھے شروع ہی سے عادت تھی اور محبت کے
مقابلے میں تو میں نے ہمیشہ جذبات کا ساتھ دیا تھا۔ عقل سے کبھی کام نہیں لیا تھا۔ بلکہ میرا
تو یہ عقیدہ تھا کہ محبت ہوتی ہی اس وقت ہے جب عقل آدمی کا ساتھ چھوڑ چکی ہوتی ہے۔
میں نے سوچا کہ ابھی سٹیمر کے پہنچنے میں تین چار دن باقی ہیں۔ اگر اس وقت میں بھاگ گیا
تو یہ لوگ کسی نہ کسی طرح میرے پیچھے نکل پڑیں گے اور مجھے تلاش کریں گے۔ چنانچہ میں
نے فیصلہ کیا کہ جس روز سٹیمر آنے والا ہوگا اس روز چپکے سے جنگل کی طرف کھسک جاؤں
گا۔

میں برما کے جنگلوں سے خوب واقف ہو چکا تھا اور جس طرف برمی عورت نے
ساتیں کا گاؤں بتایا تھا اسی طرف سے رنگون کے مہاجرین کے قافلے آ رہے تھے۔ اس کا
مطلب تھا کہ یہ علاقہ انسانوں سے خالی نہیں ہوگا اور یہاں جنگلی جانوروں کا بھی ڈر نہیں ہو
گا۔

چوتھے روز شام کے وقت چٹاگانگ جانے والا سٹیمر آ گیا۔ اسے دوسرے دن صبح
کے وقت واپس چٹاگانگ جانا تھا۔ ساری رات سٹیمر پر چاول کی بوریاں اور لکڑیوں کے
بڑے بڑے شہتیر لادے جاتے رہے۔ کافی بڑا سٹیمر تھا۔ مجھے تو وہ جہاز لگ رہا تھا۔ بھائی

جان اسی وقت ٹکٹ خریدنا چاہتے تھے لیکن سٹیمر کے بنگالی کیپٹن نے کہا۔

''ابھی کچھ معلوم نہیں سٹیمر صرف سامان لے جائے گا یا مسافروں کو بھی لے جائے گا؟''

دوسرے دن سٹیمر کے کپتان نے بھائی جان سے مل کر کہا کہ وہ کچھ مسافر واپس لے جا رہے ہیں۔ آپ کی فیملی کو بھی لے جائیں گے۔ ٹکٹ آپ کو سٹیمر پر بیٹھنے کے بعد ایشو کیے جائیں گے۔ اگلے دن میں نے بڑی ہمشیرہ سے کچھ پیسے لے کر اپنے پاس رکھ لئے کہ ساتیں سے مل کر اور اس کی خیریت معلوم کر کے جب واپس بوتھی ڈانگ آؤں گا تو دوسرے شہر کے ٹکٹ کے پیسے میرے پاس ہونے چاہئیں۔ میں کچھ اور پروگرام بنا رہا تھا اور میری تقدیر کچھ اور ہی پروگرام بنا چکی تھی۔

بھائی جان وغیرہ سٹیمر پر سوار ہونے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے کہ میں موقع پا کر وہاں سے کھسک آیا۔ بوتھی ڈانگ میں ہم تین چار دن رہے تھے۔ اس دوران میں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ مشرق کی جانب ایک گاؤں ضرور ہے مگر اس کا فاصلہ وہاں سے تین میل سے زیادہ ہے اور راستے میں ایک دریا پڑتا ہے جس پر کوئی پل وغیرہ نہیں ہے۔ مگر محبت پل کے ذریعے دریا پار نہیں کیا کرتی۔ محبت تو کچے گھڑے کو لے کر دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ میں جب تک بوتھی ڈانگ کے بازار میں رہا وہاں آہستہ آہستہ چلتا رہا لیکن جیسے ہی بازار ایک ویران راستے کو مڑا میں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ جب میں نے دیکھا کہ میں دھان کے کھیتوں میں آ گیا ہوں اور اردگرد کوئی انسان نہیں ہے تو میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میں اتنی دور نکل جانا چاہتا تھا کہ اگر بھائی جان یا کوئی اور شخص مجھے تلاش کرتا اس طرف نکل آئے تو میں انہیں دکھائی نہ دوں۔ دھان کے کھیت ختم ہوئے تو بانس کے درختوں کے جھنڈ شروع ہو گئے۔ اب میں دوڑنے کی بجائے جتنی تیز چل سکتا تھا چل رہا تھا۔ چلنے سے پہلے میں نے اپنی ٹھنڈی پتلون کی دونوں جیبیں بھنے ہوئے چنوں سے بھری تھیں تا کہ راستے میں اگر کھانے کو کچھ نہ ملے تو تھوڑے تھوڑے چنے کھا کر ہی گزارہ ہو جائے۔ پانی کی مجھے فکر نہیں تھی کیونکہ اس علاقے میں ناریل کے درختوں کی

بہتات تھی۔ اور میں ناریل کا پانی پی کر زندہ رہ سکتا تھا۔ چلتے چلتے میں بانس کے درختوں سے کافی آگے نکل آیا۔ یہاں دیار اور ساگوان کے درختوں کا جنگل سا شروع ہو گیا۔

ساگوان کے درختوں کا یہ جنگل کوئی اتنا گھنا اور دشوار گزار نہیں تھا کہ جتنے خوفناک اور گنجان جنگلوں میں سے ہم گزر کر آئے تھے۔ زمین اونچی نیچی تھی اور درختوں کے جھنڈوں کے درمیان فاصلہ تھا۔ جہاں جنگلی جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا۔ جب وقت کافی گزر گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ بھائی جان مجھے تلاش کرتے مایوس ہو چکے ہوں گے اور سٹیمر میں سوار ہو کر چٹاگانگ روانہ ہو گئے ہوں گے یا اگلے سٹیمر تک میرے انتظار میں وہیں بیٹھ گئے ہوں گے تو میں ایک جگہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

پانی اس جنگل میں بھی دور دور تک نظر نہیں آیا تھا۔ راستے میں بھی کوئی چشمہ یا ندی نالہ نہیں ملا تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ ایک طرف مجھے ناریل کے دو تین درختوں کی چھتریاں اوپر کو اٹھی ہوئی دکھائی دیں۔ میں ان درختوں کے پاس چلا گیا۔ درختوں کے نیچے تین چار ناریل گرے پڑے تھے۔ ان میں ایک ناریل تازہ گرا ہوا لگتا تھا۔ میں نے اسے پتھر پر مار کر توڑا اور اس کا میٹھا پانی پی گیا۔

ناریل ابھی ہرا تھا۔ اس کے اندر ابھی گری نہیں بنی تھی۔ میں نے کچھ چنے کھائے اور تھوڑی دیر آرام کر کے آگے روانہ ہو گیا۔ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ میرا رخ مشرق کی طرف ہی ہے۔ بوڑھی برمی عورت نے کہا تھا کہ راستے میں دریا بھی آتا ہے اور دریا پار پہلا گاؤں ساتیں کی ماسی کا گاؤں ہے اور ساتیں وہیں گئی ہوئی ہے۔ کیا منہ زور جذبہ محبت تھا؟ کیسی حماقت میں نے کی تھی؟ اب اس حماقت کا خیال آتا ہے تو دل میں بڑی حسرت پیدا ہوتی ہے کہ کاش مجھے محبت کا وہی احمقانہ جذبہ پھر عطا ہو جائے اور میں بار بار ایسی حماقت کر سکوں۔ کبھی محبت کے منہ زور جذبات نے میری عقل کو ہنٹر مار مار کر بھگا دیا تھا۔ اس کے باوجود میں سب کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ کبھی عقل بھاگ جاتی اور محبت کے جذبوں کے ساتھ میں جو وقت گزارتا ہوں وہ میری روح کی جنت کے حسین ترین لمحے ہوتے ہیں۔

جیسے جیسے دن ڈھل رہا تھا اور شام آ رہی تھی مجھے یہی خیال پریشان کر رہا
ساتیں کا گاؤں تو دریا پار ہے اور ابھی دریا کا دور دور تک نام ونشان نہیں ہے۔ رات
اور کیسے گزاروں گا؟ جب ہم لوگ قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے تو جنگل میں را
آگ جلا لیتے تھے۔ ویسے بھی بہت لوگ ہوتے تھے۔ رات الاؤ کے پاس کبھی سو
جاگ کر گزر جاتی تھی۔ میرے پاس ماچس بھی نہیں تھی کہ رات کو کسی جگہ آگ کا الاؤ
کروں۔

آگ کی وجہ سے جنگلی جانور اور سانپ وغیرہ قریب نہیں آتے تھے۔ درخ
چڑھ کر سونا خطرناک تھا۔ تجربے نے ہمیں بتایا تھا کہ درختوں پر آدم خور سرخ چیونٹیو
سانپوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ چلتے چلتے ایک جگہ مجھے رل تر
ترل کی ایسی آواز آئی جیسے کسی جگہ پانی گر رہا ہو۔ میں اس آواز کی طرف بڑھتا چ
کچھ فاصلے پر مجھے خاکستری رنگ کی چٹان نظر آئی جس کے پیچھے سے پانی کے گر
آواز آ رہی تھی۔ چٹان کے عقب میں جا کر دیکھا کہ ایک پہاڑی ڈھلان کے پتھرو
سے پانی کی چھوٹی سی دھار نیچے پانی کے چھوٹے سے تالاب میں گر رہی تھی۔

پانی دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی تھا۔ میں نے نیچے تالا
کنارے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ وہاں ایک طرف مجھے کپڑوں کی پرانی دھجیاں سی
آئیں۔ قریب گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں کسی نے پرانے کپڑے پھینکے ہیں۔ یہ ایک
اور ایک جانگیہ تھا۔ پیچھے ٹین کا ایک خالی ٹرنک بھی پڑا تھا۔ ذرا آگے گیا تو ایک
دیکھی جس کے اردگرد جھاڑیاں دبی ہوئی تھیں اور جگہ جگہ پرانے کاغذ، گندے کپڑ
ٹکڑے اور ایک دو خالی سوٹ کیس پڑے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ یہاں سے مہاجروں کا کوئی قافلہ گزرا ہے۔ اس کا مطل
میں صحیح راستے پر جا رہا تھا۔ میں مہاجروں کی پھینکی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر د
ایک جگہ مجھے گھاس پر ماچس کی ڈبیا پڑی نظر آئی۔ میں نے اسے جلدی سے اٹھا
کر دیکھا تو اس میں صرف دو دیا سلائیاں رہ گئی تھیں۔ میں نے اسے غنیمت جان

میں رکھ لیا۔ یہ رات کو آگ کا الاؤ جلانے کے کام آ سکتی تھیں۔

ایک ٹوٹے ہوئے ٹرنک کے پاس رسی پڑی تھی۔ شاید اسی رسی سے ٹرنک کو
باندھ دیا گیا تھا۔ یہ گز سوا گز لمبی رسی تھی۔ میں نے رسی بھی اپنی کمر کے گرد لپیٹ لی۔ میرا
خیال تھا شاید کسی جگہ کوئی چھری یا چاقو گرا پڑا مل جائے مگر یہ نہ ملا۔ میں وہیں پگڈنڈی کے
ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے آگے جانا چاہئے یا اسی جگہ رات گزارنے کے
لئے کوئی ٹھکانہ بنانا چاہئے۔ کیونکہ سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ قافلے والوں کی گری
پڑی چیزیں دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ آدمی نہ سہی مگر ان کی نشانیاں تو یہاں موجود ہیں۔
میں نے اسی جگہ رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

سب سے پہلے میں نے چل پھر کر ناریل کا ایک درخت تلاش کر لیا جس کے
نیچے بہت سے ناریل گرے پڑے تھے۔ ان میں تین تازہ ناریل اٹھا کر لے آیا۔ ایک
ناریل توڑا اس کا پانی پیا۔ دیکھا کہ اس کی گری تیار تھی۔ تھوڑی سی گری اور تھوڑے سے
بھنے ہوئے چنے کھائے۔ سورج غروب ہو گیا اور جنگل میں اندھیرا چھانے لگا۔ میں اٹھ کر
چشمے پر آ گیا۔ وہاں دوبارہ تازہ پانی پیا اور واپس آ کر ایک درخت کے نیچے بہت سی سوکھی
لکڑیاں گھاس وغیرہ جمع کر کے اسے آگ لگا دی۔ الاؤ روشن ہو گیا۔

میں درخت کے دو ایک سوکھے تنے گھسیٹ کر لے آیا اور انہیں الاؤ میں ڈال
دیا۔ یہ تنے اتنے بڑے تھے کہ ساری رات جل سکتے تھے۔ وہاں دھواں ہو گیا۔ اوپر درخت
پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے۔ رات ہو گئی۔ الاؤ کی روشنی میں مجھے آس پاس
کے درخت صاف نظر آ رہے تھے۔ آگ کی وجہ سے کسی درندے کے اس طرف آنے کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ الاؤ کے دھوئیں نے مچھروں کو بھی بھگا دیا تھا۔ مگر مجھے نیند نہیں
آ رہی تھی۔ میں وہیں گھاس پر الاؤ سے ذرا دور ہو کر لیٹ گیا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ خیال
آتا کہ میرے اچانک گم ہو جانے سے بھائی جان اور ہمشیرہ کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔
وہ امرتسر گھر پہنچ کر والد صاحب اور آپو جی کو کیا بتائیں گی کہ بھائی کو کہاں چھوڑ آئی ہیں۔
یہ سب کچھ مجھے اس وقت سوچنا چاہئے تھا جب میں انہیں چھوڑ کر بھاگا تھا۔ اب سوچنے اور

پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔

کسی وقت خیال آتا کہ اگر کسی طرف سے شیر یا چیتا نکل آیا تو کیا کروں
کہاں جاؤں گا؟ آگ کے الاؤ میں تو چھلانگ نہیں لگا سکتا۔ میں نے اوپر درخت کا ج
لیا اس درخت پر دھوئیں کی وجہ سے سانپ اور چیونٹیاں یقیناً غائب ہو گئی ہوں گی۔
درخت پر چڑھ سکتا تھا۔ پیدل چل کر سخت تھک گیا تھا۔ نیند کی غنودگی طاری ہوتی تو ج
سے آنکھیں کھول دیتا کہ کوئی شیر چیتا نہ آ گیا ہو۔

صرف الاؤ میں لکڑیوں کے چٹخنے کی کسی وقت آواز آ جاتی تھی۔ اس کے
جنگل پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بندر بھی آ سکتے تھے۔ جنگلی بندر غول کی شکل میں سفر ک
ہیں۔ کسی انسان کو دیکھ لیں تو سارے کے سارے اس پر حملہ کر دیتے ہیں۔ قافلے
ساتھ پیدل چلتے وقت ایک جگہ بندر ایک بچے کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ اگر ایک آدمی کے
بندوق نہ ہوتی اور وہ اوپر تلے دو تین ہوائی فائر نہ کرتا تو بندر بچے کو نوچ نوچ کر ہڑ
چکا ہوتا۔ فائرنگ کے دھماکوں سے بندر نے ڈر کر بچہ وہیں پھینک دیا اور خود بھاگ گیا

ساری رات اسی طرح سوتے جاگتے گزر گئی۔ صبح اٹھ کر چشمے پر جا کر پ
کے پتھروں کی درز میں سے گرتا پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور بھنے ہوئے چنے کھا
مشرق کی جانب جدھر سے سورج طلوع ہوا تھا چل پڑا۔ اب مجھے دریا کا انتظار تھا۔
تک چلتا رہا۔ کبھی تھک کر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر چل پڑتا۔

دوپہر کے بعد جب سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا مجھے درختو
درمیان سے دریا دکھائی دیا۔ بے اختیار دوڑتا ہوا دریا کے کنارے آ گیا۔ کافی بڑا دریا
دوسرے کنارے کے درخت چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ وہاں کوئی پل نہیں تھا۔
کوئی کشتی بھی نہیں تھی۔ مجھے تیرنا آتا تھا مگر امرتسر کی نہروں میں تیرتا رہا تھا۔ دریا میں
نہیں تیرا تھا۔ دریا کا اتنا چوڑا پاٹ دیکھ کر ویسے ہی دل پر خوف سا طاری ہو رہا تھا۔

میں دریا کے کنارے کنارے ایک طرف چل پڑا۔ اس خیال سے کہ شاید
کوئی گھاٹ ہو جہاں سے دیہاتی لوگ دریا پار کرتے ہوں اور وہاں کوئی کشتی بھی ہو

افی دور تک چلا گیا مگر کسی گھاٹ اور کشتی کا نشان تک نہیں تھا۔ ایک جگہ دریا میں سے ایک
ی نکل کر جنگل میں چلی گئی تھی۔ میں ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا کہ شاید اس طرف ماہی
یروں کے جھونپڑے وغیرہ ہوں۔

ندی آگے جا کر پھر دریا کے ساتھ مل گئی تھی۔ اس مقام پر جہاں ندی دریا کے
اتھ ملتی تھی درختوں کے بڑے بڑے جھنڈ تھے اور زمین اونچی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید
ہاں زمین اونچی ہے اس کی دوسری طرف کوئی آبادی ہو اور وہاں گھاٹ بھی ہو۔ میں
ڑھائی چڑھ کر اوپر درختوں کے پاس آیا اور دوسری طرف دیکھا تو مجھے ڈھلوان چھت والی
یک بارک دکھائی دی۔

بارک کے باہر کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہلے تو میں وہیں بیٹھ کر غور سے بارک
جائزہ لینے لگا۔ کسی طرف سے کسی انسان کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی بڑی خاموشی تھی۔
اید بارک خالی پڑی تھی۔ کسی انسان کی موجودگی کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

دل میں خیال آیا کہ نیچے اتر کر دیکھنا چاہئے۔ بارک کے اندر کیا ہے؟ ممکن ہے
کی دوسری طرف کوئی آبادی ہو اور دریا پار کرنے کا کوئی سبب بن جائے۔ میں نشیب
اتر گیا۔ بارک کا برآمدہ خالی پڑا تھا۔ بارک کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے تھے۔ مجھے
انک خطرے کا احساس ہوا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ انسان پر جب کوئی بڑی مصیبت آنے
لی ہوتی ہے تو اس کی چھٹی حس اسے ہلکا سا اشارہ کر دیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آدمی
احساسات پر چربی زیادہ چڑھی ہوئی ہو اور اسے قدرت کے اشارے کا احساس نہ ہو۔

میرے احساسات پر ابھی چربی نہیں چڑھی تھی۔ میں لڑکا سا تھا اور میرے
ساسات بڑے نازک اور اتنے تیز تھے کہ دریا دور بھی ہو تو میں اس کے پانی کی مرطوب
بو محسوس کر لیتا تھا۔ میں نے آج بھی اپنے احساسات کو چربی چڑھنے سے بچایا ہوا
۔ اس کے لئے مجھے صرف ایک ہی پرہیز کرنا پڑتا ہے کہ میں دن میں صرف ایک بار ہلکی
غذا کھاتا ہوں۔ گوشت نہیں کھاتا اور اتنی غذا بھی جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے
اتا ہوں۔ مجھے کھانا پسند نہیں اگر میرا بس چلے تو میں سوائے چائے اور پانی کے اور کچھ نہ

پیوں۔ مگر مجبور ہوں جب تک زندہ ہوں کھانا کھانا ہی پڑے گا۔

چنانچہ مجھے اشارہ مل گیا تھا کہ تم کسی مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔ یہاں
بھاگ جاؤ لیکن سرکشی شاید انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ میں نے خطرے کے سگنل
زیادہ پروانہ کی اور یہ دیکھنے کے لئے کہ بارک کے اندر یا اس کی دوسری طرف کیا ہے
بارک کے اندر چلا گیا۔ بارک کے اندر میں یہ دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا کہ د
لکڑی کے شیلف دیوار کے ساتھ لگے تھے۔ ان شیلفوں کے خانے ٹن فوڈ، سگریٹ، چا
چینی اور بیئر کی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ لمبی سی میز پر بھی میٹھے دودھ، ماجرین، ک
اور فروٹ کے ہوا بند ڈبے پڑے تھے۔ ایک دم خیال آیا کہ یہاں جاپان کی کوئی پلا
تعینات ہے اور یہ اس کی نافی یعنی کھانے پینے کی چیزوں کا سٹور ہے۔ پھر خیال آیا ک
سکتا ہے یہ برٹش انڈیا کی ہندوستان کی فوج کا کوئی سٹور ہو۔ جاپانیوں کے قبضے کے
ہندوستانی فوج یہاں سے بھاگ گئی ہو اور سٹور خالی پڑا رہ گیا ہو۔ میں نے آگے بڑ
میز پر سے ٹن فروٹ کا ایک ڈبہ اٹھا کر دیکھا۔ یہ دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا کہ ا
انگریزی کے بجائے جاپانی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

◆......◆......◆

میں نے باقی چیزوں پر نگاہ ڈالی۔ سب پر جاپانی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ اس کا
طلب تھا کہ میں غلطی سے جاپانی فوج کے کیمپ میں آ گیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا
کہ وہاں اس وقت کوئی جاپانی فوجی نہیں تھا ورنہ میں مارا گیا تھا۔ میں نے صرف دودھ کا
یک ڈبہ اٹھایا اور بارک سے نکل کر دوڑ پڑا۔ جیسے ہی میں چڑھائی چڑھ کر درختوں میں آیا
امنے سے تین جاپانی فوجی چلے آ رہے تھے۔ سٹین گنیں ان کے کندھوں پر لٹک رہی تھیں۔
نہوں نے مجھے دیکھا تو فوراً سٹین گنیں میری طرف کر لیں اور میری جانب دوڑے۔ میں
وڑ نہیں سکتا تھا۔ دوڑنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ میرا اور جاپانی فوجیوں کا دس بارہ قدموں
کا فاصلہ تھا۔ اگر میں دوڑ بھی پڑتا تو انہوں نے پیچھے سے فائرنگ شروع کر دینی تھی۔ وہ
ور زور سے جاپانی زبان میں آپس میں کچھ بول رہے تھے۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور
ارک کی طرف گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ میری شکل برمی لوگوں کی طرح نہیں تھی۔ میں شکل
سورت سے صاف ہندوستانی لگتا تھا۔ اگرچہ میں کم عمر تھا یعنی اتنا بڑا نہیں تھا کہ انہیں مجھ
پر انڈین ہونے کا شبہ ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے بارک میں بند کر دیں گے۔ لیکن وہ مجھے
پکڑ کر بارک کی دوسری طرف لے گئے۔ اس طرف زمین نشیبی تھی۔ دریا کے کنارے
رختوں میں فوجی کیمپ لگا ہوا تھا اور جاپانی سپاہی ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ وہاں ان کا
یک فوجی افسر کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ جاپانی فوجیوں نے مجھے اس کے آگے زمین
پر بٹھا دیا اور اس کو جاپانی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا جاپانی افسر نوجوان سپاہی
تھا۔ وہ مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے شکستہ اردو زبان میں مجھ سے پوچھا۔

"تم کو کس نے ادھر کو بھیجا ہے۔"

مجھے اس جاپانی فوجی افسر کے صحیح جملے یاد نہیں۔ اردو وہ اسی قسم کی بولتا تھا۔ مطلب یہ کہ اسے شبہ تھا کہ جنگل میں کہیں برٹش آرمی کے انڈین سپاہی چھپے ہوئے ہیں اور انہوں نے مجھے یہاں جاسوسی کرنے اور یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا ہے کہ میں جاپانی کیمپ میں جا کر جاپانی فوج کی نفری اور فوجی ساز و سامان کے بارے میں سراغ رسانی کر سکوں۔

میں نے اردو زبان میں جواب دیا۔

"میرا ہندوستانی فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں رنگون سے بھاگا ہوا مہاجر ہوں۔ سویلین ہوں۔ قافلے سے بچھڑ کر ادھر آ نکلا ہوں۔"

لیکن سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ جاپانی فوجی میری بات پر یقین کرتے۔ انہوں نے وہیں مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ میں رونے لگا اور کیا کرتا۔ میں آٹھویں جماعت کا سٹوڈنٹ ہی تھا جب امرتسر سے بھائی جان کے ساتھ رنگون آ گیا تھا۔ رونے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ مگر جاپانیوں پر میرے رونے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھے تھپڑ مار رہے تھے۔ کمر پر مکے مار رہے تھے۔ میں زمین پر گر پڑا۔ ایک جاپانی سپاہی مجھے ٹھڈے مارنے لگا۔ جاپانی افسر نے اسے روک دیا۔ مجھے پانی پلایا گیا۔ میرا سارا بدن درد کرنے لگا تھا۔ میں نے پانی پی لیا۔ اس کے بعد جاپانی افسر نے بڑے پیار سے مجھ سے پوچھا۔

"اگر تم ہمیں بتا دو کہ یہاں ہندوستانی سپاہی کہاں چھپے ہوئے ہیں تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے بلکہ دریا پار کروا کر بنگال جانے والی سٹیمر میں بٹھا دیں گے۔"

اس وقت تک جاپانی فوجیں جزائر انڈیمان پر بھی قابض ہو چکی تھیں اور آسام بنگال کی طرف بڑھ رہی تھیں بلکہ کلکتے کے شام بازار پر جاپانی طیارے دو تین بم بھی گرا کر چلے گئے تھے۔ میں نے جاپانی فوجی افسر کے جملے سلیس اردو میں لکھے ہیں جبکہ یہ باتیں اس نے شکستہ ٹوٹی پھوٹی اردو زبان میں مجھ سے پوچھی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔

"میں کسی ہندوستانی سپاہی وغیرہ کو نہیں جانتا۔ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔

رنگون میں اپنے بھائی کے پاس آیا ہوا تھا۔ رنگون سے لوگ بھاگے تو میں بھی اپنے بھائی کے ساتھ بھاگ کر قافلے میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر ایک جگہ بدقسمتی سے قافلے سے بچھڑ گیا اور اس طرف نکل آیا۔"

جاپانی افسر نے سپاہیوں کو اپنی زبان میں کوئی آرڈر دیا۔ جاپانی سپاہیوں نے رسی سے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیئے اور مجھے کھینچتے ہوئے ایک خیمے کے اندر لے گئے جہاں لکڑی کے بہت سے بکسے یعنی کریٹ پڑے تھے۔ خیمے کے درمیان لوہے کا ایک کھمبا گڑھا ہوا تھا جس کے سہارے خیمہ کھڑا تھا۔ جاپانی سپاہیوں نے میرے ہاتھ کی رسی کھول دی اور ایک کریٹ میں سے لوہے کی زنجیر نکالی۔ زنجیر کا حلقہ میرے پاؤں میں باندھا۔ دوسرا حلقہ لوہے کے کھمبے میں ڈال کر اسے تالا لگا دیا اور باہر نکل گئے۔ میں جاپانی فوج کا قیدی بن چکا تھا۔

میری لڑکپن کی زندگی کا یہ عجیب و غریب اور بڑا بھیانک تجربہ تھا۔ میں کھمبے کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ کافی وقت گزرنے کے بعد مجھے کسی سٹیمر کے انجن اور اس کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر سٹیمر کے انجن کی آواز بند ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہی دو جاپانی فوجی خیمے میں آئے۔ انہوں نے میری زنجیر کھول دی اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر خیمے کے باہر لے آئے۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک سٹیمر کھڑا تھا جس پر جاپان کا فوجی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سٹیمر کے عرشے پر جاپانی فوجی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جاپانی سپاہی مجھے اس سٹیمر پر لے گئے اور ایک کیبن میں بند کر دیا گیا۔ کبھی مجھے خیال آتا کہ جاپانی سپاہی میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ میں نے رنگون میں بھائی جان کی زبانی سن رکھا تھا کہ جاپانی بڑے سنگدل ہوتے ہیں اور جنگی قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے ہیں اور تلوار سے ان کا سر دھڑ سے جدا کر دیتے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ جاپانی اپنے جنگی قیدیوں کا تلوار سے سر کاٹنا بہت پسند کرتے ہیں۔ جب یہ خیال آتا کہ جاپانی کہیں لے جا کر تلوار سے میرا سر بھی کاٹ ڈالیں گے تو میرا دل ڈوبنے لگتا اور جسم خوف سے ٹھنڈا پڑ جاتا۔ مجھے اس سے پہلے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

کبھی اس قسم کے حالات سے پالا ہی نہیں پڑا تھا۔ میں نے ابھی جنگی قیدیوں کے کیمپ سے فرار کی کوئی داستان بھی نہیں پڑھی تھی۔ ابھی تو جنگ ہو رہی تھی اور فرار کی داستانیں جنگ ختم ہونے کے کافی عرصے بعد رسالوں اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود بہ تقاضائے بشری میں نے جاپانیوں کی قید سے بھاگنے کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دی تھیں۔ زیادہ پیچیدہ ترکیبیں میرے ذہن میں نہیں آتی تھیں۔

میں یہی سوچتا تھا کہ کسی طرح کیبن سے بھاگ کر دریا میں چھلانگ لگا دوں۔ اس وقت سٹیمر دریا میں چل پڑا تھا۔ میں کیبن میں بند تھا۔ مجھے دریا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ سٹیمر دریا کے پار جا رہا ہے یا دریا کے آگے کسی طرف جا رہا ہے۔ کیبن میں کوئی روشن دان وغیرہ بھی نہیں تھا۔ کیبن کے اندر مجھے کسی جگہ باندھا نہیں گیا تھا۔ میں کھلا تھا۔ کیبن بڑا چھوٹا سا تھا۔ میں نے بند دروازے کو باہر کی طرف دھکیلا۔ باہر سے دروازہ بند تھا۔ کیبن کی دیوار کے ساتھ لکڑی کے بنچ بنے ہوئے تھے۔ میں بنچ پر بیٹھا تھا۔ جسم درد کر رہا تھا۔ میں بنچ پر لیٹ گیا۔ مجھے جاپانیوں نے بڑے زور زور سے تھپڑ مارے تھے۔ میرے منہ سے خون تو نہیں نکلا تھا، ہونٹ بھی کہیں سے نہیں پھٹا تھا لیکن لگتا تھا کہ میری ایک آنکھ تھوڑی سوج گئی ہے۔

میرے پیٹ پر ٹھڈے مارے گئے تھے جس کی وجہ سے پیٹ میں کسی کسی وقت درد کی لہر اٹھتی تھی۔ اس وقت میں بڑا پچھتا رہا تھا کہ کیوں بھائی جان سے الگ ہو کر ساتین کی تلاش میں جنگل میں اکیلا نکل آیا۔ میری جیب میں جتنے پیسے تھے وہ جاپانیوں نے نکال لئے تھے۔ بھنے ہوئے چنے پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ سٹیمر ٹھک ٹھک کی آواز سے دریا میں چل رہا تھا۔ کسی کسی وقت وہ سیٹی بجا دیتا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے جاپانی مجھے قید کر کے جاپان لے جائیں اور وہاں کسی بہت بڑے جیل خانے میں ڈال دیں اور باقی ساری عمر کے لئے جیل میں قید ہو جاؤں۔

غرض کہ میرے ناپختہ ذہن میں طرح طرح کے پریشان کن خیالات آ رہے تھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے سٹیمر ایک طرف کو گھوم گیا ہے۔ اس کی رفتار ہلکی ہونے لگی تھی۔ انجن

کی آواز سی ہی پڑ ی تھی۔ سٹیمر بار بار وسل دے رہا تھا۔ پھر سٹیمر بہت آہستہ ہو گیا اور رک گیا۔ انجن بھی بند ہو گیا تھا۔ جاپانی سپاہیوں کی باہر سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ کیبن کا دروازہ کھلا۔ دو جاپانی سپاہی اندر آ گئے۔ انہوں نے مجھے ہتھکڑی لگائی اور کیبن سے باہر لے آئے۔ میں نے دیکھا کہ سٹیمر دریا کے دوسرے کنارے پر ایک جگہ لگا ہوا تھا۔ سامنے بہت سے فوجی کیمپ نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف فوجی ٹرک کھڑے تھے۔ جاپانی فوجی ادھر ادھر چل پھر رہے تھے اور اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک فوجی ٹرک آ کر سٹیمر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جاپانی فوجیوں نے مجھے کیبن سے اتار کر ٹرک میں بٹھا دیا۔ خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گئے اور فوجی ٹرک کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جاپانی فوجی ٹرک دریا پار کے ایک جنگل میں اونچی نیچی سڑک پر اچھلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک جاپانی سپاہی میرے پاس بیٹھا تھا جس کی بیلٹ کے ساتھ میری ہتھکڑی کی زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ سامنے والی سیٹ پر دو جاپانی سپاہی بیٹھے تھے۔ وہ سگریٹ پی رہے تھے اور اونچی آواز میں ایک دوسرے سے جاپانی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا تھا بلکہ دیکھا تھا کہ جاپانی بڑی اونچی آواز میں باتیں کرتے تھے۔ شاید جنوری کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اس موسم میں امرتسر میں بڑی سردی ہوتی تھی۔ مجھے اپنا شہر امرتسر یاد آ رہا تھا۔ میں سردی میں پشمینے کی فرد اوڑھ کر کمپنی باغ جایا کرتا تھا اور ٹھنڈی کھوئی کے پاس جہاں گلابوں کے تختے تھے وہاں بیٹھ کر چھپ کر سگریٹ بھی پیتا تھا اور گلاب کے پھولوں کو بھی دیکھا کرتا تھا۔ اگر میری بچپن کی پہلی محبت نے رف کاپی کے صفحے پر مجھے کوئی خط لکھا ہوتا تھا تو وہ خط بار بار پڑھا کرتا تھا۔

اس وقت اپنی بچپن کی پہلی محبت کو اور کمپنی باغ کے گلاب کے پھولوں کو یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ جنہیں میں بڑی مشکل سے روکے ہوئے تھا۔ کبھی آرٹسٹ بھائی یاد آتا۔ کبھی والدہ یعنی آپو بی کا خیال آتا کہ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں رنگون سے نکل کر جاپانیوں کی قید میں آ گیا ہوں تو وہ کس قدر پریشان ہوں گی۔ وہ تو سب

رونے لگیں گے۔ بس یہی چھوٹے چھوٹے، پریشان کرنے والے، دکھ دینے والے خیالات تھے جو بار بار میرے ذہن میں آ رہے تھے اور ٹرک جنگل میں دوڑتا جا رہا تھا۔

برسات کا موسم نہیں تھا اس لئے ابھی تک کوئی بارش نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو دفعہ آسمان پر بادل ضرور آئے تھے مگر بغیر بارش برسائے گزر گئے تھے۔ کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد ٹرک جنگل میں ایک کھلی جگہ پر آ کر رک گیا۔ ٹرک کی چھت نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں دونوں جانب بانس کی جھونپڑی نما بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک اونچی جگہ پر لکڑی کا بہت بڑا کیبن بنا ہوا تھا جس کے باہر جاپان کا سرخ گولے والا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ وہاں بہت سی فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک بارک میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شاید وہاں فوج کے لئے کھانا تیار ہو رہا تھا۔ مجھے کافی بھوک لگ رہی تھی۔ دن کافی گزر چکا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور گرمی اور حبس ہو رہا تھا۔ جاپانی مجھے ٹرک سے اتار کر اوپر جو بڑا کیبن تھا وہاں لے آئے۔

کیبن کے دروازے کے باہر ایک بوڑھا برمی برآمدے میں بیٹھا آہستہ آہستہ ایک رسی کھینچ رہا تھا۔ یہ رسی اس دیسی پنکھے کی تھی جو اندر کیبن کے کمرے میں چھت کے ساتھ لگا تھا۔ ایک لمبا بانس تھا جس کے نیچے ناریل یا شاید بانس کے پتوں کو جوڑ کر ایک لمبا پنکھا سا لگا دیا گیا تھا۔ بانس چھت کے ساتھ بندھا تھا۔ پنکھے کے بڑے بانس کے درمیان میں رسی بندھی تھی جس کا سرا کیبن کے باہر برآمدے میں بیٹھے بوڑھے برمی کے ہاتھ میں تھا جسے وہ آہستہ آہستہ کھینچتا تو اندر پنکھا جھلنے لگتا تھا۔ یہاں بجلی نہیں تھی۔

پنکھے کے نیچے ایک گول مٹول گنجا جاپانی فوجی وردی پہنے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح بے جان تھا۔ چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ جاپانی سپاہی نے جس کی بیلٹ کے ساتھ میری ہتھکڑی کی زنجیر بندھی تھی مجھے اس گنجے جاپانی افسر کے سامنے پیش کر دیا اور سلیوٹ مار کر اسے اپنی زبان میں کچھ بتانے لگا۔

جاپانی فوجی افسر نے قلم ایک طرف رکھ دیا اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ نیام میں پڑی ہوئی ایک تلوار اس نے سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر

تک مجھے گھورنے کے بعد جاپانی فوجی افسر کرسی پر سے اٹھا۔ اس نے تلوار بڑے آرام سے نیام میں سے نکالی۔ مجھے پسینہ آ گیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جاپانی اپنے قیدیوں کی گردن اڑا دیا کرتے ہیں۔ میرا حلق دہشت کے مارے خشک ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے سارے گھر والے، امرتسر والا گھر، محلہ اور کمپنی باغ میری آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح گھومنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔

جاپانی فوجی افسر کے چہرے پر ایک مردہ سنگ دلی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے تلوار کی نوک میرے ماتھے سے لگائی۔ مجھے چکر آ گیا۔ میں نیچے گر پڑا۔ جاپانی فوجی افسر نے چلا کر جاپانی زبان میں جاپانی سپاہی سے کچھ کہا۔ جاپانی سپاہی کو میری ہتھکڑی کی وجہ سے جھٹکا لگا تھا اور وہ بھی میرے گرتے ہی اپنے آپ ایک طرف جھک گیا تھا۔ سپاہی نے مجھے ٹھڈا مار کر اٹھایا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ یہی لگتا تھا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میں بڑی مشکل سے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جاپانی فوجی افسر اس دوران کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے تلوار نیام میں ڈال لی تھی۔ مجھے گویا پھر سے زندگی مل گئی تھی۔ مجھے اپنے اوپر ایک ایسے موت کے قیدی کا گمان ہو رہا تھا جس کی رحم کی اپیل عین وقت پر منظور ہو گئی ہو اور اسے پھانسی کے تختے سے اتار لیا گیا ہو۔

جاپانی فوجی افسر نے اشارے سے سپاہی کو کوئی حکم دیا۔ جاپانی سپاہی مجھے کھینچتا ہوا کیبن سے باہر لے گیا۔ اس نے مجھے ٹرک میں بٹھایا اور ٹرک ایک بار پھر جنگل میں آگے کی طرف چل پڑا۔ خوف کے مارے میرا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جاپانی فوجی افسر نے خود تو میری گردن نہیں اڑائی لیکن اس فوجی سپاہی کو آرڈر دیا ہے کہ وہ مجھے جنگل میں لے جا کر ہلاک کر دے۔ فوجی ٹرک درختوں کے درمیان جھاڑیوں اور گھاس پودوں کو کاٹ کر بنائی گئی غیر ہموار سڑک پر جا رہا تھا۔

یہ جنگل کا کوئی نیم پہاڑی سلسلہ تھا۔ ٹرک کبھی دائیں طرف مڑ جاتا۔ کبھی بائیں طرف مڑ جاتا۔ راستے میں ایک ندی بھی آئی۔ پھر ایک ایسی جگہ آ گئی جہاں بہت سے لوگ کلہاڑیوں سے درخت کاٹ رہے تھے۔ ان کے جسم لاغر تھے اور کپڑے گندے چیتھڑوں کی

طرح ہو رہے تھے۔ ان آدمیوں کے درمیان جگہ جگہ جاپانی سپاہی سٹین گن لئے کھڑے ا
کے کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ جو آدمی ذرا سستی دکھاتا جاپانی سپاہی اسے بے دردی
سٹین گنوں کے دستے اور ٹھڈے مارنا شروع کر دیتے۔

ٹرک ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میری ہتھکڑی اتار دی گئی اور مجھے دھکا دے
درخت کاٹنے والے آدمیوں کی طرف دھکیل دیا گیا جو جنگی قیدی ہی ہو سکتے تھے۔ ان
ہندوستانی بھی تھے اور کچھ گورے انگریز بھی تھے۔ سب کی بری حالت ہو رہی تھی۔ معلو
ہوتا تھا کہ انہیں کئی روز سے کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ جو جاپانی سپاہی اپنی نگرانی میں قیدیوں
مار مار کر ان سے کام لے رہے تھے ان میں سے ایک نے مجھے گردن سے دبوچ
دوسرے سپاہی کی طرف دھکیل دیا۔ دوسرے جاپانی سپاہی نے میرے چہرے پر زور
تھپڑ مارا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

ایک طرف تین چار کلہاڑیاں پڑی تھیں۔ میں نے ایک کلہاڑی اٹھائی اور ایک
درخت پر کلہاڑی چلانے لگا جس پر پہلے ہی سے ایک گورا قیدی کلہاڑی چلا رہا تھا۔
درخت کٹ کر زمین پر گر پڑا تھا اور اس کے دو ٹکڑے کئے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے
جاپانی سپاہی سٹین گن لئے کھڑے تھے۔ میں زور زور سے کلہاڑی چلا رہا تھا۔

میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ وہاں چاروں طرف جاپانی فوجی سٹین گنیں لـ
موجود تھے۔ جنگل میں جہاں درختوں کی کٹائی ہو رہی تھی وہاں تین طرف مشین گنوں کے
مورچے بنے ہوئے تھے جہاں پر ہر مورچے میں دو دو سپاہی بیٹھے تھے۔ مسلح جاپانی فوج
قیدیوں کے درمیان بھی ان کے کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہمارے قریب کھڑا ایک سپا
ذرا آگے کو گیا تو مجھے زور زور سے کلہاڑی چلاتے دیکھ کر گورا سپاہی قیدی ہندوستانی زبا
میں بڑی دھیمی بلکہ مردہ آواز میں کہنے لگا۔

”آہستہ آہستہ کام کرو۔ تھک جاؤ گے پھر کیا کرو گے۔“

وہاں جنگل میں گرمی اور حبس اتنا تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد میں پسینے میں نہا گیا
میں نے گورے قیدی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہاتھ ذرا نرم کر لیا۔ میں نے اتـ

شقت کبھی نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر ہی بعد میرے بازو تھک گئے۔ پھر میں نے گورے قیدی
کو دیکھا کہ وہ اس طرح کلہاڑی چلا رہا تھا کہ ہر ضرب کے درمیان تھوڑا سا وقفہ ڈال رہا
ھا۔ میں بھی ایسا کرنے لگا۔ اس سے مجھے تھوڑا سا آرام مل گیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا اور جنگل میں دن کی روشنی ماند پڑنے لگی تھی۔ ایک
طرف سے سیٹی بجانے کی آواز آئی۔ ہندوستانی اور گورے قیدیوں نے کلہاڑے زمین پر
رکھ دیئے اور وہیں بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ میں نے بھی کلہاڑی ایک طرف رکھ
دی اور قمیص سے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ ایک بار پھر زور زور سے سیٹی بجنے لگی۔ سیٹی
کی دوسری آواز پر سارے قیدی اٹھ کھڑے ہوئے اور دو قطاریں بنانے لگے۔ میں بھی
ایک قطار میں شامل ہو گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اگلی قطار میں میری عمر کے تین
لڑکے بھی تھے۔ ان سب کے چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے بھی قیدیوں
والے کپڑے نہیں تھے۔

جاپانی سپاہی قیدیوں کو ٹیک مارچ کراتے ایک لمبے بارک نما جھونپڑے میں
لے گئے جہاں ایک لمبی میز پر ایک قطار میں ٹین کی تھالیاں پڑی تھیں۔

◆......◆......◆

ایک جاپانی سپاہی نے بڑا سا پتیلا اٹھا رکھا تھا۔ دوسرا جاپانی سپاہی اس میں
کڑچھے کی مدد سے ابلے ہوئے چاولوں کا ایک ایک کڑچھا ڈالتا جاتا تھا۔ قیدیوں کی ت
چودہ پندرہ سے زیادہ نہیں تھی۔ انہیں میز کے دونوں جانب کھڑے کر دیا گیا۔ جب
ساری تھالیوں میں چاول ڈال چکے تو ایک سپاہی نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سنتے
قیدی ابلے ہوئے چاولوں پر ٹوٹ پڑے۔ ایک جاپانی فوجی ٹین کے گلاس میں پانی ڈا
ہر قیدی کے پاس رکھے جاتا تھا۔ ابلے ہوئے موٹے بدذائقہ چاول تھے جن میں م
نمک ڈالا گیا تھا۔ تھوڑے سے چاول تھے۔ سارے قیدی جلدی سے کھا گئے۔ ہماری
نہیں مٹی تھی۔ سپاہی ہمیں ٹیک مارچ کراتے اینٹ گارے سے بنی ہوئی ایک لمبی
میں لے آئے جہاں زمین پر گھاس پھونس بچھا ہوا تھا۔ یہ قیدیوں کا بستر تھا۔ بارک
ڈھلواں چھتی اونچی تھی اور چاروں کونوں میں گیس روشن تھے جن کی روشنی کافی تھی۔
میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جس میں سے گزار کر قیدیوں کو اندر لایا گیا تھا۔ دروازہ
دیا گیا۔ قیدی گھاس پھونس کے فرش پر بیٹھ گئے۔ ان پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ کو
ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ بارک بند تھی جس کی وجہ سے اندر سخت حبس
تھا۔ مچھروں نے بھی بھنبھنانا شروع کر دیا تھا۔ میرے قریب ہی ایک ہندوستانی
سپاہی گھاس پر آنکھیں بند کئے چپ چاپ لیٹا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر میری
دیکھا اور اردو میں پوچھا۔

"تم پنجابی ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں۔"

میں نے اسے ساری کہانی مختصر کر کے سنا دی۔ وہ بولا۔

"میں آٹھ پنجاب انفنٹری کا رجمنٹ کا حوالدار خداداد خان ہوں۔ تمہیں اپنے
ائی بہن سے الگ نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"جاپانی ہمارے سر تو نہیں کاٹیں گے؟"

حوالدار خداداد خان نے پنجابی میں آہستہ سے کہا۔

"اگر ہم نے بھاگنے کی کوشش کی تو جاپانی ہمیں دوزانو بٹھا کر ہمارا سر کاٹ دیں
ے۔ میرے سامنے چار گوروں کے سر کاٹے گئے ہیں۔ اب کوئی قیدی بھاگنے کی کوشش نہیں
رتا۔ بھاگ کر ہم جائیں گے بھی کہاں؟ بنگال یہاں سے ہزاروں میل دور ہے۔ یہاں
ے جنگلی برمی لوگ بھی ہندوستانی کے دشمن ہیں۔ ہمیں پکڑ کر جاپانیوں کے حوالے کر دیں
ے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہاں ہمیں کتنی دیر تک قید رکھا جائے گا؟"

"جب تک جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔ سونے کی کوشش کرو۔" حوالدار نے تھکی
ئی آواز میں کہا۔

"صبح صبح پھر درخت کاٹنے ہوں گے۔"

مجھے مچھر کاٹ رہے تھے۔ میں حیران ہوں کہ تھوڑی دیر بعد حوالدار خراٹے لے
ہا تھا۔ باقی قیدی بھی تقریباً سو گئے تھے۔ اصل میں سارے دن کی مشقت سے اس قدر
ک ٹوٹ گئے تھے کہ گھاس پھونس کے بستر پر گرتے ہی سو گئے تھے۔ مچھروں کے کاٹنے
ے شاید وہ عادی ہو گئے تھے۔ خدا جانے کب تک میں مچھروں سے جنگ کرتا رہا اور کب
ے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔

اس جنگل میں، میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ صبح سے شام تک دس با
دنوں تک درخت کاٹتا رہا۔ میرے کپڑے بھی چیتھڑے بن گئے تھے۔ ہمیں دوسرے
گرم پانی سے نہلایا جاتا تھا۔ نہلانے کا طریقہ یہ تھا کہ جنگل میں ایک جگہ کھڑا کر دیا جا
تھا۔ ہمارے کپڑے نہیں اتارے جاتے تھے۔ پانی سے بھرے ہوئے ٹینک والا ایک ٹرک
کر کھڑا ہو جاتا تھا اور پائپوں کی مدد سے ہم پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد نیم گرم پانی ڈالا جاتا
ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ اپنے کپڑوں کو ہاتھ سے مل مل کر نہائیں۔ اس طرح سے کپڑوں ا
جسم دونوں کا میل کسی حد تک صاف ہو جاتا تھا۔ پانی میں کوئی جراثیم کش دوائی ملائی ہو
تھی جس کی باقاعدہ بو آتی تھی۔

دس بارہ دنوں کے بعد ہم سے چھ سات قیدیوں کو نکال کر وہاں سے تھوڑی
ایک ایسی جگہ پر لایا گیا جہاں ایک سڑک بن رہی تھی اور وہاں پہلے سے کچھ قیدی کدالو
سے زمین کھود رہے تھے اور کچھ قیدی ٹوکریوں میں ملبہ ڈھو رہے تھے۔ سڑک پر جگہ جگہ
کے ڈھیر پڑے تھے۔ ہمیں بھی ٹوکریاں دے دی گئیں۔ ہم زیر تعمیر سڑک پر سے ملبہ اٹھا
دوسری طرف ایک گھاٹی میں پھینک آتے تھے۔ یہ کام درخت کاٹنے کے مقابلے میں
مشقت کا تھا۔ قیدی آرام آرام سے کھونچوں اور کھپوں سے ٹوکری میں ملبہ ڈالتے، ٹوکر
سر پر اٹھا کر دوسری طرف گھاٹی کے کنارے تک جاتے اور دوسرے طرف ملبہ پھینک
دیتے۔ میں بھی ایسا ہی کرتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے قیدی کو چھوڑ کر جاپانی سپاہی نگرانی
کھڑے تھے۔ ذرا سستی دکھاتا اسے ٹھڈے مارنے شروع کر دیتے تھے۔ دوپہر کے وقت
ہمیں درختوں کے نیچے ایک طرف بٹھا کر کھانے کو نمکین چاول اور پانی وغیرہ دے دیا جاتا
اس کے بعد پھر ہماری مشقت شروع ہو جاتی۔ روز و شب کا سلسلہ بڑا اذیت ناک تھا۔
میں سے کئی قیدی بیمار تھے جو قیدی زیادہ بیمار ہو جاتے انہیں جاپانی سب کے سامنے ا
طرف دو زانو بٹھا کر تلوار کے ایک ہی وار سے ان کی گردن اڑا دیتے۔ اس عبرت نا
انجام کو دیکھ کر بیمار قیدی بھی مستعدی سے کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مشقت کر
کرتے زمین پر گرتے اور مر جاتے۔ اس طرح اپنے آپ مرنے کو وہ گردن کٹوا کر مر

سے بہتر سمجھتے تھے۔

میرا نوجوان خون تھا۔ بدن میں طاقت تھی۔ میں باسی اور ناکافی غذا کھا کر بھی
مشقت کرتا رہا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہم میں سے تین قیدیوں کو زیر تعمیر سڑک کے ایک ایسے
مقام پر روڑی ڈالنے کے لئے لگا دیا گیا جہاں نیچے چھوٹی سی گھاٹی تھی اور چھوٹا سا تالاب
بھی تھا۔ وہاں روڑی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ہمیں وہاں سے روڑی ٹوکریوں میں بھر کر
لا کر سڑک پر ڈالنی پڑتی تھی۔ میرے ساتھ جو قیدی کام پر لگا تھا وہ حوالدار خداداد تھا۔ ہمیں
ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جس وقت ہم ٹوکریوں میں روڑی ڈال
رہے ہوتے تھے تو اوپر سڑک کے کنارے ایک جاپانی سپاہی سٹین گن کا رخ ہماری طرف
کئے ہماری نگرانی کر رہا ہوتا تھا۔

ہمیں یہاں کام کرتے دو دن گزرے تھے۔ تیسرے دن جب میں ٹوکری لے
کر روڑی لینے کھائی میں اترا تو میں نے دیکھا کہ تالاب کے کنارے جھاڑیوں کے پاس دو
برمی عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ وہاں جنگل میں کہیں کہیں
کوئی دیہاتی عورت یا مرد کام کرتے نظر آ جایا کرتے تھے۔ جاپانی انہیں کچھ نہیں کہتے تھے۔
میں نے معمول کے مطابق ٹوکری میں پتھر کی روڑی ڈالی اور اسے سر پر اٹھا کر اوپر سڑک پر
جا کر سڑک پر بکھیر دی۔ خالی ٹوکری لے کر دوبارہ نیچے کھائی میں اتر گیا۔ تالاب پر جو برمی
دیہاتی عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں ان کی پیٹھ ہماری طرف تھی اور وہ جھاڑیوں کی اوٹ
میں تھیں۔ میں اپنے کام میں لگا رہا۔ میرا تیسرا یا چوتھا پھیرا تھا کہ دو عورتوں میں سے ایک
عورت اٹھی اور جھاڑیوں پر کپڑے جھاڑ کر ڈالنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے کا
ایک رخ میری طرف مڑ گیا۔

اس کو دیکھ کر میں ٹھٹھک سا گیا۔ جیسے اس عورت کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا
ہے۔ کب دیکھا تھا۔ کہاں دیکھا تھا یاد نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں اس عورت کی بھی مجھ پر نظر
پڑ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی ٹھٹھک سی گئی ہے۔ میں بیلچے سے ٹوکری میں روڑی بھر
رہا تھا اور برمی عورت کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں چونک اٹھا۔ یہ برمی عورت یا لڑکی رنگون

کے سول پیگوڈا کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پھول بیچنے والی لڑکی ساتیں ہی تھی۔ میری نظر
بالکل دھوکہ نہیں کھا رہی تھیں۔ وہ لڑکی ساتیں بھی مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہی تھی۔
نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے ٹوکری میں روڑی ڈالتے ہوئے اوپر سڑک کے کنار
نگاہ ڈالی۔ جاپانی سپاہی وہاں موجود تھا مگر اس کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں نے سات
ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ ساتیں ذرا سا مسکرائی۔ اس نے بھی تھوڑا سا ہاتھ اٹھا کر میرے سلا
جواب دیا۔

میں قدرت کی اس ستم ظریفی پر حیران تھا کہ اس نے ہم دونوں کو ملایا
ایسے حالات میں کہ ہم ایک دوسرے سے کوئی بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ساتیں نے
ایک اور اشارہ جو تین بار کیا۔ میں اس کے اشارے کو سمجھ گیا۔ وہ مجھے دور سے اشارہ کر
سمجھا رہی تھی کہ میں کل اسی وقت پھر آؤں گی۔ اس کے فوراً بعد وہ دوسری عورت کے
وہاں سے چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے جھاڑی پر پھیلائے ہوئے دو تین گیلے کپڑ
اٹھا لئے تھے۔ میں سمجھ نہ سکا کہ اس نے خاص طور پر کل اس وقت آنے کا اشارہ کیوں
ہے۔ وہ مجھ سے کوئی بات تو کر نہیں سکتی تھی۔ نہ ہی میں اس سے کوئی بات کر سکتا تھا۔
سڑک کے کنارے جاپانی سپاہی موجود تھا۔ اتفاق سے اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ میں
چینی سے دوسرے دن کا انتظار کرنے لگا۔ کبھی دل میں خیال آتا کہ ساتیں کوئی ایسی غلط
کر بیٹھے کہ جس کی وجہ سے میرے ساتھ وہ بھی کسی مصیبت میں پھنس جائے۔ اتنا میں
تھا کہ اس نے کل اسی وقت آنے کا اشارہ یونہی نہیں کیا۔ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ
جاپانیوں کی قید میں ہوں اور وہ مجھ سے مشقت لے رہے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ساتیں
اپنے ذہن میں کوئی پروگرام بنا لیا ہو۔ میں ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔
دن گزر گیا۔ رات کو میں تھک ٹوٹ کر گھاس کے بستر پر لیٹا تو آٹھ انفنٹر
حوالدار خداداد خان میرے قریب نہیں تھا ورنہ میں اس سے ضرور کوئی مشورہ کرتا کیونکہ
کو میری طرف اشارہ کرتے اس نے بھی دیکھا تھا۔ حوالدار خداداد مجھ سے کافی
دوسرے قیدیوں کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ سب قیدی دن بھر کی جفاکشی کے بعد اس قدر

جاتے تھے کہ گرتے ہی سو جاتے تھے۔ مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرا ذہن بار بار ساتیں
کی طرف چلا جاتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے کل اسی وقت آنے کا اشارہ کیوں کیا
تھا؟ اشارہ بڑا واضح تھا۔ میں بھی بہت تھکا ہوا تھا۔ آخر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے
لیا۔ دوسرے دن مجھے یہ فکر لگ گئی کہ کہیں جاپانی میری ڈیوٹی کسی دوسری جگہ پر نہ لگا دیں
لیکن ایسا نہ ہوا۔ میری ڈیوٹی اسی گھاٹی میں لگائی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ابھی کافی
روڑی ڈھونے والی پڑی ہوئی تھی۔ میں دل میں خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ جس وقت
میری لڑکی آئے اس وقت جاپانی سپاہی کا منہ دوسری طرف ہو۔ میں اپنے کام میں لگ گیا۔
میں روڑی اٹھا اٹھا کر اوپر سڑک پر ڈالتا رہا۔ اس دوران جاپانی سپاہی ہمارے سر پر مگر سڑک
کے اوپر ہی کھڑا ہماری نگرانی کرتا رہا۔ ہمیں صبح کام پر لگا دیا جاتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے گزر
گئے۔ برمی لڑکی ساتیں ابھی نہیں آئی تھی۔ ایک بار میں خالی ٹوکری اور بیلچہ اٹھائے گھاٹی میں
اترا تو اچانک میں نے ساتیں کو دیکھا۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی اور مجھے
اشارے سے بلا رہی تھی۔ وہ اکیلی آئی تھی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ جاپانی سپاہی کا منہ دوسری
طرف تھا۔ میں ٹوکری میں روڑی ڈالنے لگا۔ ساتیں کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ وہ بڑی بے
چینی سے جیسے میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بھی اوپر جاپانی سپاہی کو دیکھ لیتی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا
کہ جاپانی سپاہی سڑک سے ہٹ گیا۔ اب وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیسے ہی جاپانی سڑک پر سے
غائب ہوا ساتیں دوڑ کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لے کر ایک
طرف کو دوڑ پڑی۔

ساتیں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اپنے ساتھ مجھے بھی دوڑا رہی
تھی۔ میں فرار ہونے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ اب واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس انتظار میں
تھا کہ کب جاپانی سپاہی کی سٹین گن کے فائر کی بوچھاڑ ہمارے جسموں کو چھلنی کرتی ہے
کیونکہ جاپانی سپاہی ایک منٹ کے لئے بھی ہمیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے
تھے۔ میرا دل فرار ہو جانا بھی چاہتا تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ یہ معصوم سی دیہاتی لڑکی مجھے
کہاں چھپا سکے گی؟ میرے فرار کا علم ہوتے ہی جاپانی ساتیں کے گاؤں پہنچ جائیں گے اور

نہ صرف مجھے پکڑ کر تلوار سے میری گردن اڑا دیں گے بلکہ گاؤں کی عورتوں مردوں سے
عبرت ناک انتقام لیں گے۔ کسی وقت خیال آتا کہ ساتیں کا ہاتھ چھڑا کر واپس بھاگ
جاؤں کسی وقت خیال آتا کہ ہوسکتا ہے یہ برمی لڑکی ساتیں واقعی مجھے کسی محفوظ مقام پر
دے۔ ہم نشیب میں پتھروں جھاڑیوں پر سے کودتے تیزی سے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔
خدا جانے اس کا گاؤں وہاں سے کتنی دور تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ
اپنے گاؤں میں لے جا رہی ہے یا کسی دوسری جگہ لے جا رہی ہے۔ اس معصوم سی برمی
نے مجھے اپنے خیال میں موت کے منہ سے ضرور نکال لیا تھا لیکن موت اب ہم دونوں
پیچھا کر رہی تھی۔ میں ایک خطرے سے نکل کر اس سے زیادہ بھیانک خطرے کی طرف
رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے ہم ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پاس آ گئے۔ ہم دونوں کے
پھول گئے تھے۔ پھول بیچنے والی معصوم سی برمی لڑکی ساتیں کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے
بات کا احساس ہے کہ اس نے میری خاطر کتنا بڑا خطرا مول لیا ہے۔ یہ کون سا جذبہ تھا
نے ساتیں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے موت کے منہ سے
کر لے جائے؟ کیا یہ محبت تھی؟ لیکن ہم نے کبھی ایک دوسرے سے بات تک نہیں کی
کیا یہ انسانی ہمدردی تھی؟ انسانی ہمدردی ہی ہو سکتی تھی۔ میں محبت کے معاملے میں کبھی
خوش فہمی کا شکار نہیں ہوا۔ نہ اس زمانے میں شکار رہا تھا۔ نہ آج کبھی اس خوش فہمی کا شکار
ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مجھے بہت محبت ملی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ صرف
ہی میری محبت کا مرکز کبھی نہیں رہی۔ میری محبت کے ہزاروں مرکز ہیں۔ ہزاروں
ہیں۔ یہ مقامات جنگلوں میں بھی ہیں۔ بارشوں میں بھی ہیں۔ چائے کی خیال
خوشبوؤں میں بھی ہیں۔ چیت وساکھ کے مہینوں میں بھی ہیں اور خزاں کی ہواؤں
درختوں سے جدا ہوتے زرد پتوں میں بھی ہیں اور بارش میں بھیگتی دوڑتی ریل گاڑی
بھی ہیں اور حسن ابدال کے سرخ گلابوں اور پوٹھوہار کی دھریکوں کے کاسنی پھولوں اور
فوج کے شیر دلیر جوانوں کے جذبہ حب الوطنی میں بھی ہیں، جن کے میدان جنگ
گرجتے نعرہ تکبیر اور یا علی کے نعروں سے دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ عورت کی

کے مقامات تو بدلتے رہتے ہیں لیکن میری محبت کے مقامات کبھی نہیں بدلے۔ وہ جیسے
میرے بچپن، میری جوانی میں تھے ویسے ہی میرے بڑھاپے میں رہیں گے۔

ساتیں مجھے ٹیلے کے پیچھے لے گئی۔ وہاں ایک جگہ لکڑیوں کا بہت بڑا انبار لگا ہوا
تھا۔ اس نے ایک جگہ سے لکڑیاں پیچھے ہٹائیں تو نیچے لکڑی کا ایک تختہ بچھا ہوا تھا جس پر
ناریل کی چھال پڑی ہوئی تھی۔ ساتیں نے ناریل کی چھال ایک طرف کی اور تختہ اوپر اٹھا
دیا۔ تختہ کے نیچے زینہ اترتا تھا۔ ساتیں نیچے اتر گئی۔ اس نے شکستہ ہندوستانی زبان میں
مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ میں نے پہلی بار اس کی زبان سے بڑی مشکل سے سمجھ میں آنے
والی اردو میں ایک جملہ سنا تھا۔ میں بھی نیچے اتر گیا۔ آگے ایک سرنگ لگتی تھی۔ اس کی چھت
اونچی تھی اور چوڑی تھی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ساتیں میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگی۔ دس بارہ قدم
چلنے کے بعد دھندلی سی روشنی نظر آنے لگی۔ یہ روشنی سرنگ کی دیوار میں بنے ہوئے ایک
دروازے سے آ رہی تھی۔ یہ ایک دالان نما کشادہ کوٹھڑی تھی جہاں زمین پر ناریل کی چھال
بچھی ہوئی تھی۔ دھندلی سی روشنی اوپر دیوار میں بنے ہوئے ایک گول روشن دان میں سے آ
رہی تھی جس کی شاخیں کوٹھڑی میں آ رہی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ لکڑی کے گول
ڈرم پڑے تھے۔ ساتیں نے مجھے بتایا کہ ان ڈرموں میں چاول اور ناریل کے کھوپے رکھے
ہوئے ہیں۔ اس نے مجھے ناریل کی چھال پر بٹھا دیا اور خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس
لڑکی نے بڑی دلیری اور جرأت کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے کچھ اشاروں اور کچھ اپنی ٹوٹی
پھوٹی ہندوستانی زبان میں سمجھایا کہ اس جگہ میں اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھوں۔ وہاں
جاپانی نہیں آ سکتے۔ میں ساتیں سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ایسے ٹوٹ پھوٹے شکستہ
الفاظ نہیں مل رہے تھے جو اس کی سمجھ میں آتے۔ پھر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ
شکریئے کے الفاظ نہ سمجھ سکی۔ اس نے اٹھتے ہوئے جو کچھ کہا اس کا مفہوم میں یہی سمجھا کہ
میں وہاں بے فکر ہو کر بیٹھوں۔ وہ تھوڑی دیر میں واپس آ رہی ہے۔ وہ چلی گئی۔

ساتیں کے جانے کے بعد مجھے طرح طرح کے خدشات نے گھیر لیا۔ اس وقت
تک جاپانیوں کو میرے فرار کا یقیناً علم ہو گیا ہو گا۔ وہ میری تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔

قریب کا گاؤں پنی ہے جہاں ساتیں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ جاپانی ا
بے وقوف نہیں ہیں۔ لکڑیوں کے ڈھیر پر اگر انہیں ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ اس کے
کوئی تہہ خانہ نہ ہو تو پھر میرا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ میں نے اس نا
بھولی بھالی لڑکی کے پیچھے لگ کر اپنی زندگی انتہائی خطرے میں ڈال لی ہے۔ مجھے ا
حماقت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ کسی وقت خیال آتا کہ میں نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ جاپانیوں
قید میں رہ کر سسک سسک کر مرنے سے بہتر ہے کہ میں وہاں سے بھاگ آیا ہوں۔ ا
اگر قسمت نے ساتھ دیا تو یہاں سے نکل بھی سکتا ہوں۔ میں ٹیلے کی سرنگ کی کوٹھڑی
اکیلا بیٹھا سوچتا رہا کہ اگر جاپانی مجھے نہ پکڑ سکے تو مجھے کس طرف جانا چاہئے۔ میں ا
علاقے سے واقف نہیں تھا۔ اس سلسلے میں یہ برمی لڑکی ساتیں ہی میری رہنمائی کر سکتی تھ
مگر ابھی تک خطرہ میرے سر سے ٹلا نہیں تھا۔ موت میرے سر پر برابر منڈلا رہی تھی۔ رو
دان میں سے دن کی جو روشنی آ رہی تھی وہ آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا مطل
تھا کہ دن کافی گزر گیا ہے۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی اور پیاس بھی لگ رہی تھ
ساتیں مجھے وہاں چھپا کر چلی گئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے تھ
گیا۔ اٹھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے جی گھبرایا تو بیٹھ گیا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وق
کتنا گزر گیا ہے۔ روشندان کی روشنی بھی دھیمی پڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر شا
اندھیرا چھانے لگا تھا۔

◆.....◆.....◆

کچھ ہی دیر بعد روشندان میں سے آتی ہوئی مدھم روشنی بھی غائب ہو گئی اور کوٹھڑی میں اندھیرا چھا گیا۔ اس روشندان کا دم غنیمت تھا۔ اس میں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ یہی تازہ ہوا مجھے جینے کا حوصلہ عطا کر رہی تھی۔

باہر رات کا سماں تھا۔ بڑی خاموشی تھی۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساتیں کا گاؤں وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ خدا جانے جاپانی جب میری تلاش میں ساتیں کے گاؤں میں آئے ہوں گے تو انہوں نے گاؤں والوں کے ساتھ کس قدر وحشیانہ سلوک نہیں کیا ہو گیا لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے دل میں افسوس ضرور ہو رہا تھا۔ خدا جانے رات کتنی گزر چکی تھی کہ مجھے کوٹھڑی کے باہر سرنگ کے اندھیرے میں روشنی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیں۔ میں جلدی سے دروازے کے پاس آ گیا۔ دروازے کے کیواڑ نہیں تھے۔ میں نے سر تھوڑا سا باہر نکال کر دیکھا۔ سرنگ کے دہانے کی طرف سے ساتیں روشن موم بتی ہاتھ میں پکڑے چلی آ رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ میرے پاس آ کر اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اس نے موم بتی ایک پتھر کے اوپر لگا دی۔ تھیلا کھول کر اس میں سے رومال میں بندھی ہوئی سلور کی چھوٹی پتیلی نکالی اس میں ابلے ہوئے چاول اور مچھلی کا اچار تھا۔ مچھلی کا اچار برما میں گھروں میں بڑے شوق سے کھایا جاتا تھا۔ عورتیں اس کا اچار گھروں میں اس طرح ڈالتی ہیں جس طرح ہمارے ہاں خواتین گھروں میں آم کا اچار ڈالتی ہیں یا کبھی ڈالا کرتی تھیں۔ شیشے کی نسواری بوتل میں وہ میرے لئے پانی لائی تھی۔ میں نے اچار کے ساتھ چاول کھائے' پانی پیا تو جان

میں جان آ گئی۔ کئی دنوں کے بعد اس قسم کا کھانا کھانے کو ملا تھا۔

ساتیں خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے کچھ کہا جو میں سمجھ نہ سکا۔ اس کو ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بہت کم آتی تھی۔ تھوڑا سا بول کر باقی اشاروں سے وہ اپنا مطلب مجھے سمجھا دیتی تھی۔ اس نے مجھے تھوڑا تھوڑا بول کر اور زیادہ اشاروں سے بتایا کہ جاپانی اس کے گاؤں بھی آئے تھے۔ میں انہیں نہ مل سکا تو انہوں نے آدمیوں کو مارا پیٹا۔ جوان لڑکیوں کو گاؤں والوں نے پہلے ہی محفوظ جگہوں پر چھپا دیا تھا۔ گاؤں میں صرف بوڑھی عورتیں ہی تھیں۔ جاپانیوں نے انہیں زدوکوب کیا اور گاؤں میں جتنا چاول اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں اور بکریاں تھیں اٹھا کر لے گئے۔

میں نے ساتیں سے پوچھا۔

"ساتیں! میں ادھر کب تک پڑا رہوں گا؟"

وہ ہندوستانی ضرور سمجھ لیتی تھی مگر زیادہ بول نہیں سکتی تھی۔ کہنے لگی۔

"ابھی تھوڑا دیر اور رہے گا۔ ابھی تھوڑا دیر اور رہنا سکتا ہوگا۔"

اس کا یہ جملہ مجھے آج بھی پورے کا پورا یاد ہے۔ میں چپ ہو گیا۔ ساتیں نے برتن اٹھا کر کپڑے میں لپیٹے۔ پھر انہیں باندھ کر تھیلے میں ڈالا اور اشاروں سے کچھ بول کر بتایا کہ وہ کل کسی وقت آئے گی لہذا اب میں آرام سے سو جاؤں۔ کچھ دیر میں اکیلا بیٹھا خدا جانے کیا کیا کچھ سوچتا رہا۔ پھر میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو میں پسینے میں شرابور تھا۔ کوٹھڑی میں گرمی اور حبس تھا۔ مچھر الگ تنگ کر رہے تھے۔ اس گرمی حبس اور مچھروں کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ میں ایک حساب سے میدان جنگ میں تھا اور وہاں اگر آدمی ان چیزوں کے بارے میں سوچنے لگے یا ان چیزوں کا خیال کرنے لگے تو لڑ نہیں سکتا۔ روشندان میں سے ستاروں کی بہت ہی دھیمی دھیمی روشنی کا نیلا نیلا غبار سا اندر آ رہا تھا۔ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ مچھر کاٹتے تو ایکدم سے آنکھ کھل جاتی۔ اسی طرح رات گزرتی چلی گئی۔ کسی وقت نظریں اٹھا کر روشندان کی طرف دیکھ لیتا۔ پھر روشندان میں صبح

سے پہلے کا ہلکا ہلکا نور سا جھلکنے لگا۔ صبح ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد کوٹھڑی میں دن کی دھیمی دھیمی سی روشنی ہو گئی۔ دھوپ کوٹھی میں نہیں آتی تھی۔ چھت والا روشندان کسی خفیہ جگہ پر بنایا گیا تھا۔ دن کی روشنی ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ساتیں آ گئی۔ وہ میرے لئے تھیلے میں چاول اور کالی سیاہ کیتلی اور پانی کی بوتل لائی تھی۔ میں نے اس سے باہر کا حال پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ مجھے وہاں کتنے دن اور چھپے رہنا ہوگا۔ ساتیں نے مجھے سمجھایا' میں یہی سمجھا کہ مجھے دو ایک دن اور اس کوٹھڑی میں گزارنے ہوں گے۔ یہ اپنی طبیعت پر بڑا جبر کرنے والی بات تھی مگر مجھے ہر حالت میں ساتیں کی ہدایت کے مطابق چلنا تھا۔

اس تنگ و تاریک حبس آلود کال کوٹھڑی میں میں نے مزید دو دن کس طرح گزارے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ بہرحال ایک دن ساتیں میرے لئے کھانے کو سبزی اور ابلے ہوئے چاول لائی تو اس نے مجھے سمجھایا کہ میں آج رات یہاں سے نکلنے کے لئے تیار رہوں۔ وہ اس رات مجھے وہاں سے نکالنے والی تھی۔ وہ چلی گئی۔ جب رات ہو گئی اور کوٹھڑی کے روشندان میں دن کی روشنی بجھ گئی تھی تو ساتیں آ گئی۔ اس نے آتے ہی موم بتی روشن کر دی۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا تھیلا لائی تھی۔ اس نے تھیلے میں سے ایک میل خورے رنگ کی لنگی، ایک پوری آستینوں والی قمیص نکال کر دی اور کہا کہ میں اسے پہن لوں۔ میں نے پتلون اتار کر لنگی پہنی۔ اس نے خود میری قمیص کو جس طرح برما میں لوگوں کا پہناوا ہوتا ہے میری قمیص لنگی کے اندر کر دی۔ میرے سر پر زرد رنگ کا رومال باندھا۔ پاؤں میں پہننے کے لئے ربڑ کی ایک چپل دی۔ خدا جانے یہ اس کے گھر کے کس فرد کے کپڑے تھے۔ چپل میرے پاؤں میں کھلی تھی مگر میں نے پہن لی۔ اس نے مجھے کچھ اپنی اور کچھ شکستہ ہندوستانی میں کہا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے آ جاؤں۔ میرے کپڑے اور برتن وغیرہ اس نے وہیں کوٹھڑی میں ہی رہنے دیئے اور موم بتی ہاتھ میں لے کر میرے آگے آگے چلنے لگی۔

سرنگ سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے موم بتی بجھا کر وہیں پھینک دی۔ ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر مجھے پیچھے رہنے کا اشارہ کیا۔ پہلے خود سرنگ میں سے باہر نکلی۔ اس کے بعد مجھے باہر آنے کو کہا۔ تین چار دنوں کے بعد تازہ ہوا میں سانس لیا تو ایسا لگا جیسے میں

پھر سے زندہ ہوگیا ہوں۔ باہر رات کی ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ ساتیں میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف آگے کو دوڑ پڑی۔ برمی لوگوں کی طرح بندھی ہوئی لنگی میں مجھ سے دوڑا نہیں جا رہا تھا۔ میں گر پڑا۔ ساتیں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے لنگی گھٹنوں سے اوپر اٹھا لی اور چپل جو کھلی تھی پاؤں سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ اب میں خوب تیز دوڑ سکتا تھا۔

ہم دوڑتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔ اونچی نیچی زمین تھی۔ ہم ایک تنگ سی گھاٹی میں اتر گئے۔ یہاں ہم دوڑ نہیں رہے تھے۔ میرے پاؤں میں نوکیلی شمینی گھاس چبھ رہی تھی۔ میں نے کھلی چپل ہی پہن لی۔ ربڑ کی چپل کے اندر میرے پاؤں دو تین بار پھسلے پھر مجھے اس کے ساتھ چلنا آ گیا اور میں پاؤں دبا دبا کر رکھنے اور اٹھانے لگا۔ ساتیں مجھ سے دو ایک قدم آگے آگے چل رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رک کر مجھے دیکھتی اور ہاتھ سے جلدی چلنے کا اشارہ کر کے پھر تیز تیز چلنے لگتی۔ ہم کئی گھاٹیوں، برساتی نالوں اور کھڈوں میں سے گزرنے کے بعد ایک جگہ باہر نکلے تو سامنے ستاروں کی دھندلی روشنی میں دریا دکھائی دیا۔ ایک چھوٹی سی سمپان یعنی کشتی دریا کنارے کھڑی تھی۔ اس میں ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے قریب جا کر ساتیں نے برمی زبان میں اسے کچھ کہا۔ اس آدمی نے برمی زبان میں ہی کوئی جواب دیا۔ اندھیرے میں سے ایک اور عورت نکل کر ساتیں کے پاس گئی۔ دونوں برمی زبان میں آپس میں کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ اس عورت کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ ساتیں نے وہ تھیلا مجھے دے کر کچھ کہا۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ اس تھیلے میں میرے لئے کچھ چیزیں ہیں۔ اس نے کشتی کی طرف اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں کشتی میں بیٹھ گیا۔ تھیلا میں نے اپنی گود میں رکھ لیا۔ بوڑھا برمی ملاح کشتی کی رسی کھولنے لگا۔ میں نے ستاروں کی روشنی میں دیکھا کہ ساتیں ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب نہ وہ مجھے کبھی دیکھ سکے گی نہ میں اسے کبھی دیکھ سکوں گا۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ برمی ملاح نے کشتی کھولی اور اس میں بیٹھ کر چپو چلاتے ہوئے کشتی کو کنارے سے دور لے جانے لگا۔ کشتی پھول ﷺ والی معصوم برمی لڑکی ساتیں سے دور ہو رہی تھی۔

ساتیں مجھ سے دور ہو رہی تھی۔ کروڑوں اربوں نظام ہائے شمسی کے روشن اور تاریک خلاؤں میں، کروڑوں، اربوں سالوں سے گردش کرتے ہوئے دو روشن ذرے تھوڑی دیر کے لئے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے اور ایک بار پھر کروڑوں، اربوں سالوں کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ یہ جدائی کی اداس گھڑی تھی۔ ایک دوسرے کو جتنی دیر تک، جتنی دور تک دیکھ سکتے ہو دیکھ لو۔ اس کے بعد نہ جانے کون سے خلاؤں میں کس نظام شمسی کے کون سے کرۂ ارض کی ارضی جنت میں ملاقات ہو۔ پھر نہ جانے ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی سکیں یا نہ پہچان سکیں۔ کوئی اور چہرہ ہو کوئی اور زبان ہو۔ کوئی اور خیال ہو۔

میں وی جھوک رانجھن دی جانا
نال میرے کوئی چلے
پیراں پوندی منتاں کر دی
جانا پیا ہن کلے
کہے حسین فقیر نمانا
سائیں سنہڑے گھلے

کشتی دریا میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ ساتیں کا چہرہ ستاروں کی دھند اور تاریکی میں تحلیل ہوتے ہوتے غائب ہوگیا تھا۔ نہ میں اسے نظر آ رہا تھا نہ وہ مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ دریا کی سطح شیشے کی طرح ساکن تھی۔ اس شیشے میں ستاروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایک آسمان دریا کے اوپر تھا۔ ایک آسمان دریا کے اندر تھا۔ نہ کوئی دریا تھا نہ کوئی آسمان تھا۔ نہ کوئی کشتی تھی نہ میں تھا۔ محبت، محبت، صرف محبت کا ایک خیال تھا جو ان گنت مسرتوں، لاکھوں اداسیوں، جدائیوں، وصالوں کی ایک نورانی لہر کی طرح کرہ ارض کے گرد جاری و ساری تھی۔ میں آنکھیں بند کئے سر جھکائے کشتی میں نہ جانے کب سے بیٹھا تھا کہ کشتی کو ایک دھچکا سا لگا اور میری آنکھ کھل گئی۔ کشتی دریا کے دوسرے کنارے پر جا لگی تھی۔ میں ساتیں کا دیا ہوا تھیلا اٹھا کر کشتی سے اتر کر کنارے پر آ گیا۔ میرے سامنے کنارے کے

ساتھ اونچے اونچے درختوں کی قطار رات کے اندھیرے میں سیاہ دیوار کی طرح کھڑی تھ
بوڑھے ملاح نے کشتی کو کنارے پر کھینچ کر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ میرا خیال
کہ وہ وہیں سے واپس چلا جائے گا لیکن معلوم ہوا کہ ساتیں نے اسے بطور گائیڈ میر۔
ساتھ کر دیا تھا تا کہ وہ مجھے خطرناک علاقے سے نکال دے۔ مصیبت یہ تھی کہ بوڑھا بر
سوائے برمی زبان کے اور کوئی زبان نہیں بول سکتا تھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں ا
کے پیچھے پیچھے آ جاؤں۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اس سارے علاقے کا بھیدی تھا
رات کا وقت تھا۔ یہ جنگل اتنا دشوار گزار اور گھنا نہیں تھا۔ بوڑھا برمی بڑی روانی سے چلا
رہا تھا۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ہم نے ایک کھلا میدان عبور کیا جہاں
قد آدم گھاس اگی ہوئی تھی۔

ایک برساتی نالے کو پار کیا۔ چھوٹے چھوٹے جنگلاتی ٹیلوں کے درمیان ہم د
ڈھائی گھنٹے چلتے رہے۔ بوڑھا بڑا سخت جان ثابت ہوا۔ آخر وہ تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔
میں بھی بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے میرے تھیلے کی طرف اشارہ کر کے برمی زبان میں کچھ کہا۔
میں نے تھیلا کھولا تو اس کے اندر ایک بوتل بھی تھی۔ میں نے بوتل کا کارک کھول کر اسے
سونگھا۔ برمی بوڑھا بار بار کچھ بولنے لگا۔ شاید وہ اپنی زبان میں کہہ رہا تھا کہ اس میں پانی
ہے۔ میں نے ایک گھونٹ پیا۔ وہ پانی ہی تھا۔ دو چار گھونٹ بوڑھے نے بھی پیے۔ میں
نے بوتل بند کر کے تھیلے میں رکھ دی۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔
ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ چلتے چلتے ہم ایک ٹیلے کے پاس آ گئے۔ میرا بوڑھا گائیڈ
ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد بوڑھے
برمی گائیڈ نے ٹیلے کی دوسری طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا ٹیلے کی دوسری طرف رات
کے اندھیرے میں ایک میدان سا دکھائی دیا جس میں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔
بوڑھا گائیڈ اپنی زبان میں کچھ کہہ بھی رہا تھا اور میدان کی طرف اشارے بھی کر رہا تھا۔
تین چار بار اشارے کرنے اور میری سمجھ میں نہ آنے والی زبان میں کچھ کہنے کے بعد وہ
بڑے آرام سے مجھے چھوڑ کر ٹیلے کی ڈھلان پر نیچے اترنے لگا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

ہی طرف سے وہ مجھے بتا گیا تھا کہ آگے مجھے کس طرف جانا ہے اور میری کچھ سمجھ میں نہیں
آیا تھا کہ آگے مجھے کس طرف جانا ہے۔ اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ آگے جاپانیوں کا خطرہ نہیں
ھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو بوڑھا برمی مجھے چھوڑ کر نہ جاتا' لیکن معاملہ اس کے الٹ بھی ہو
سکتا تھا۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا سامنے نشیب میں دور تک پھیلے میدان کو تکتا رہا۔ پھر اٹھا اور
للہ کا نام لے کر چلنا شروع کر دیا۔

میرا کام اس وقت صرف چلنا تھا۔

چلتے چلتے کہاں کہاں سے گزرا؟ کیسے کیسے گھاس کے میدان آئے۔ پتھریلے
یدان آئے' جہاں نوکیلی چٹانیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کئی کئی سو گز لمبی پتھروں کی
لیں آئیں جو تر چھی ہو کر زمین پر لیٹی ہوئی تھیں اور جن کی تاریک تہوں سے پانی ٹپک
ہا تھا۔ جنگل آئے جن کے درختوں کی چھتریاں آسمان تک چلی گئی تھیں۔ کہیں کوئی
ھونپڑیوں والا چھوٹا سا گاؤں آ جاتا۔ نیم عریاں جنگلی مرد اور عورتیں اور ان کے بچے باہر
ل کر مجھے حیرت سے دیکھتے۔ ان سے مجھے تھوڑا بہت کھانے کو مل جاتا۔ میرا لباس گندا ہو
کر جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مجھ میں اور جنگلی آدمیوں میں تھوڑا سا فرق ہی رہ گیا تھا۔ جس
ردھوپ کی گرمی سے میرا رنگ گہرا سانولا ہو گیا تھا۔ پاؤں چلتے چلتے سوج گئے تھے۔
تے کا ایک پاؤں پھٹ گیا تھا۔ میں نے کرتے کی لیر پھاڑ کر اس کو پاؤں کے ساتھ
ندھ دیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی کم نہیں تھی کہ میں زندہ بچ گیا تھا۔ کسی سانپ نے مجھے
ٹا نہیں تھا۔ راستے میں کسی قاتل ڈاکو سے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ قسمت میں ابھی زندہ
ہنا تھا اس لئے زندہ تھا۔ آخر رنگون سے نکلتے ہوئے مہاجروں کا ایک چھوٹا سا قافلہ مل
یا۔ قافلے میں بوڑھے، عورتیں اور بچے بیل گاڑیوں میں سفر کر رہے تھے۔ مجھ میں چلنے کی
ت نہیں تھی۔ ایک مسلمان سورتی میمن نے مجھے گاڑی پر بٹھا دیا۔ دو راتوں اور دو دنوں
ے سفر کے بعد یہ قافلہ بنگال کے سرحدی شہر کا کسز بازار پہنچ گیا۔ یہاں سے تمام مہاجرین
و ٹرکوں اور لاریوں میں بٹھا کر چٹاگانگ پہنچایا گیا۔ چٹاگانگ میں تین چار انگریز افسر
ہاجرین کی خود نگہداشت کر رہے تھے۔ یہاں بہت بڑا کیمپ لگا دیا گیا تھا۔ یہاں مہاجرین

کے لئے کھانے پینے کو بہت کچھ تھا۔ چٹاگانگ سے ریل گاڑیوں کے ذریعے مہاجرین
کلکتے کے سٹیشن ہوڑہ پہنچایا جا رہا تھا جہاں سے ریل گاڑیاں مہاجرین کو لے کر ہندوستا
کے مختلف شہروں کو جاتی تھیں اور مہاجرین کو ان کی منزل تک پہنچاتی تھیں۔ نارتھ ویسٹر
ریلوے نے کرایہ معاف کر دیا ہوا تھا۔ مہاجرین جس شہر تک چاہیں بغیر ٹکٹ سفر کر سکتے
تھے۔

میں بھی ایک ٹرین میں بیٹھ کر اپنے شہر امرتسر پہنچ گیا۔ بھائی جان کیپٹن ملک
ہمشیرہ صاحبہ کب امرتسر پہنچیں اور کس حال میں پہنچیں اور راستے میں انہیں کیسی کیسی تکلیف
برداشت کرنی پڑیں یہ ایک الگ داستان ہے۔ امرتسر کی آب و ہوا نے مجھے پھر سے زند
دیا۔ صحت مند کر دیا۔ اس قابل کر دیا کہ میں ایک بار پھر گھر سے بھاگ کر اپنی آ
گردیاں شروع کر سکتا تھا۔ اس بار مجھ پر مس نسیم بانو کے عشق کا بھوت سوار ہو گیا۔ مس
بانو اس زمانے کی مشہور فلم ایکٹریس تھی اور فلم ''میں ہاری'' کی ہیروئن تھی۔ اسے اس
میں دیکھا اور میں اپنا دل ہار بیٹھا۔ بچپن کے عشق شتر بے مہار کی طرح ہوتے ہیں۔ ا
اونٹ کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کس طرف منہ اٹھا کر چل پڑے گا۔ کہاں بیٹھ جائے اور
بیٹھا اٹھ کر کس طرف کو چل پڑے گا۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ پہلی نظر میں عشق ہو گیا۔ نہ
نے یہ سوچا کہ عشق کیا ہے جو مجھ پر سوار ہو گیا ہے اور نہ عشق نے سوچا کہ میں بھوت
کس کے سر پر سوار ہو رہا ہوں۔ میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ بمبئی جا کر مس نسیم کے دربا
محبت کی عرضداشت پیش کی جائے۔ نہ یہ سوچا کہ اتنے بڑے اجنبی شہر میں جا کر
ٹھہروں گا؟ نہ یہ سوچا کہ بمبئی جانے کا کرایہ اور وہاں ٹھہرنے کا خرچ کہاں سے آ
جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ سوچا گھر سے کچھ پیسے چوری کئے جائیں۔ چوری کر
موقع نہ مل سکا۔ شیطان نے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ
صاحب کے کسی دوست سے والد صاحب کا نام لے کر کچھ روپے حاصل کئے جائیں۔
یہ خیال بڑا اچھا لگا۔ ہمارے محلے میں دو بھائی کشمیری شالوں کا کاروبار
تھے۔ ان کے نام شمس دین اور قمر دین تھے۔ ذات ان کی ترنبو تھی۔ قیام پاکستان

دونوں بھائیوں نے انارکلی میں ایک دکان الاٹ کروا کر ترنبو ہاؤس اس کا نام رکھا تھا اور
کشمیری شالوں کا بزنس شروع کر دیا تھا۔ اس وقت دونوں بھائی ہمارے محلے میں کاروبار
کرتے تھے۔ قمر دین ہمارے والد صاحب کا بڑا دوست تھا۔ میں نے اس سے فراڈ کرنے
کا فیصلہ کر لیا چنانچہ جس روز مجھے امرتسر سے بمبئی بھاگ کر جانا تھا اس روز دن کے آٹھ بجے
کے قریب میں قمر دین کے گھر گیا۔ اس وقت قمر دین مسواک کر رہا تھا۔ میں نے سلام کیا
اور کہا۔

''اباجی کے پاس کچھ کاروباری آدمی بیٹھے ہوئے ہیں وہ انہیں کچھ رقم دے رہے
تھے کہ سو روپیہ کم پڑ گیا ہے۔ انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ باؤ قمر دین صاحب سے جا کر سو
روپیہ لے آؤ۔''

قمر دین بڑا سادہ دل انسان تھا۔ اس نے بھی کچھ سوچے سمجھے بغیر الماری میں
سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دے دیا۔ میں نوٹ جیب میں ڈال کر قمر دین کے مکان
سے باہر نکلا تو قمر دین کے دل میں خیال آ گیا کہ یہ لڑکا حمید کہیں اپنی طرف سے سو روپیہ
لے کر تو نہیں جا رہا۔ چنانچہ وہ کچھ فاصلہ رکھ کر مسواک کرتا میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں
نے بھی اسے دیکھ لیا کہ یہ شخص میرا پیچھا کر رہا ہے کہ دیکھتا ہوں سو روپیہ اپنے والد صاحب
کو جا کر دیتا ہے یا نہیں۔ میں نے سو روپے کا نوٹ لے کر اپنے والد صاحب کے پاس تو
جانا نہیں تھا۔ قمر دین کو اپنا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ نسیم بانو کے عشق نے
جہاں میری عقل پر پردہ ڈال دیا ہوا تھا۔ وہاں میرے اندر ایک طاقت بھی بھر دی تھی۔

جس بازار سے میں آہستہ آہستہ اپنی طرف سے بڑی بے فکری کے ساتھ گزر رہا
تھا وہ ہماری گلی کے عقب میں واقع تھا اور اسے چیل منڈی کہتے تھے کیونکہ یہاں چیڑھ کے
درختوں کے شہتیر فروخت ہوتے تھے اور پنجابی میں چیڑھ کو چیل کہتے ہیں۔

◆......◆......◆

آگے جا کر بازار کی شاخیں ہو جاتی تھیں۔ ایک شاخ دائیں جانب ہمار
والد صاحب کے پاس جاتی تھی اور دوسری شاخ پیلے ہسپتال کی طرف جاتی تھی۔ بازار
دوراہے پر آکر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ قمر دین برابر میرا تعاقب کر رہا تھا۔ بس پتہ
مجھے کیا ہوا کہ میں نے وہیں سے چھوٹ لگائی اور جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑتا ہوا پیلے ہسپ
کے آگے سے ہوتا ہوا مہان سنگھ کے دروازے سے باہر آکر شریف پورے والی سڑک
دوڑنے لگا۔ مجھے یاد ہے میری قمیص کی جیب میں بڑی خوبصورت پنسل تھی جو اچھل کر
گر پڑی مگر میں اسے اٹھانے کے لئے بالکل نہ رکا۔

میں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ قمر دین بھی میرے پیچھے دوڑ پڑا ہے یا نہیں۔ دوڑ
دوڑتے میں جی ٹی روڈ پر آگیا اور شریف پورے کے سامنے سے ہوتا ہوا مسلم ہائی سک
سے بھی آگے نکل کر نندہ بس سروس کے اڈے پر آگیا۔ رک کر پیچھے دیکھا۔ قمر دین
پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ نندہ بس سروس کے اڈے سے لاہور کو لاریاں چلا کرتی تھیں۔

لاہور میں کراؤن بس سروس اور امرتسر میں نندہ بس سروس اس زمانے کی
مشہور بس سروسز تھیں۔ امرتسر میں اس کے مقابلے میں امرتسر پٹھان کوٹ بس سروس
مسلمانوں کی بس سروس تھی۔ ان کی لاریاں امرتسر سے پٹھان کوٹ، ڈلہوزی اور سرینگ
طرف چلا کرتی تھیں۔ اس بس سروس کو ایک سوسائٹی چلاتی تھی جس میں ہمارے محلے
حاجی حسن کی دو لاریاں تھیں۔

حاجی صاحب کا مکان چیل منڈی میں تھا۔ حاجی صاحب کی بیوی کو ہم آپو جی

کرتے تھے۔ سرخ و سپید بڑے باوقار چہرے والی خاتون تھیں۔ ان کے ساتھ ایک المیہ ہو
گیا۔ ان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام اختر تھا۔ اختر بڑا خوبصورت گورا چٹا کشمیری لڑکا تھا۔ اس
کی عمر ابھی کوئی آٹھ دس سال کی ہوگی کہ جی ٹی روڈ پر ایک لاری کے نیچے آکر اللہ کو پیارا ہو
گیا۔ اس کے ماتھے پر ایک سرخ لاٹ ہوا کرتی تھی جس کو بعض لوگ منحوس اور بعض بڑی
خوش نصیبی کی علامت کہا کرتے تھے۔ اختر کی موت کے صدمے سے آپو جی ذہنی توازن کھو
بیٹھیں۔ میں نے اس جلالی چہرے والی باوقار کشمیری خاتون کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔
سفید برقعہ پہنے، برقعے کا نقاب الٹے، محلے کی گلیوں بازاروں میں پھرا کرتی تھیں اور ہر
ب سے پوچھتی تھیں کہ۔

"وے تو میرا اختر تو تم نے نہیں دیکھا؟"

حاجی حسن صاحب گرمیوں میں اپنی لاری محلے میں لا کر کھڑی کر دیتے اور محلے
کے لوگ اس میں سوار ہو جاتے۔ کوئی روغنی روٹیاں لگوا کر اور کوئی آلو گوشت کی دیگ پکوا کر
کوئی لنگڑے آموں کی ٹوکریاں موٹر میں رکھوا لیتا اور حاجی حسن خود لاری چلاتے۔ بڑی
ر جسے ہم بجلی والی نہر کہا کرتے تھے پر لے جاتے اور وہاں سارا دن باغ کی سیر ہوتی۔

بڑے لوگ بڑی نہر میں نہاتے۔ ہم چھوٹی نہر یعنی سوئے میں پل پر سے
لانگیں لگاتے تھے۔ میں بھی اپنے پہلوان والد صاحب کے ساتھ نہر پر باغ کی سیر کرنے
تا تھا۔ ایک دفعہ ہمارے سب گھر والے لاری میں بیٹھے تھے۔ والد صاحب سائیکل پر
ی کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ وہ اتنی زور سے سائیکل چلاتے کہ آگے بڑھ کر چلتی لاری
ے پچھلے دروازے سے لٹکتی ہوئی رسی کو پکڑ لیتے اور پھر سرکس کے کرتب دکھانے والوں کی
رح ایک ہاتھ چھوڑ دیتے اور سائیکل اپنے آپ لاری کی رفتار کے ساتھ پیچھے پیچھے آتی
ا۔

والد صاحب کا بدن بڑا خوبصورت اور باڈی بلڈروں کی طرح تھا۔ بڑی نہر کے
ارے آم کے درختوں کے نیچے دریاں بچھ جاتیں۔ آموں کی ٹوکریاں رسیوں سے
ھ کر نہر کے ٹھنڈے پانی میں لٹکا دی جاتیں۔ والد صاحب بڑی نہر کے جی ٹی روڈ

والے پل سے نہر میں چھلانگیں لگاتے اور پھر بہاؤ کے مخالف تیرتے ہوئے دور بڑے
پل تک نکل جاتے اور اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے تیرتے ہوئے واپس آتے۔
بار میں نے بڑی نہر کے کنارے ایک سکھ کی لاش دیکھی۔ اس کی آدھی گردن کٹی ہوئی
لاش کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ پولیس نے لاش کو نہر سے نکال کر آم کے ایک درخت
ساتھ ٹیک لگا کر رکھا ہوا تھا اور ایک سپاہی لاش کی تصویریں اتار رہا تھا۔

میں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ چھوٹی نہر کے چھوٹے پل اور پل کے مینا
اوپر سے چھلانگیں لگاتا تھا اور نہر میں تیرتا ہوا آگے چلا جاتا۔ جہاں نہر کی دونوں
ناشپاتیوں کے چمکیلے پتوں والے درخت ہی درخت ہوتے تھے۔ میرے خدا! کیا
تھے۔ کیا رنگ تھا ان کا۔ دھوپ میں جب ہوا چلتی تو پتے جھل مل جھل مل کرتے تھے
درختوں کی شاخوں پر چھوٹی اور بڑی لمبوتری سبز سبز ناشپاتیاں لگی ہوتی تھیں۔

ناشپاتی کے یہ باغ نہر کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلے گئے تھے۔ لوگ
ہیں کہ یہ نہر اور اس کے درخت آگے کمپنی باغ کی طرف نکل جاتے ہیں مگر میں یہ سمجھ
تھا کہ یہ نہر اور اس کے درخت بہشت بریں کے کسی باغ کی طرف جاتے ہیں جس کا
سوائے ان درختوں اور اس نہر کے اور کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔

خدا جانے کیا یاد آ گیا کہ میں نندہ بس کے لاریوں کے اڈے سے امرتسر کی
نہر اور ناشپاتیوں اور آموں کے باغ کی طرف نکل آیا۔ جہاں برسات کی بھیگی ہوئی ر
میں کوئلیں بولا کرتی تھیں اور اس زمانے کی راتیں اتنی خاموش ہوتی تھیں کہ ان کوئلو
آواز ہمارے مکان کی چھت تک سنائی دیا کرتی تھیں۔ خواب کی دنیا سے نکل کر وہ
اور باغ امرتسر کی سرزمین پر آئے تھے اور مسلمانوں کے وہاں سے ہجرت کر کے آ
بعد واپس خواب کی دنیا میں چلے گئے تھے۔

میں نندہ بس سروس کے اڈے پر واپس آتا ہوں۔ میں گھر سے بھاگ کر
سو روپے چوری کر کے بمبئی جا رہا تھا۔ سو روپے کا چرایا ہوا نوٹ میری جیب میں تھا۔
دین میرے پیچھے نہ لگتا تو میں وہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن جاتا اور ساڑھے نو بجے

میل میں سوار ہو کر سیدھا بمبئی کی طرف بھاگ جاتا لیکن قمر دین صاحب نے میرا
چھا کر کے مجھے بے راہ کر دیا۔ نندہ بس کے اڈے پر لاہور جانے والی لاری بالکل تیار تھی۔
ری مسافروں سے بھر چکی تھی اور آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی اور ایک آدمی بس کے پیچھے لٹکا
آواز لگا رہا تھا۔

"چلو کوئی سواری لاہور۔"

اس زمانے میں لاریوں کی سیٹیں آمنے سامنے ہوا کرتی تھیں اور دروازے
ریوں کے پیچھے ہوا کرتے تھے میں دوڑ کر لاری کے دروازے کو پکڑنے لگا تو آوازیں
انے والے آدمی نے کہا۔

"اوئے منڈیا! آگے چلا جا آگے۔"

لاری کا ایک چھوٹا سا دروازہ آگے بھی تھا۔ اس طرف ایک لڑکے کے بیٹھنے کی
گنجائش تھی۔ میں جلدی سے لاری میں داخل ہو گیا۔ آوازیں لگانے والے آدمی نے زور
سے لاری کی دیوار پر ہاتھ مار کر کہا۔

"چلو استاد جی۔"

اور لاری جی ٹی روڈ پر آ کر ریل کے بڑے پل پر چڑھنے لگی۔ کلینر لاری کے
در کھڑا ان مسافروں کے ٹکٹ کاٹ رہا تھا جو جلدی میں سوار کروا لئے گئے تھے اور جنہوں
نے ٹکٹ نہیں خریدا تھا۔ کلینر نے میرے قریب آ کر پوچھا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"لاہور"

پتہ نہیں اس نے چھ آنے کہا کہ آٹھ آنے۔ نکالو کہا۔ میں نے جیب سے سو
روپے کا نوٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیا تو وہ بولا۔

"لاہور چل کے پیسے دے دینا۔"

اس زمانے میں سو روپے کا نوٹ بہت بڑا نوٹ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی مالیت

میرے خیال میں آج کے کم از کم چار ہزار روپے کے برابر تھی۔ یہ سو روپے بمبئی میں
سے ختم نہیں ہو رہے تھے حالانکہ میں روز کے تین فلم شو دیکھتا تھا اور کیونڈر کے سگریٹ
تھا جو اس زمانے میں بڑے مہنگے سمجھے جاتے تھے۔

لاری لاہور پہنچ کر لاہوری دروازے کے باہر ٹھہر گئی۔ جہاں آج کل سیالکوٹ
جانے والی ویگنوں کا اڈا ہے۔ اس وقت نندہ بس سروس کا اڈہ اسی جگہ ہوا کرتا تھا۔ اڈے
مجھ سے سو روپے کا نوٹ لے کر مجھے چھ یا سات آنے کا ٹکٹ دے دیا گیا اور باقی
روپے کا سارے کا سارا چینج دیا گیا جو میں نے اپنے کوٹ کی اندر والی جیب میں ڈال لیا
اس بھان یا چینج میں چاندی کے روپے روپے کے سکے بھی تھے اور اٹھنیاں چونیاں
تھیں۔

بڑا اچھا زمانہ تھا۔ نہ کسی نے میری جیب کاٹی' نہ دھوکا دے کر مجھ سے رو
چھینے۔ میری عمر کوئی زیادہ نہیں تھی یہی تیرہ چودہ سال کی ہو گی۔ میں نے ٹھنڈے کپڑ
کوٹ پاجامہ اور چپل پہنی ہوئی تھی۔ میرے کوٹ کی اندر والی جیب روپوں سے' اٹھنی
چونیوں سے بھر گئی تھی اور ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ میں اس طرح لوہاری دروازے
داخل ہو کر شہر کے اندر سے ہوتا ہوا مستی گیٹ کی طرف نکل آیا۔

ان دنوں میری سب سے بڑی ہمشیرہ مستی گیٹ میں رہا کرتی تھیں۔ ان
تین منزلہ مکان کے باہر والے رخ پر لکڑی کے بستے لگے ہوئے تھے اور مکان کا چھجہ
جھکا ہوا تھا۔ مکان کے نیچے تانبے کے برتن بنانے والوں کا طویلہ تھا جہاں سارا
ٹھٹھیارے تانبا کوٹتے یا اڈوں پر تانبے کے بڑے بڑے پتیلے لگائے لوہے کی ہتھوڑی
ان کو کوٹ کوٹ کر ان پر سفید نشان ڈالتے رہتے تھے اور ان کا بڑا شور ہوتا تھا۔
اندھیری سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں آیا تو بڑی آپا نے سب سے پہلا جو سوال
وہ یہ تھا۔

"وے آپو جی کو بتا کر آیا ہے کہ گھر سے بھاگ کر آیا ہے؟"

مجھے یہ سوال بڑا برا لگا۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ مہ

پاس بڑے پیسے تھے۔ لوہاری دروازے آ کر سوڈا واٹر کی ونٹو کی بوتل پی جو اس زمانے کی
بڑی اعلیٰ بوتل ہوا کرتی تھی۔ کیونڈر کے سگریٹ کی ایک ڈبی لی۔ ایک بنارسی پان کھایا اور
سگریٹ کے کش لگاتا بھاٹی دروازے آ گیا۔ وہیں میں ادھر ادھر دوپہر تک گھومتا پھرتا رہا۔
یہاں ایک ہندو کی فالودے کی دکان ہوا کرتی تھی۔ وہاں فالودہ پیا۔ خدا جانے دوپہر کا
کھانا کہاں کھایا۔ کھایا بھی یا نہیں۔ مجھے اس عمر کی آوارہ گردیوں میں اس بات کی بالکل فکر
نہیں ہوتی تھی کہ میں کھانا وغیرہ کہاں سے کھاؤں گا۔ مجھے اور سب کچھ یاد ہے لیکن یقین
کریں یہ بالکل یاد نہیں ہے کہ میں نے دوپہر کا کھانا کہاں اور رات کا کھانا کہاں کھایا تھا۔
یہ ضرور یاد ہے کہ مجھے ایک بار پردیس میں دو دن کا فاقہ آ گیا تھا اور نانی یاد آ گئی تھی۔

دوپہر کو بھاٹی کے ایک سینما ہاؤس میں کوئی فلم دیکھی۔ اس کے بعد ایک بار پھر
بڑی آپا کے گھر آ گیا۔ میں نے انہیں یہ تو نہ بتایا کہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں اور میں یہ
پیسے گھر سے چرا کر لایا ہوں مگر یہ ضرور بتا دیا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں۔ بڑی آپا نے مجھ پر
بڑا غصہ اتارا۔ یہی کہتی رہیں کہ کم از کم آپو جی (والدہ) کو تو بتا کر آتے۔ میں نے کہا۔

"آپ انہیں بتا دیں۔ میں تو جا رہا ہوں۔"

مجھ یاد ہے بڑی آپا نے مجھے دو گھوڑا بوسکی کی ایک قمیص پہننے کو دی' جو میں نے
وہیں پہن لی اور اتری ہوئی ٹوئیل کی قمیص وہیں چھوڑ دی۔ کیا دو گھوڑا بوسکی ہوا کرتی تھی۔
اب نہ وہ دو گھوڑے ہیں نہ بوسکیاں ہیں۔ بوسکیاں ختم ہو گئی ہیں اور پیچھے صرف گھوڑے ہی
گھوڑے رہ گئے ہیں۔

وہاں سے میں سیدھا لاہور ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ پشاور سے بمبئی جانے والی
فرنٹیئر میل جہاں تک مجھے یاد ہے رات کے آٹھ یا نو بجے کے درمیان چلا کرتی تھی۔ بڑی
بورژوا قسم کی گاڑی تھی۔ اس میں تھرڈ کلاس نہیں ہوتی تھی۔ انٹر کلاس' فسٹ کلاس اور سیکنڈ
کلاس ہوتی تھی۔ ایک ایئر کنڈیشنڈ بوگی ہوتی تھی جس کے قریب بھی لوگ نہیں جاتے تھے۔
بوگس کے گہرے رنگ کے سبز شیشوں میں سے انگریزوں اور ان کی میموں کے دھندلے
دھندلے چہرے نظر آیا کرتے تھے۔

میں نے لاہور سے بمبئی تک انٹر کلاس کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ فرنٹیئر میل چھک کرتی بڑی شان اور وقار کے ساتھ پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور رک گئی۔ تھرڈ کلا ہونے کی وجہ سے اس ٹرین میں بہت کم مسافر سفر کیا کرتے تھے۔ ایک بات اور بھی اس گاڑی میں دو تین روپے سے کم سفر کے ٹکٹ نہیں ملتا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی ایک عجیب رعب اور وقار ہوا کرتا تھا فرنٹیئر میل کا۔ لوگ پلیٹ فارم پر زور کھڑے ہو ٹرین کو دیکھا کرتے تھے۔

لاہور سے امرتسر 35 میل کا فاصلہ تھا۔ فرنٹیئر میل وقت پر آتی تھی اور وق چلا کرتی تھی۔ لاہور سے روانہ ہوئی تو ریلوے یارڈ سے نکلتے ہی اس نے سپیڈ پکڑ امرتسر لاہور سے واہگہ، جلو، گورو سر، ستلانی، اٹاری، خاصہ، چھڑ ہرٹہ سب سٹیشن چھوڑتی امرتسر جا کر رکی۔ امرتسر یہ ٹرین دس پندرہ منٹ ہی ٹھہرتی تھی۔ امرتسر کا سٹیشن آتے ہی کمپارٹمنٹ کے باتھ روم میں چھپ گیا۔

میں جب بھی گھر سے بھاگتا تھا تو والد صاحب اپنے شاگرد پہلوان جوان خاص جاسوس تھے چھوڑ دیا کرتے تھے جو لاریوں کے اڈے، جی ٹی روڈ اور ریلوے اور کمپنی باغ میں مجھے تلاش کرنا شروع کر دیتے تھے۔ ان میں بودی نام کا جاسوس بڑا تج کار تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ والد صاحب کے ایک دو جاسوس پلیٹ فارم پر ضرور موجود ہوں جو انٹر کلاس کے ڈبوں میں جھانک کر مجھے دیکھتے پھر رہے ہوں گے۔

ایک بار میں اپنے چھوٹے آرٹسٹ بھائی مقصود کے ساتھ امرت ٹاکیز میں طائی کا آخری شو دیکھنے چلا گیا۔ میں اور مقصود تھرڈ کلاس میں ایک بنچ پر بیٹھے تھے۔ ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک آدمی لوگوں کے جھک کر چہرے دیکھتا ہمارے سامنے آ گیا والد صاحب کا جاسوس بودی تھا۔ اس نے ہمیں پہچان لیا۔ کہنے لگا۔

”چلو بھئی سودے میدے۔ باہر آ جاؤ۔“ اور وہ ہم دونوں کو کان سے پکڑ کر ہال سے باہر لے آیا۔ باہر والد صاحب کو چوانوں والا سینکا لے کر ہمارے استقبال کو کھڑ تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے ہم پر سینٹے برسانے شروع کر دیئے۔ میں اسی وجہ سے

کمپارٹمنٹ کے باتھ روم میں چھپ گیا تھا۔

جب ٹرین چلی اور شریف پورے سے بھی آگے نکل گئی تو میں باتھ روم سے باہر آ گیا۔ مجھے اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ میں ٹرین میں رات کے وقت کمپنی باغ والے ریلوے پھاٹک کو تیزی سے پیچھے جاتے نہیں دیکھ سکا اور رات کے وقت کمپنی باغ کے درختوں پھولوں اور سبزے کی ٹھنڈی خوشبو سے محروم رہا۔ رات کے وقت کمپنی باغ کے سبزے، پھولوں، درختوں اور امرودوں اور آموں کی ملی جلی ٹھنڈی خوشبو آیا کرتی تھی۔ دن کے وقت کمپنی باغ کا پھاٹک گزرتا تو ٹرین میں کمپنی باغ کے مغلیہ طرز کے دروازے کی چھتی ہوئی ڈیوڑھی دور سے نظر آتی۔ اس ڈیوڑھی کی ایک جانب باغ کی چھوٹی سی نکڑی آگے ریالٹو سینما کی طرف نکل جاتی تھی اور دوسری سڑک لوکاٹ کے باغوں میں سے ہوتی ہوئی آگے لیڈیز پردہ کلب اور اس کے آگے چھوٹی نہر کو چلی جاتی تھی۔

سڑک کی دونوں جانب لوکاٹ کے باغ تھے جن میں دن کے وقت ہی ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ فرنٹیئر میل نے پوری رفتار پکڑ لی تھی۔ یہ بڑی تیز رفتار ٹرین ہوا کرتی تھی۔ سٹیشن پر سٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ جالندھر جا کر رکی۔ چند منٹ ٹھہری اور آگے چل پڑی۔ لدھیانہ آ گیا۔ لدھیانے کے مردم خیز شہر نے کیسے کیسے علمائے دین، مسلمان سیاست دان، علم و ادب کے درخشاں ستارے پیدا کئے۔ اس شہر پر مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی گہری چھاپ تھی۔ تجارت کے میدان میں بھی یہاں کے مسلمان تاجر کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ تعمیر پاکستان میں لدھیانے کے مسلمانوں کے کارنامے پاکستان کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جائیں گے۔ پاکستان کے لئے لدھیانے کے مسلمانوں نے بھی بے بہا اور بے مثال قربانیاں دی ہیں۔

دن کا اجالا پھیل رہا تھا جب ٹرین میرٹھ پہنچی۔

میرٹھ شہر اور میرٹھ چھاؤنی دونوں کے سٹیشن مجھے بڑے اچھے لگتے تھے۔ اس لائن پر بعد میں جب بھی میں نے سفر کیا میں ان سٹیشنوں کے پلیٹ فارم پر اتر کر ضرور سیر کرتا تھا۔ صاف ستھرے پلیٹ فارم ہوا کرتے تھے۔ اس سے پہلے انبالے کا سٹیشن آتا تھا اور

انبالہ شہر اور انبالہ کینٹ کے سٹیشن بھی مجھے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہاں میر
پیارا دوست اور خوبصورت شاعر ناصر کاظمی رہتا تھا جس نے مجھے دس بارہ سال بعد لاہو
کے پاک ٹی ہاؤس میں آ کر ملنا تھا۔

عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ۔ انبالہ کینٹ کے سٹیشن کا پلیٹ فا
میرٹھ شہر کے سٹیشن کے پلیٹ فارم سے زیادہ صاف ستھرا اور چمکیلا ہوا کرتا تھا۔ میرٹھ کینٹ
اور انبالہ کینٹ دونوں ہی برٹش انڈین آرمی کی بڑی اہم چھاؤنیاں تھیں۔ اور یہاں فرنٹیئر
میل ضرور کھڑی ہوتی تھی۔ سات سال بعد میں نے اسی انبالہ شہر کے پلیٹ فارم پر اگس
1947ء میں برقعہ پوش مسلمان خواتین کے ایک ہجوم کو دیکھا تھا جو پاکستان جانے کے
لئے اپنے بال بچوں کو لئے سہمی ہوئی بیٹھی تھیں اور ان کے پیچھے پلیٹ فارم کے گیٹ پر سک
تلواریں اور نیزے لئے ست سری اکال کے نعرے لگا رہے تھے۔

◆......◆......◆

خدا جانے یہ خواتین پاکستان پہنچ بھی سکی تھیں یا نہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت حالات بالکل نارمل تھے۔ فرنٹیئر میل میرٹھ سے نکل کر دلی کی طرف روانہ ہوئی تو اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک کتا زور زور سے بھونکتا کچھ دور تک ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔ پھر تھک کر پیچھے مڑ گیا۔ دلی شہر کے مکانات اور کارخانے وغیرہ ریلوے سٹیشن آنے سے بہت پہلے شروع ہو گئے تھے۔ پھر ٹرین دریائے جمنا کے بہت بڑے پل پر سے گزر گئی۔

دلی شہر میرا دیکھا ہوا شہر تھا۔ ایک بار پہلے رنگون جاتے ہوئے میں یہاں آیا تھا اور بھائی جان کے ساتھ مشہور شاعر ن م راشد صاحب کے ہاں تین چار دن رہا تھا۔ اس زمانے میں دلی شہر کی آبادی اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ پلیٹ فارم پر بہت کم لوگ نظر آ رہے تھے۔

ویسے بھی فرنٹیئر میل پر صرف لمبے سفر والے مسافر دکھائی دیتے تھے۔ اترنے والے مسافر زیادہ ہوتے تھے۔ میرے پاس کافی پیسے تھے۔ میں نے پلیٹ فارم پر اتر کر ایک فلمی رسالہ خریدا۔ پلیئرز نیوی کٹ کے پچاس سگریٹوں والا ایک چوڑا بہت خوبصورت ڈبہ خریدا۔ اسے کھولا تو اندر مخمل کے سرخ بستر پر سفید سگریٹ ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔

مجھے ایسا لگا جیسے کسی ہسپتال کی نرسیں سو رہی ہوں۔ ابھی سگریٹوں کے پیچھے فلٹر لگنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ ایک احمد آبادی پان کھایا اور سگریٹ سلگا کر اپنے ڈبے میں آ کر بیٹھ گیا۔

اب مجھے والد صاحب کے کسی جاسوس کا ڈر نہیں تھا اور بڑی بے فکری سے سفر کر رہا تھا۔ فرنٹیئر میل دلی سے بمبئی تک بیبے بڑودہ ریلوے ٹریک پر سفر کرتی تھی۔ اسے بی بی اینڈ سی آئی کہا جاتا تھا۔ یہ وسطی ہند کا سفر تھا۔

اس ریلوے لائن پر یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اس کے بعد اس ریلوے لائن پر اتنے سفر کئے کہ یہاں کے ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے درخت تک مجھے یاد ہو گئے تھے۔ اور یہاں کے جنگلوں کی بھی دربدری کرتا رہا تھا لیکن اس وقت میں پہلی بار اس ریلوے لائن پر سفر کر رہا تھا۔ دلی سے آگے متھرا شہر آیا۔

جھانسی، گوالیار بھوپال کا تاریخی شہر آیا۔ یہ سارا علاقہ وسطی ہندوستان کا جنگلاتی اور نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دونوں طرف جنگل ہی جنگل تھے۔ راستے میں بارش بھی شروع ہو گئی۔ اس بارش نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ یہ جنگلوں کی بارش تھی۔ قدرت نے بارش پیدا ہی جنگلوں کے لئے کی ہے اور جنگل بارشوں کیلئے بنائے ہیں۔

جنگل اور بارش دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بارش کی بوچھاڑیں ٹرین کی کھلی کھڑکیوں میں سے اندر ڈبے میں آنے لگیں۔ میں ایک کھڑکی کے پاس بیٹھا جنگل اور بارش اور بارش اور جنگل کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی لگتا کہ جنگل ہی جنگل ہے۔ کبھی لگتا کہ بارش ہی بارش ہے اور کہیں کچھ بھی نہیں ہے اور یہ دنیا کی پہلی بارشیں ہیں جو ایک لاکھ سال سے برس رہی ہیں اور لاکھوں سال تک برستی رہیں گی۔ کسی مسافر کی آواز آئی۔

"کھڑکیاں بند کر دو بھائی۔ بارش اندر آ رہی ہے۔"

مجھے یہ فقرہ بڑا اچھا لگا۔ بارش اندر آ رہی ہے۔ بارش! بارش! تو بادلوں کے دیس سے آئی ہے۔ تو بادلوں کے دیس کو واپس چلی جائے گی۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتی جا تیرے جانے کے بعد سورج نکلے گا تو درختوں کے دھلے ہوئے پاک صاف پتے اور گلا اور ہری ہری کونپلیں دھوپ میں روشن ہو جائیں گی اور گل مہر اور گلاب کے پھولوں تیرے قطرے سنہری دھوپ میں موتی بن کر چمکیں گے۔ "کھڑکی بند کر دو۔ بارش اند رہی ہے۔" کسی مسافر نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر وہ کھڑکی بھی بند کر دی جہاں سے

بارش کی طرف اور بارش میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ یاد نہیں دو دن کا سفر تھا کہ تین دن کا سفر تھا۔ دن نکل آیا تھا کہ پتہ چلا بمبئی شہر آ رہا ہے۔

اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ ست پڑا کی پہاڑیوں کے جنگل ہیں اور یہاں گرمیوں میں بڑی بارشیں ہوتی ہیں۔ کلیان سٹیشن آیا تو ریلوے ٹریک کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہاں ٹرین کے پیچھے بھی ایک انجن لگ گیا۔ ٹرین کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک ٹرین چڑھائی چڑھتی رہی۔ اس کے بعد کسی سٹیشن پر پہنچ کر ٹرین کا پچھلا انجن الگ کر دیا گیا اور اترائی شروع ہو گئی۔

ٹرین اس قدر تیز رفتاری سے جا رہی تھی کہ درخت سائیں سائیں کرتے ٹرین کے قریب سے گزر جاتے تھے۔ اترائی ختم ہوئی تو بارش دوبارہ شروع ہو گئی۔ لیکن یہ بارش اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اس کی بوچھاڑ ٹرین کے ڈبوں میں آتی۔ چنانچہ میری کھلی کھڑکی کسی نے بند نہ کی اور میں اور بارش کھڑکی میں سے ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکراتے اور باتیں کرتے رہے۔

آخر بمبئی شہر کے لوکل سٹیشن شروع ہو گئے اور پھر فرنٹیئر میل بیبے سنٹرل کے بہت بڑے سٹیشن میں داخل ہو کر رک گئی۔ یہ سٹیشن ٹرمینل بھی تھا یعنی یہاں سے آگے کی طرف ریل گاڑی نہیں جاتی تھی۔ اس وقت بارش تھم گئی تھی۔ بڑا کشادہ اور لمبا پلیٹ فارم تھا۔ ہمارے ٹکٹ دو تین سٹیشن پہلے ہی ایک ٹی ٹی نے ڈبے میں داخل ہو کر چیک کر لئے تھے چنانچہ پلیٹ فارم پر کوئی چیکنگ گیٹ نہیں تھا۔ بس ایک طرف ٹرین کھڑی تھی اور دوسری طرف شہر کی سڑک تھی جہاں وکٹوریہ یعنی گھوڑا گاڑیاں اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ کسی نے ٹکٹ کا نہ پوچھا۔

پلیٹ فارم پر ہوٹلوں کے ایجنٹ مسافروں کو اپنے اپنے ہوٹل کا کارڈ دکھا کر انہیں اپنے ہوٹل میں لے جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ میرے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ بس تین کپڑوں میں تھا لیکن کوٹ کی جیب چاندی کے روپوں سے آدھی بھری ہوئی تھی۔ ایک سانولا سا آدمی میرے پاس آ کر بولا۔

"بابو! میرے ساتھ آ جاؤ۔ جہاں جانا ہے پہنچا دوں گا۔"

میں نے سوچا کہ کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ اس نے سرخ ترکی ٹوپی پہن رکھی اور جسم پر لمبی برساتی تھی۔ میں اس کے ساتھ ہو گیا اور کہا۔

"مجھے میرن ڈرائیو جانا ہے۔"

وہ بولا۔

"بابو جہاں چاہو گے پہنچا دوں گا۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں ہوگا۔"

اور وہ مجھے ایک گھوڑے والی بگھی کے پاس لے آیا۔ میں نے پوچھا۔

"تم ٹیکسی نہیں چلاتے؟"

کوچوان بولا۔

"بابو! وکٹوریہ ٹیکسی سے زیادہ تیز چلتی ہے۔ تم بیٹھ کر تو دیکھو۔"

میں نے سوچا کہ چلو بمبئی کی وکٹوریہ کی بھی سیر کر لیتے ہیں۔ میں بگھی میں بیٹھ گیا۔ ترکی ٹوپی اور برساتی والا کوچوان بگھی کی اونچی سیٹ پر بیٹھ گیا اور میری طرف منہ پھیر کر بولا۔

"بابو! کس طرف چلنا ہے؟"

میں نے مس نسیم بانو کا ایڈریس لاہور کے فلمی رسالے "چترا" ویکلی میں پڑھ کر لکھ لیا تھا۔ میں نے کہا۔

"میرن ڈرائیو چلو۔"

اس نے گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"بابو! میرن ڈرائیو کتنے نمبر پر جائیگا؟"

مس نسیم بانو کے فلیٹ کا نمبر رسالے میں نہیں دیا گیا تھا۔ بس مس نسیم بانو میرن ڈرائیو ہی لکھا تھا۔ میں نے کہا۔

"مس نسیم بانو کے ہاں چلو۔ اس کے فلیٹ کا نمبر معلوم ہے؟"

کوچوان نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ یہ چھوٹی

لڑکا مس نسیم بانو کو کس لئے ملنے جا رہا ہے۔ اس نے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا اور بگھی کھڑی کر دی۔ بولا۔

"بابو! کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"پنجاب سے۔"

وہ بولا۔

"مس نسیم تمہیں جانتی ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں اسے پہلی بار مل رہا ہوں۔"

کوچوان نے بگھی آگے بڑھا دی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں فلمی دنیا کا مارا ہوا ہوں اور نسیم بانو کے عشق میں گرفتار ہو کر اس کے در پر دھونی رمانے جا رہا ہوں۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بابو! نسیم بانو سے مجھے پکار فلم کا ایک پاس لے دینا۔"

ان دنوں بمبئی کے منروا سینما میں سہراب مودی کی مشہور فلم "پکار" دکھائی جا رہی تھی جس میں نسیم بانو نے ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔ میں نے بڑی شان سے جواب دیا۔

"فکر نہ کرو۔ تمہیں چار آدمیوں کا پاس لے دوں گا۔"

یہ میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ مس نسیم بانو مجھے ملنے کی اجازت بھی دیتی ہے یا نہیں۔ وکٹوریہ بگھی بمبئی کے بازاروں میں سے گزرتی ایک ایسی سڑک پر نکل آئی جس کی ایک طرف اونچی اونچی بلڈنگوں کی قطار دور تک چلی گئی تھی اور دوسری طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ کوچوان نے کہا۔

"بابو میرن ڈرائیو آ گیا ہے۔ اب سمجھو مس نسیم کا فلیٹ بھی آ گیا۔ میں نے اس کا فلیٹ دیکھا ہوا ہے۔"

سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا چل رہی تھی جس میں مچھلیوں کی بو محسوس ہوتی

تھی۔ وکٹوریہ ایک اونچی بلڈنگ کے آگے کھڑی ہوگئی۔ کوچوان بولا۔

"وہ سامنے والا فلیٹ مس نسیم کا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم یہیں ٹھہرنا۔ میں جا کر پتہ کرتا ہوں۔"

میں وکٹوریہ سے اتر کر فلیٹ کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ نسیم بانو کا فلیٹ پہلی منزل پر تھا۔ برآمدہ تھا۔ جہاں دیوار پر نسیم بانو کی فریم میں جڑی ہوئی بڑی تصویر لگی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس ایک پٹھان چوکیدار بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کس سے ملنا ہے۔ میں نے کہا۔

"میں نسیم بانو سے ملنا چاہتا ہوں۔"

چوکیدار نے پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"پنجاب سے آیا ہوں۔"

وہ بولا۔

"بیگم صاحبہ تمہیں جانتی ہیں کیا؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں انہیں پہلی بار مل رہا ہوں۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں نسیم بانو کا عاشق نامراد ہوں اور اس کے در پر دیدار کی خیرات مانگنے آیا ہوں۔ اس نے بے رخی سے کہا۔

"وہ سٹوڈیو گئی ہوئی ہیں۔ جاؤ۔"

نسیم بانو سے میرا عشق اسی وقت ہرن ہوگیا اور میرے دل و دماغ سے نکل کر چوکڑیاں بھرتا خدا جانے کدھر غائب ہوگیا۔ میں الٹے پاؤں چل کر بگھی میں آ کر بیٹھ گیا۔ کوچوان نے پوچھا۔

"کیوں بابو! کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔

"مس نسیم سٹوڈیو گئی ہوئی ہیں۔ پھر مل لوں گا۔ واپس چلو۔"

کوچوان وکٹوریہ لوٹ کر واپس چل پڑا۔ واپس چلو تو میں نے اسے کہہ دیا تھا لیکن مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں واپس کہاں جاؤں گا۔ مس نسیم بانو میرے دماغ سے نکل گئی تھی اور اس وقت بمبئی شہر میں گھومنے پھرنے کا شوق دل میں سما گیا تھا۔ کوچوان نے آہستہ آہستہ بگھی چلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"بابو! تمہیں محبوب سٹوڈیو لے چلوں؟ وہاں دوسری کئی ایکٹرسیں بھی ہوں گی۔"

کوچوان بھی سمجھ گیا تھا کہ میں فلمی دنیا کا مارا ہوں اور پنجاب سے بھاگ کر فلم ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو دیکھنے بمبئی آیا ہوں۔ اس زمانے میں پنجاب اور صوبہ سرحد سے نوجوان لڑکے ہیرو بننے کے شوق میں گھروں سے بھاگ کر آ جایا کرتے تھے۔ میں نے کہا۔

"چلو محبوب سٹوڈیو ہی چلو۔"

کوچوان نے بگھی ایک دوسری سڑک پر ڈال دی۔ ہم ایک بازار میں سے گزر رہے تھے کہ میرا چائے پینے کو دل چاہا۔ میں نے کوچوان سے کہا۔

"بگھی ایک طرف روکو۔ میں چائے پیوں گا۔"

وہ بولا۔

"بابو! تم بگھی ہی میں بیٹھو۔ میں تمہارے لئے سامنے والے ایرانی ہوٹل سے چائے لے آتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"اپنے لئے بھی لے آنا۔"

میرے پاس بڑے پیسے تھے۔ کوچوان وکٹوریہ روک کر سامنے والے ایرانی ہوٹل میں گیا اور چائے کا ایک کپ اپنے لئے اور ایک میرے لئے لے آیا۔ وہ میرے سامنے

والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم چائے پینے لگے۔ یہ منظر آج بھی پوری جزئیات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے ہے۔ جیسا کہ میں لکھ رہا ہوں۔ ویسے ہی ہوا تھا۔ وہ چائے پلیٹ ڈال کر پی رہا تھا۔ میں نے بھی تھوڑی چائے پلیٹ یعنی پرچ میں ڈال کر پی اور پھر میں ہی پینے لگا۔ بمبئی کے ایرانی ہوٹلوں میں چائے کے کپ کو چائے کا کوپ کہتے کوچوان نے مجھ سے پہلے چائے کا کوپ خالی کر دیا۔ میں نے جیب سے پلیئرز کی ڈبی نکال کر ایک سگریٹ کوچوان کو دیا اور ایک خود سلگا لیا۔ کوچوان قیمتی سگریٹ سے خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"یہ بڑا اعلیٰ سگریٹ ہے۔ ہم تو چار مینار یا ہاتھی کا سگریٹ پیتے ہیں۔"

بمبئی میں ہاتھی اور چار مینار کے سگریٹ بڑے عام تھے۔ چار مینار بڑا سستا سگریٹ تھا۔ بمبئی میں جب میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے تو میں چار مینار ہی پیتا تھا۔ شاید ایک آنے یا چھ پیسے کی ڈبی آتی تھی۔

کوچوان سمجھ گیا کہ میری کوئی منزل نہیں ہے۔ میں بس فلمی دنیا کی سیر کر رہا ہوں۔ وہ کہنے لگا۔

"بابو! محبوب سٹوڈیو جا کر کیا کرو گے۔ وہاں بھی پٹھان چوکیدار تمہیں اندر نہیں جانے دے گا۔ میں تمہیں ایک جگہ لے چلتا ہوں۔ وہاں فلمی ہیروئن ثریا کا ماموں آتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ مجھے وہیں لے چلو۔"

ظہور صاحب اس زمانے میں پرکاش فلم کمپنی کی مار دھاڑ کی فلموں کے مشہور ولین ہوا کرتے تھے۔ شاید ان کا پورا نام ایس ایم ظہور ہوا کرتا تھا۔ کوچوان بارونق سڑک پر لے آیا جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ لمنگٹن روڈ تھا۔ یہاں کے اشرف صاحب کا آٹو ورکشاپ تھا۔ کوچوان نے بگھی ورکشاپ کے سامنے کھڑی کی اور خود اندر چلا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسلمان کوچوان میرا ہمدرد تھا جس نے

بڑے اجنبی شہر میں دربدر ہونے سے بچا لیا تھا اور مجھے محفوظ ہاتھوں کے حوالے کر دیا تھا۔ کوچوان کی شکل مجھے پوری طرح یاد ہے مگر اس شریف آدمی کا میں نام بھول گیا ہوں۔ اس کا قد لمبا تھا، جوان آدمی تھا، رنگ سانولا تھا اور چہرے پر ماتا کے داغ تھے۔ تھوڑی دیر بعد ورکشاپ سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ پچاس ایک سال کا گھنگریالے بالوں اور تلوار مارکہ مونچھوں والا ایک خوش شکل آدمی بھی تھا۔ یہ آدمی اشرف تھا جو لاہور شہر کے محلہ لوہاری منڈی کا رہنے والا تھا اور فلم ایکٹریس ثریا کا قریبی رشتہ دار تھا۔ ولن ظہور اس ورکشاپ میں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ اشرف صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہہ دیا۔

"لاہور سے آیا ہوں۔"

انہوں نے کہا۔

"سامان کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔

"میرا کوئی سامان نہیں ہے۔"

اشرف صاحب نے کہا۔

"وکٹوریہ والے کو کرایہ دے دو۔ تمہارے پاس پیسے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ ہیں۔"

میں نے کوچوان کو پیسے دیئے جو دس پندرہ روپے بن چکے تھے۔ یہ آج کے زمانے کے سوا ڈیڑھ سو روپے کے برابر تھے۔ کوچوان سلام کر کے چلا گیا۔ اشرف صاحب نے مجھے گیراج میں ایک طرف لوہے کی کرسی پر بٹھا دیا اور پوچھا۔

"بھوک تو نہیں لگی۔"

میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ میں نے ٹرین میں ناشتہ کرلیا تھا۔"

"ہوں۔"

اشرف صاحب نے فکر مند لہجے میں لمبی سی ہوں کہی اور بولے۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں۔"

وہ بولے۔

"بڑی غلطی کی تم نے۔ تمہارے گھر والے اس وقت کتنے پریشان ہوں گے"

میں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اتنا انہیں بتا دیا کہ میں امرتسر سے آیا ہوا ہمارا گھر امرتسر میں ہے۔ وہ بولے۔

"ٹھیک ہے۔ ظہور بھائی تھوڑی دیر میں آئیں گے۔ تم ان کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے چلے جانا۔ تمہارا شوق پورا ہو جائے گا۔"

اشرف صاحب بڑے درد مند اور نیک دل انسان تھے۔ بعد میں پتہ انہوں نے میرے والے وکٹوریہ کے کوچوان کو کہہ رکھا تھا کہ اگر پنجاب سے کوئی ا تمہیں ملے جو فلمی دنیا کے شوق میں گھر سے بھاگ کر آیا ہوا ہو تو اسے میری ورکشا لے آیا کرو۔

اشرف صاحب اس لڑکے سے اس کے گھر کا ایڈریس معلوم کر لیتے تھے کے گھر والوں کو خط پوسٹ کر دیتے تھے کہ آپ کا بیٹا میرے پاس محفوظ ہے۔ ا لے جائیں۔ اتنی دیر تک وہ اپنی جیب سے لڑکے کو کھلاتے پلاتے تھے۔ ظہور صا ذریعے اسے فلمی دنیا کی سیر بھی کراتے اور فلم کی شوٹنگ وغیرہ بھی دکھا دیتے تھے۔

اشرف صاحب نے باتوں ہی باتوں میں مجھ سے بھی میرے گھر کا معلوم کر لیا اور مجھے بتائے بغیر میرے گھر خط پوسٹ کر دیا کہ آپ کا بیٹا میرے پا کسی کو بھیج کر منگوا لیں۔

جب میرے والد صاحب کو خط ملا اور انہیں معلوم ہوا کہ میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں تو انہوں نے مجھے برا بھلا کہہ کر اعلان کر دیا کہ میں کسی کو اسے لانے نہیں بھیجوں گا۔ بمبئی ایکٹر بننے گیا ہے تو اب ایکٹر بن کر ہی واپس آئے لیکن کچھ دنوں بعد والدہ کے اصرار پر انہوں نے بادل نخواستہ اپنے داماد لالہ عبدالرحمٰن کو اجازت دے دی کہ وہ آپو جی کو ساتھ لے کر بمبئی جائے اور مجھے واپس گھر لے آئے۔ لالہ عبدالرحمٰن کا ایک بھانجا بمبئی میں کراکری کا بزنس کرتا تھا۔ یہ سب کچھ بعد میں ہوا۔ اس دوران مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میرے گھر خط لکھ دیا گیا ہے۔ میرے پاس کافی پیسے تھے جو میں نے اشرف صاحب کو بتائے تو انہوں نے کہا۔

"میرے پاس جمع کرا دو۔ جتنی ضرورت ہو لے لیا کرو۔"

◆.....◆.....◆

میں روز ان سے پانچ روپے لے کر بمبئی شہر کی سیر کو نکل جاتا۔ دن میں
فلمیں دیکھتا۔ ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتا، چائے پیتا اور صبح کا اشرف صاحب
گیراج سے نکلا شام کو واپس آتا۔ جس روز ظہور صاحب نے آنا ہوتا تھا اس روز
ورکشاپ میں ہی رہتا اور ان کے ساتھ ان کی بڑی ٹرائف موٹر سائیکل کے پیچھے ب
پرکاش سٹوڈیو جا کر فلم کی شوٹنگ دیکھتا۔ اب یاد آ گیا ہے۔ ظہور صاحب کا فلمی نام ایم
تھا۔ پہلی بار میں ظہور صاحب کے ساتھ پرکاش سٹوڈیو گیا تو وہاں ان کی ایک فلم کی ش
ہو رہی تھی۔

ظہور صاحب اس فلم میں ولن کا کردار ادا کر رہے تھے۔ وہ مجھے سٹوڈیو میں
پر بٹھا کر سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس میرے پاس چھوڑ کر میک اپ روم میں چلے جا
سٹوڈیو کے فلور پر کسی راجہ کے محل کا سیٹ لگا تھا۔ پرکاش سٹوڈیو میں ہی میں نے اس
کی مشہور ہیروئن پرمیلا اور مس مادھوری کو دیکھا۔ اشرف صاحب کو شیر کے شکار کا بھ
تھا۔

ایک دن انہوں نے شیر کے شکار کا پروگرام بنایا اور اصرار کر کے میں بھی ا
ساتھ شامل ہو گیا۔ ہماری ٹولی میں ایک اشرف صاحب تھے۔ ان کا پارسی منیجر مسٹر
اور ڈرائیور باٹا اور دو اور ملازم تھے۔ چنانچہ ایک دن ہم رائفلیں وغیرہ لے کر دو جیپو
سوار ہو کر بمبئی سے سو دو سو میل دور ست پڑا کے جنگلوں کی طرف چل دیئے۔
بمبئی سے ہم دن کے وقت چلے تھے۔

ہم دو جیپوں میں بیٹھے تھے۔ چار پانچ رائفلیں اور تین بندوقیں ساتھ تھیں۔
بڑین بھی کافی تھا۔ کھانے کا خشک راشن اور چائے کی کیتلی اور کپ وغیرہ بھی رکھ لئے
تھے۔ بمبئی شہر کے مضافات کافی دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک ہماری جیپیں پکی
سڑک پر دوڑتی رہیں۔ پھر پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔

یہ پہاڑی علاقہ ایسا نہیں تھا جیسا ہمارے کوہ مری ایبٹ آباد کا علاقہ ہے۔ یہ سطح
مرتفع قسم کا علاقہ تھا۔ دور دور بڑے بڑے پہاڑ کھڑے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ برسات کا
موسم گزر چکا تھا۔ یہ موسم شکار کے لئے بڑا موزوں ہوتا ہے۔ لوہاری منڈی لاہور والے
اشرف صاحب بڑے تجربہ کار شکاری تھے۔ وہ اگلی جیپ پر اپنے ورکشاپ کے پارسی منیجر
مسٹر جہانگیر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جہانگیر بھاری بدن کا گورا چٹا خوش شکل پارسی نوجوان
تھا۔ جہانگیر گاڑی چلا رہا تھا۔

میں اور ڈرائیور باٹا پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ دوسری جیپ پر اشرف صاحب
کے تین ملازم سامان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ صرف ایک ملازم کے پاس دو نالی بندوق تھی۔
باقی سارا اسلحہ ہماری والی جیپ میں تھا۔ کافی دیر تک سفر کرنے کے بعد ہماری جیپ پکی
سڑک سے اتر کر ایک جنگل میں داخل ہو گئی۔ یہ جنگل اس قسم کا تھا کہ کہیں گھنے درخت تھے
کہیں اونچی اونچی گھاس والا میدان آ جاتا تھا۔

تمام راستے اشرف صاحب اور جہانگیر کو معلوم تھے۔ وہ پہلے بھی کئی بار وہاں
شکار کھیلنے آ چکے تھے۔ میں جنگل کے درختوں اور بھورے رنگ کی پہاڑیوں اور ندی نالوں کو
بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ دوپہر کے وقت ہم ایک گاؤں میں داخل ہوئے جہاں بیس
پچیس جھونپڑے تھے۔

یہ جنگل کے دیہاتی لوگوں کے جھونپڑے تھے۔ کالے کالے دبلے پتلے آدمی
تھے۔ ان کی عورتیں تقریباً نیم عریاں تھیں۔ بچے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ اس گاؤں میں ہم
نے کھانا کھایا، چائے پی اور آگے چل پڑے۔ اب ہم جنگل میں کافی آگے نکل آئے تھے۔
مجھے سرکنڈوں کی مرطوب خوشبو آتی تھی۔ وہ خوشبو اس وقت بھی مجھے محسوس ہوتی

ہے۔ اگر کسی جگہ گل مہر کا کوئی سرخ پھول دیکھا تھا تو وہ پھول آج بھی میری آنکھو
سامنے ہے۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ میں ان چیزوں سے محبت کرتا ہوں اور
پھولوں، قسم قسم کے درختوں اور خوبصورت چہروں کو ہی یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں ا
نے اپنی آوارہ گردیوں کے زمانے میں جو درخت، پھول اور خوبصورت چہرے دیکھے
مجھے صرف یاد نہیں ہو گئے بلکہ میری روح کا ایک حصہ بن چکے ہیں اور مرنے کے بعد
روح کے ساتھ ہی آگے جائیں گے۔ باقی جو میرے اللہ کو منظور۔

جیسے جیسے چیزیں یاد آتی جاتی ہیں ویسے ہی لکھتا جا رہا ہوں۔ میں اپنی طرف
اس میں کوئی افسانوی رنگ شامل نہیں کر رہا۔ جنگل میں کوئی نالہ یا پہاڑی چشمہ آ
وہاں ہم منہ ہاتھ دھوتے۔ کچھ دیر آرام کرتے اور پھر آگے چل پڑتے۔ شام کے وق
ایک اور گاؤں میں آ گئے۔

یہ بالکل جنگلی لوگوں کا گاؤں تھا۔ جسے وہاں کی زبان میں آدھی باسی کہ
ہے۔ کالے کالے، دبلے پتلے لال لال آنکھوں والے آدھے ننگے لوگ تھے۔ عجیب
کی اردو زبان بولتے تھے۔ پورے جملے میں ایک آدھ لفظ ہی ہندوستانی کا ہوتا تھا۔ ا
زبان اشرف صاحب اور جہانگیر خوب سمجھ لیتے تھے۔ بانس کے جھنڈوں میں ا
جھونپڑیاں تھیں۔

عورتیں لباس کے جھنجھٹ سے آزاد تھیں۔ وہاں ہم نے اپنا کھانا پکا کر
رات ہو گئی تھی۔ اتنے میں ایک آدمی وہاں آیا جو اچھی خاصی ہندوستانی زبان بول لیتا
جو زبان یہ لوگ بولتے تھے وہ اردو نہیں تھی۔ ہندوستانی تھی۔ اس میں گجراتی اور
زبانوں کے الفاظ بھی تھے۔ ڈرائیور باٹا دبلا پتلا آدمی تھا۔ گردن لمبی تھی۔ اس کے
گجراتی کا ایک جملہ آ گیا تھا۔ وہ ہر ایک جنگلی کے ساتھ وہی جملہ بول رہا تھا۔

"تمے سوں کرے چھے؟"

یعنی تم کیا کر رہے ہو؟ باٹا کی موجودگی سے شکاریوں کی اس پارٹی میں کافی
ہو گئی تھی۔ جو جنگلی آدمی آیا تھا اس نے اشرف صاحب اور جہانگیر کو بتایا کہ وہاں

میل دور جنگل کے اندر کل ایک شیر گاؤں کے باڑے سے ایک گائے اٹھا کر لے گیا تھا
جس کا بچا ہوا گوشت اور ہڈیاں گاؤں سے ایک کوس کے فاصلے پر ایک کھیت کے اندر ابھی
تک پڑی ہیں اور خیال ہے کہ شیر آج رات اسے کھانے ضرور آئے گا۔ آپ لوگ اس شیر کو
مار کر گاؤں والوں کو اس عذاب سے نجات دلائیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں اشرف صاحب
کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اشرف صاحب نے کہا۔

"تمے فکر نہ کرے چھے۔ ہم آج رات شیر کو مار گرائے گا۔"

اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم لوگ جیپوں میں سوار ہو گئے۔ اس آدمی کو ساتھ
لیا اور شیر کو شکار کرنے چل پڑے۔ اس وقت مجھے ڈر لگا۔ بمبئی سے جب میں اس شکاری
پارٹی کے ہمراہ چلا تھا تو بڑا خوش تھا کہ جنگلوں میں پھروں گا۔

جھیلیں، چشمے، پہاڑ اور درختوں کے جھنڈ دیکھوں گا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ
یہ پارٹی اس جگہ جا رہی ہے جہاں آج رات کو شیر آئے گا تو میں بالکل سچ سچ کہوں گا مجھ پر
خوف سا طاری ہو گیا تھا کہ اگر شیر نے ہم پر حملہ کر دیا اور ہم میں سے کوئی بھی اس پر گولی نہ
چلا سکا یا شیر کو گولی نہ لگ سکی تو کیا ہو گا؟ وہ تو مجھے کھا جائے گا۔ تب میں پچھتانے لگا کہ
شکاری پارٹی کے ساتھ یہاں کیوں آ گیا۔

جنگل کا وہ تنگ سا راستہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے جہاں سے
ہماری جیپیں ہچکولے کھاتی گزر رہی تھیں۔ اس جنگلی راستے کی دونوں جانب بانس کے
اونچے اونچے گھنے جھنڈ تھے جن میں سے سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی۔ ہم لوگ ایک
ایسی جگہ آ گئے جہاں تین چار جھونپڑے تھے۔ دو نیم عریاں جنگلی ہاتھوں میں نیزے لئے
ایک جھونپڑے کے باہر کھڑے تھے۔

جھونپڑے کے دروازے میں مٹی کے تیل والی لالٹین روشن تھی۔ ہمارے ساتھ
جو آدمی آیا تھا وہ ان جنگلی آدمیوں سے ان کی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے
اشرف صاحب کو بتایا کہ سامنے والے جھونپڑے میں ان لوگوں کے جانور بندھے ہوئے
ہیں۔ شیر کل رات اسی باڑے سے ایک گائے اٹھا کر لے گیا تھا۔ ہم نے وہاں جا کر

باڑے کو دیکھا۔ اندر دو گائیں اور ایک گدھا بندھا ہوا تھا۔ وہ آدمی یعنی ہمارا گائیڈ کہنے لگا کہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھیت کی فصل میں گائے کی بچی کھچی لاش پڑی ہے جس کو کھانے آج رات شیر ضرور آئے گا۔

اشرف صاحب بولے۔

''چلو چل کر گائے کی لاش دیکھتے ہیں۔''

میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ یہ تو عین اس جگہ جا رہے ہیں جہاں شیر آنے والا ہے۔ ہوسکتا ہے ہمارے وہاں پہنچتے ہی شیر آ جائے اور ہم پر حملہ کر دے اور اشرف صاحب اور جہانگیر اسلحہ سنبھالتے ہی رہ جائیں۔ اشرف صاحب نے ایک رائفل مجھے دے دی تھی۔ رائفل کی نالی پر لمبی ٹارچ بندھی ہوئی تھی۔ اشرف صاحب نے خاص طور پر مجھے کہا کہ ''آپ گولی مت چلانا۔ جب میں کہوں تو فائر کرنا۔''

مویشیوں کے باڑے سے نکل کر شکاری پارٹی وہ جگہ دیکھنے چل پڑی جہاں شیر کی آدھی کھائی ہوئی گائے کی لاش پڑی تھی۔ میں بہت ڈر رہا تھا اور اشرف صاحب اور جہانگیر کے درمیان میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ درختوں، جھاڑیوں میں سے اندھیرے میں سے گزرتے آخر ہم ایک کھیت میں آ گئے۔ وہاں کھیت کے درمیان ایک جگہ گائے کی آدھ کھائی لاش پڑی تھی۔ اشرف صاحب اور جہانگیر نے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ آدھی گائے شیر نے کھائی ہوئی تھی۔ اشرف صاحب کہنے لگے۔

''جہانگیر اس طرف کوئی درخت دیکھو۔ جس پر مچان ڈالی جا سکے۔''

لیکن وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ جہانگیر بولا۔

''دادا ادھر چاروں کے گٹھوں کے پاس ہی بیٹھنا پڑے گا۔''

اشرف صاحب بولے۔

''فکر نہیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر ہی شیر مار لیں گے۔''

میں اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ مچان پھر بھی اونچی ہوتی ہے اور شیر سے بچنے کا امکان تھا لیکن زمین پر مورچہ بنا کر شیر کو شکار کرنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ شیر چھلانگ لگا

کر ہم میں سے کسی کو بھی دبوچ سکتا تھا لیکن میں اپنے خوف کو ظاہر کر کے اپنا مذاق نہیں بنانا چاہتا تھا۔ پس خاموش رہا اور دل میں یہی دعا مانگتا رہا کہ یا اللہ شیر آج کی رات اس طرف نہ آئے۔

میں اور اشرف صاحب گھاس کے بڑے بڑے گٹھوں کے پیچھے رائفلیں لے کر بیٹھ گئے۔ ہماری رائفلوں کے آگے ٹارچ بندھی ہوئی تھی۔ اشرف صاحب نے مجھے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

''جس وقت ہماری ٹارچ روشن ہو تم بھی ٹارچ روشن کر دینا اور جہاں ہماری ٹارچ کی روشنی پڑے تم بھی اسی جگہ ٹارچ کی روشنی ڈالنا۔ خبردار فائر مت کرنا۔ فائر صرف میں جہانگیر اور باٹا کریں گے۔ تم صرف ٹارچ کی روشنی ڈالو گے۔ سمجھ گئے ہو؟''

میں نے کہا۔

''جی ہاں۔ سمجھ گیا ہوں۔''

ہمارے پیچھے ایک ڈھلان تھی۔ ٹیلے کے اوپر ایک جانگلی کھڑا کر دیا گیا تھا جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا تا کہ اگر شیر پیچھے سے آ جائے تو وہ شور مچا کر ہمیں خبردار کر دے۔ یہ جانگلی لوگ واقعی بڑے بہادر تھے اور بعد میں پتہ چلا کہ صرف نیزے کے ساتھ شیر کا شکار کر لیتے ہیں۔ اس وقت ہمارے چاروں جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

رات کا اندھیرا پھیکا پھیکا سا تھا اور کھیت کی فصل اور دور کے درخت سایوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اب ہمیں مچھروں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے میں نے اپنی گردن پر بیٹھے ہوئے مچھر کو ہاتھ سے مارا تو اشرف صاحب نے سرگوشی میں مجھے ڈانٹا۔

''بے وقوف شور مت کرو۔''

اس کے بعد مچھر مجھے کاٹتے رہے اور میں اپنے اوپر جبر کر کے پتھر کے بت کی طرح بیٹھا رہا۔ آدھا گھنٹہ اسی طرح ہمیں بے حس و حرکت بیٹھے گزر گیا۔ پھر دور کھیتوں میں کچھ ہل جل کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دور سے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔

جنگل کی رات کی خاموشی میں دور سے سنائی دیتی شیر کی دھاڑ آج بھی میرے کانوں میں سنائی دے رہی ہے۔

میرا دل خوف کے مارے زور سے دھڑکنے لگا۔ اشرف صاحب نے ہلکی سی سیٹی بجا کر جہانگیر اور باٹا کو خبردار کیا جو ہماری دائیں جانب گھاس کے گٹھوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس طرف سے بھی کسی نے آہستہ سے سیٹی بجا کر جواب دیا کہ ہم نے شیر کی دھاڑ سن لی۔ اس خیال سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی کہ شیر کسی وقت بھی پیچھے سے آ کر ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔ ایک نیزہ بردار جانگلی اس کا کیا مقابلہ کر سکے گا۔ اتنے میں کھیت کی فصل میں دو آنکھیں اندھیرے میں چمکتی دکھائی دیں۔ اشرف صاحب نے ٹارچ روشن کر کے ان آنکھوں پر مرکوز کر دی۔ میں نے بھی ٹارچ کا بٹن دبا کر اشرف صاحب کی ٹارچ کی روشنی پر اپنی ٹارچ کی روشنی مرکوز کر دی۔ دوسری جانب سے جہانگیر اور باٹا کی ٹارچیں بھی روشن ہو کر کھیت میں چمکتی آنکھوں پر مرکوز ہو گئیں۔

اشرف صاحب تجربہ کار شکاری تھے۔ سرگوشی میں بولے۔

"یہ شیر کی آنکھیں نہیں ہیں۔"

میری جان میں جان آئی کہ شیر نہیں آیا ہے۔ اشرف صاحب نے مجھے سرگوشی میں کہا۔

"ٹارچ بند کر دو۔"

میں نے ٹارچ کی روشنی بند کر دی۔ اشرف صاحب نے بھی اپنی ٹارچ کی روشنی بجھا دی۔ اس کے فوراً بعد جہانگیر اور باٹا کی ٹارچیں بھی بجھ گئیں۔ چاروں طرف سناٹا اور اندھیرا تھا دور کسی تالاب سے جھینگر کی آواز آ رہی تھی۔ شیر کی دھاڑ اس کے بعد دوبارہ سنائی نہیں دی تھی۔ اشرف صاحب نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"کھیت میں یہ کوئی گیدڑ تھا جو گائے کی لاش کھانے آیا تھا۔"

ہم دیر تک بت بنے بیٹھے رہے۔ مچھر تنگ کر رہے تھے۔ کوئی مچھر میری گردن یا ماتھے پر بیٹھتا تو میں اسے ہاتھ سے اس طرح اڑا دیتا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ آسمان پر صبح کا نور

نے لگا۔ اشرف صاحب نے کہا۔

"اب شیر نہیں آئے گا۔"

اشرف صاحب نے مسٹر جہانگیر کو آواز دی۔

"تیسے سوں کرے چھے جہانگیر۔" اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری ف سے جہانگیر اور باٹا بھی اٹھ کر آ گئے۔

جہانگیر نے کہا۔

"دادا! شیر بڑا مکار ہے۔ اس کو ہمارا پتہ چل گیا تھا۔"

اشرف صاحب نے کہا۔

"شیر کی قسمت اچھی تھی۔ بچ گیا۔"

باٹا نے کہا۔

"دادا! آج رات اسے مار لیں گے۔"

اشرف صاحب بولے۔

"اب وہ ادھر نہیں آئے گا۔"

ہم ایک جھونپڑے میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں بیٹھ کر چائے بنا کر پی گئی۔ ونپڑی کا فرش اور دیواریں کچی تھیں مگر بڑی صاف ستھری تھیں۔ دیوار پر شیشے میں جڑی ئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر لگی تھی۔ انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ ئے پینے کے بعد اشرف صاحب نے کہا۔

"ہم یہاں کم از کم تین گھنٹے سوئیں گے۔"

وہ سب جھونپڑے کے اندر ہی گھاس پھوس کے بستر پر دراز ہو گئے۔ میں بھی یک طرف لیٹ گیا۔ سب سو گئے۔ مجھے بھی نیند آ گئی لیکن مچھروں نے مجھے جگا دیا۔ میں ٹھ کر باہر آ گیا۔ باہر سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں جھونپڑے کے پیچھے بانس اور ناریل کے درختوں میں پھرنے لگا۔ بڑی شفاف ہوا تھی۔

ہوا میں طرح طرح کے پودوں، درختوں اور جنگلی پھولوں کی خوشبو تھی۔ میں
ایک جگہ گل مہر کے زرد پھول دیکھے۔ اس سے پہلے میں نے گل مہر کے سرخ پھول
دیکھے تھے۔ پھولوں پر شبنم کے موتی دھوپ میں چمک رہے تھے۔

گھاس بھی رات بھر کی اوس میں بھیگی ہوئی تھی۔ ایک جگہ تین چار کیلے
درخت ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ ان کے پتوں کے درمیان زرد کیلوں کے گچھے
رہے تھے۔ میں دو تین کیلے توڑ کر کھانے لگا۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیلے تھے اور ان
ہماری ہری چھال والے کیلوں کی خوشبو نہیں تھی مگر میٹھے بڑے تھے۔

کافی دیر بعد شکاری لوگ سو کر اٹھے۔ وہاں ہم سب نے ناشتہ کیا۔ سوکھی مچھلی
لوگ ساتھ لائے تھے جسے وہاں بھونا گیا۔ ناشتے کے بعد یہ شکاری پارٹی واپس اسی جگہ آ
جہاں ہماری جیپیں کھڑی تھیں۔ ایک ہی رات میں جنگل کے مچھروں نے مجھے بدل کر
تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ اب واپس بمبئی چل پڑیں گے لیکن وہ جیپوں میں بیٹھ
دوسرے جنگل کی طرف چل پڑے۔

دوپہر تک ہم لوگ جنگلوں میں پھرتے رہے۔ اشرف صاحب اور جہانگیر
ایک جنگلی بکرے کا شکار مارا اور وہیں اسے ذبح کر کے آگ جلا کر بھونا گیا اور دوپہر کا
کھایا۔ اس کے بعد پھر یہ پارٹی آگے روانہ ہو گئی۔ جیپیں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ ا
ریچھ کا شکار کیا گیا جس کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔

کئی پرندے بھی شکار کئے۔ رات آ گئی۔ رات کو وہیں جنگل میں ایک جگہ
لیٹ گئے۔ دو ملازم بندوقیں لے کر باری باری رات کو پہرہ دیتے رہے۔ صبح چھ
مرغابیاں مار کر ان کا ناشتہ کیا گیا۔ شیر کہیں نہ ملا۔ دوسرا اور پھر تیسرا دن بھی جنگلوں
گھومتے پھرتے اور چھوٹا شکار کرتے گزر گیا۔

کہیں کوئی چشمہ آ جاتا تو سب وہاں بیٹھ کر منہ ہاتھ دھوتے۔ تھوڑا آرام کر
اور پھر شیر یا کسی چیتے کی تلاش میں آگے چل پڑتے۔ ایک جگہ درخت کی ٹہنی پر میں
سانپ کی کینچلی دیکھی۔ وہ بالکل سانپ کی طرح ٹہنی سے چمٹی ہوئی تھی۔ صاف لگتا تھا

سانپ کینچلی کے اندر سے نکل گیا ہے اور کینچلی باقی رہ گئی ہے۔ اشرف صاحب کے ایک نوکر
نے کینچلی سمیٹ کر رومال میں باندھ لی۔ کہنے لگا۔

"اس کا سرمہ آنکھوں کے لئے بڑا مفید ہوتا ہے۔"

اس طرح ہم کچھ دن جنگلوں میں پھرتے رہے مگر کوئی شیر نہ ملا۔ ساتویں روز ہم
بمبئی کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہمارے رنگ سانولے ہو
گئے تھے۔ خدا خدا کر کے بمبئی شہر میں داخل ہو گئے۔

ورکشاپ میں آ کر مجھے ایک ملازم نے بتایا۔

"تمہاری والدہ تمہیں لینے بمبئی آئی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا وہ سب لوگ شکار
کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔"

والدہ صاحبہ اپنے بھانجے اور میرے بڑے خالہ زاد بھائی کے ساتھ مجھے لینے
بمبئی آئی تھیں۔ وہ ورکشاپ میں اپنا ایڈریس دے گئی تھیں۔ میں آپو جی کے آنے کا سن کر
بے تاب ہو گیا اور اسی وقت ٹیکسی لے کر والدہ صاحبہ جہاں ٹھہری ہوئی تھیں وہاں پہنچ گیا۔
والدہ نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کہا۔

"چلیں واپس امرتسر چلتے ہیں۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔"

بھانجے صاحب نے کہا۔

"بھائی ہم بمبئی آئے ہیں تو ایک دو دن یہاں کی سیر ہی کر لیں۔"

◆......◆......◆

مگر میرے اصرار پر ہم دوسرے دن ہی بمبئی سے امرتسر واپس چل پڑے۔
والدہ اشرف صاحب کا شکریہ ادا کرنے ان کی بیگم صاحبہ کے پاس بھی گئیں۔ اشرف
صاحب نے باٹا کو گاڑی دے کر ہمیں سٹیشن پر پہنچایا اور جب تک ٹرین نہ چلی باٹا پلیٹ
فارم پر کھڑا رہا۔

یوں بمبئی کی میری پہلی یاترا اختتام کو پہنچی۔ اس کے بعد کے اپنے بمبئی کے سف
کے حالات آگے چل کر بیان کروں گا جب مجھے دو دن کا فاقہ آ گیا تھا اور نانی یاد آ گئی تھی
ابھی میں آپ کو اپنے ایک اور دلچسپ سفر کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بمبئی سے میں وال
کے ساتھ امرتسر پہنچا تو والد صاحب نے بڑا لحاظ کیا اور میری بالکل ٹھکائی نہ کی۔ لیکن انہو
نے مجھے ایک جگہ پھنسا دیا۔

ہال بازار ہمارے امرتسر والے مکان سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔
بازار میں عبدالغفار پینٹر کی دکان کے بالکل سامنے والی عمارت کی دوسری منزل
اصفہانی چائے کمپنی کا دفتر تھا۔ پہلے یہ سن لیجئے کہ عبدالغفار پینٹر بڑے خاموش طبع اور
دل انسان تھے۔ بڑا سا بورڈ سامنے رکھے وہ رنگ روغن سے اس پر اردو یا انگریزی حر
کے خاکوں میں زرد اور سرخ رنگ بھرا کرتے تھے۔ اردو املا وہ بڑی خوبصورت لکھتے تھے

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی فلم انڈسٹری میں جس خاتون گلوکارہ نے
گھریلو قسم کی سریلی آواز میں بڑے کامیاب فلمی گیت گائے اس کا نام زبیدہ خانم
عبدالغفار پینٹر زبیدہ خانم کے والد صاحب تھے۔

لاہور کے ایک فلم سٹوڈیو میں جب میں نے پہلی بار گلوکارہ زبیدہ خانم کو دیکھا تو
حیران ہوا۔ زبیدہ خانم کی شکل اپنے والد صاحب کی ہو بہو کاپی تھی۔
اصفہانی چائے کمپنی کا اسسٹنٹ منیجر ہمارے والد صاحب کا دوست تھا۔ والد
جب نے انہیں کہا کہ حمید میٹرک پاس کرنے کے بعد آوارہ پھر رہا ہے۔ اسے چائے
نی کے دفتر میں کہیں ملازم کرا دو۔ اس طرح کام پر لگ گیا تو سیدھا ہو جائے گا۔ چنانچہ
سٹنٹ منیجر صاحب نے مجھے اصفہانی چائے کمپنی میں بطور سیلزمین ملازم رکھوا دیا۔ میری
ڈی یہ تھی کہ سائیکل کے پیچھے چائے کا چھوٹا کریٹ رکھ کر شہر کے ہوٹلوں میں جاؤں۔ ان
ے چائے کے آرڈر لوں اور انہیں چائے سپلائی کروں۔

مجھے یہ نوکری بڑی اچھی لگی کیونکہ اس کی وجہ سے مجھے سارے شہر کی سیر کرنے کا
رقع مل جاتا تھا۔ اصفہانی چائے کمپنی کے پاس تین چار برانڈ کی چائے تھی۔ ایک ریڈ
پاٹ تھی۔ ایک گرین سپاٹ تھی اور ایک ماؤنٹین بو کے تھی۔

ماؤنٹین بو کے اصفہانی کی اعلیٰ کوالٹی کی چائے تھی۔ مجھے اس برانڈ کی خشک
چائے کی خوشبو اور اس کی دم کرنے کے بعد کی خوشبو آج تک یاد ہے۔ اصل میں یہی وہ
خوشبوئیں ہیں جو میری روح کو توانائی اور میرے جسم کو زندہ رہنے کی طاقت بخشتی ہیں۔ اگر
علیٰ چائے، اعلیٰ سگریٹوں اور سرخ گلابوں، سفید موتیا اور گرمیوں میں منہ اندھیرے باغوں
ں سے گزرنے والی نہروں کی مرطوب خوشبوئیں نہ ہوتیں تو پتہ نہیں میرا کیا حال ہوتا۔
زندہ تو میں ضرور رہتا لیکن معلوم نہیں کس حال میں زندہ ہوتا۔

اتنا ضرور ہے کہ ان خوشبوؤں اور خوبصورت چہروں اور اداس موسیقی اور شارلٹ
برانٹے کے رومان انگیز غمگین ناولوں اور اقبالؒ کی شاعری کے بغیر میری زندگی حبس دوام اور
بُردریائے شور کی زندگی ہوتی۔

مجھے اصفہانی چائے کمپنی میں سیلزمین کی نوکری مل گئی تھی۔ اس نوکری سے میں بڑا
وش تھا کیونکہ مجھے سائیکل پر سوار ہو کر مسلسل امرتسر کے بازاروں وغیرہ میں گھومنا پھرنا پڑتا
تھا اور یوں میری آوارہ گردی کا شوق پورا ہو جاتا تھا۔ مختلف برانڈ کی چائے کے ایک ایک

پاؤنڈ کے ڈبے میری سائیکل کے پیچھے لکڑی کے کریٹ میں بھرے ہوتے اور میں شہر
ہوٹلوں میں چائے سپلائی بھی کرتا اور ان سے نئے آرڈر بھی لیتا۔

ایک خوشی یہ بھی تھی کہ اس طرح مجھے چائے کے ساتھ رہنے کا موقع مل جاتا
چائے کا گودام ہمارے محلے میں پیلے ہسپتال کے پیچھے تھا۔ دو سیلز مین اور بھی تھے۔ ا
گورکھا لڑکا تھا اور ایک ہندو لڑکا تھا جو سیتا پور کا رہنے والا تھا۔ مال لینے جب میں چا
کے گودام میں جاتا تو فضا سوکھی چائے کی مہک سے لبریز ہوتی تھی۔

میرا دل گودام سے باہر نکلنے کو نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا کہ سارا دن گودام
ہی چائے کے ڈبوں کے پاس بیٹھا رہوں۔ سبز چائے کی بوریاں بھی گودام میں تھیں۔
روز میں تھوڑی سی سبز چائے گھر لے گیا۔ آپو جی نے چائے کو پہلا ابالا دیا تو چائے کی
ایسے کھل گئیں جیسے ابھی ٹہنیوں سے توڑ کر پتیلی میں ڈالی گئی ہوں۔ پانچ پانچ پتیوں
باریک ڈالیاں تھیں۔ اس چائے کی ابھی کٹائی نہیں ہوئی تھی۔ لالہ عبدالرحمٰن بھی وہاں
تھے۔ انہوں نے چائے کی کھلی ہوئی پتیاں دیکھیں تو بولے۔

"یہ اصلی چائے ہے آپو جی۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یار میرے لئے بھی یہ چائے لا دے۔"

میں نے گودام سے دو پونڈ کے قریب سبز چائے چوری کی اور لالہ جی کو
دے دی۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور چائے لے کر رکھ لی۔ اس کے علاوہ گودام میں
چائے کے بڑے ڈبے بھی ہوتے تھے۔ اس کو ڈسٹ چائے کہتے تھے۔ یہ چائے
زیادہ رنگی ہوئی ہوتی تھی۔

یہ چائے ہوٹلوں میں سپلائی کی جاتی تھی۔ یعنی چائے کی دکانوں کو سپلائی کی
تھی جہاں کاریگر مزدور اور ڈرائیور آ کر چائے پیتے تھے۔ یہ چائے تیز اور سٹرانگ ہو
اور اس کا رنگ بڑی جلدی نکل آتا تھا۔ نوکر پیشہ اور مزدور لوگ جلدی میں ہوتے تھے
چائے کے دم آنے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ یہ چائے لکڑی کے بڑے کھوکھوں میں

سپلائی کی جاتی تھی۔

کبھی کبھی چائے کمپنی کے ہال بازار والے آفس میں چھ سات بوڑھے لمبے لمبے
غے پہنے آتے تھے۔ یہ لوگ تاجکستانی اور یارقندی ہوتے تھے۔ گورے اور سرخ اور
ی آنکھوں والے۔ ہنستے تھے تو آنکھیں رخساروں میں چھپ جاتی تھیں۔ یہ بوڑھے
ے کے مختلف برانڈ کو بلینڈ کرنے کے ماہر تھے۔ وہ ایک لمبی میز کے آمنے سامنے کھڑے
اتے۔ میز پر چھوٹی چھوٹی چینی کی پیالیاں جن کو فنجان کہتے ہیں پڑی ہوتیں۔

ہر پیالی کے پاس ایک سفید کاغذ ہوتا۔ ایک پنسل بھی رکھی ہوتی۔ کاغذ پر نمبر شمار
ج ہوتا۔ دوسرے کاغذ میں مختلف برانڈ کی چائے کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگی ہوتیں۔ ہر
یک یا یارقندی بزرگ مختلف ڈھیروں میں سے تھوڑی تھوڑی سوکھی چائے پیالی میں ڈال
اوپر سے گرم پانی ڈالتا۔

پیالی پر پرچ رکھ کر اسے دم آنے کے لئے ایک منٹ دیتا۔ پھر پرچ اٹھا کر پیالی
ں کے ساتھ لگا کر چائے کا ایک چھوٹا سا گھونٹ منہ میں لیتا۔ منہ کے اندر ہی اندر
ے ادھر ادھر دو تین بار گھماتا۔ پھر نیچے ٹین کے ڈبے میں کلی کرتے ہوئے پھینک دیتا۔
سفید کاغذ پر فارسی زبان میں اپنے تاثرات درج کر دیتا کہ اس بلینڈ میں یہ خوبی ہے اور
ہے۔ میں ان تاجیک اور یارقندی بزرگوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا تھا۔ مجھے لگتا
یہ چائے کے قریبی رشتے دار ہیں اور اس سے ملنے بڑی دور سے آتے ہیں۔

مسلم امرتسر کے کمپنی باغ میں ٹھنڈی کھوئی والی سڑک کا نام ہال روڈ تھا۔ یہ کمپنی
میں سے گزرتی تھی اور اس پر ہفتے میں ایک بار ہی کوئی تانگہ یا سائیکل سوار دکھائی دیتا
ٹھنڈی کھوئی سے آگے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کا چوک تھا جس میں سے ایک سڑک
نام کے قصبے کی طرف نکل جاتی تھی۔

اس سڑک کا نام بھی مجیٹھ روڈ تھا۔ اس سڑک کی دونوں جانب جامن کے گھنے
ت تھے۔ ذرا آگے جا کر یہ سڑک بائیں جانب مڑ جاتی تھی جہاں سے کمپنی باغ والی نہر
ایک سوا سڑک کی جانب چل پڑتا تھا۔ آگے امرتسر میڈیکل سکول تھا۔ امرتسر میڈیکل

سکول کے سامنے سڑک پر نہر والے سوئے کے اوپر چائے کا ایک بڑا کھوکھا ہوتا تھا۔
نہر کا پانی چائے کے کھوکھے یا دکان کے نیچے سے گزرتا تھا۔ یہ سوایا چ
گدلی اور ٹھنڈے پانی والی نہر مجھے بہت پسند تھی۔ میں چائے کے اس کھوکھے وال
اصفہانی چائے سپلائی کرتا تھا۔ جس روز میں وہاں ڈسٹ چائے لے کر آتا تو نہر
لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر چائے ضرور پیتا تھا۔ ایسا ہی گدلے ٹھنڈے پانی والا سوایا چ
نہر لاہور میں گورنمنٹ ہاؤس والی سڑک کشمیر روڈ سے بانس کے درختوں والی سندر دا
کی طرف جائیں تو چوک میں ہوا کرتی تھی۔

1948-50ء میں یہ چھوٹی سی نہر اپنے جوبن پر تھی اور اس کے اوپر
درخت جھکے ہوئے تھے۔ یہ نہر جب کشمیر روڈ سے ہوتی ہوئی چوک میں پہنچتی تھی ا
والی سڑک کے نیچے سے ہو کر آگے بانسوں والی سندر داس روڈ پر نکل آتی تھی۔
سندر داس روڈ پر اس چھوٹی نہر پر آم کے درخت جھکے ہوئے ہوتے تھے۔ سڑک کی
جانب بانس کے جھنڈ جھکے ہوئے ہوتے تھے۔

اس سڑک پر کبھی کبھار ہی کوئی تانگہ وغیرہ گزرتا تھا۔ سارا دن سڑک خا
رہتی تھی۔ اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی جنگل میں سے گز
ہیں۔ آج اس سڑک کا جنگل غائب ہو گیا ہے اور سڑک پر گاڑیوں، سکوٹروں، وی
اتنی ٹریفک ہوتی ہے کہ آدمی پیدل نہیں گزر سکتا۔ اس کے کنارے والی نہر بھی غائ
ہے یا کسی جگہ سے نظر بھی آتی ہے تو اس کے پانی میں پلاسٹک کے لفافے اور کوڑا ک
رہا ہوتا ہے۔

مسلم امرتسر والی نہر بھی بالکل ایسی ہی اور چھوٹی سی تھی اور آج وہ بھی
سکھوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی ہوگی۔ نہروں کی قدر امرتسر کے مسلمانوں کو تھی
ان کے کناروں پر بیٹھ کر اس کی بہار دیکھا کرتے تھے۔

امرتسر کے ہندو بیوپاری تھے اور ہر وقت بیوپار کے حساب کتاب
رہتے تھے۔ امرتسر کے سکھ زیادہ تر مزدور پیشہ اور لکڑی کا کام کرنے والے تھے۔

نزدیک نہر پانی کا ایک نالہ ہوتا ہے جس میں نہا کر اسے گندا کیا جاتا ہے۔ اصفہانی چائے
کمپنی والوں نے مجھے ایک ہندو منیجر کے ساتھ پٹھان کوٹ بھیج دیا۔ وہاں کمپنی کی جو برانچ
تھی وہ ٹھیک بزنس نہیں کر رہی تھی۔ مجھے خاک معلوم نہیں تھا کہ بزنس کیا ہوتا ہے۔

کمپنی والے ایک مسلمان کو وہاں ضرور بھیجنا چاہتے تھے۔ اور ان کے نزدیک
میں بڑا موزوں مسلمان تھا۔ میں اس لئے خوش تھا کہ مجھے پٹھان کوٹ دیکھنے کا موقع ملے
گا۔ پٹھان کوٹ کے آگے ڈلہوزی تھا۔ مگر میں وہاں نہیں جا سکا۔

پٹھان کوٹ کی سڑکیں کہیں سے اونچی تھیں اور کہیں سے گھاٹیاں نیچے کو اترتی
تھیں۔ اس شہر میں پہاڑی شہروں کی جھلک تھی۔ سٹیشن چھوٹا سا تھا۔ نیچے گھاٹی میں ایک بستی
تھی جس کے سفیدے کے درخت اوپر سڑک سے صاف نظر آتے تھے۔ پٹھان کوٹ میں
دس پندرہ دنوں میں ہی میرا جی بھر گیا اور میں کسی کو بتائے بغیر امرتسر واپس آ گیا۔ امرتسر
میں آتے ہی میں نے چائے کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی اور گھر سے بھاگ کر کلکتے چلا گیا۔
مہینہ ڈیڑھ مہینہ کلکتے کی آوارہ گردی کے بعد امرتسر واپس آیا تو والد صاحب نے پہلے تو
میری خوب مرمت کی پھر اپنے ایک دوست عبداللہ خان سے کہا کہ لڑکے کو کسی جگہ لگا دو۔
یہ آوارہ ہو رہا ہے۔

عبداللہ خان درمیانے قد کے مضبوط جسم والے بزرگ تھے اور امرتسر پٹھانکوٹ
بس سروس کی سوسائٹی کے اعلیٰ عہدے دار بھی تھے۔ اور سوسائٹی میں ان کی چھ سات بسیں
بھی تھیں۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور انگریزوں نے سرگودھا شہر سے چند میل دور
دھپ سڑی کے مقام پر ایک ہوائی اڈے کی تعمیر شروع کر رکھی تھی۔

عبداللہ خان کشمیری تھے۔ انہیں ہوائی اڈے تک بجری وغیرہ پہنچانے کا ٹھیکہ مل
گیا تھا اور چھ سات لاریوں کی سیٹیں باہر نکال کر انہوں نے لاریوں کو ٹرکوں میں تبدیل کر
دیا تھا اور سردار خان نامی ایک سانولے رنگ کے اونچے لمبے دلچسپ شخص کو ڈرائیوروں کا
منیجر بنا کر لاریوں کے ساتھ سرگودھا سے روانہ کرنے والے تھے۔

والد صاحب نے ان سے میری نوکری کی بات کی تو عبداللہ خان صاحب نے

مجھے سردار خان کے ساتھ اسسٹنٹ منیجر بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ایک روز ہم چھ
سات لاریوں کو لے کر امرتسر سے سرگودھا روانہ ہو گئے۔ سرگودھا شہر میں ریلوے پھاٹک
کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ سرگودھا پہنچ کر ہم نے لاریاں اس میدان میں ایک
طرف قطار میں کھڑی کر دیں۔ یہاں ریلوے پھاٹک کے پاس ایک کافی کھلا گودام ٹائپ
کا کمرا خالی پڑا تھا۔ یہاں پانچ ڈرائیوروں نے چارپائی ڈال کر اپنے بستر لگا دیئے۔ اس
کمرے میں ایک طرف میں نے بھی اپنا بستر لگا دیا۔ یہ میرا صبح کی سیر اور قدرت کے
نظاروں سے محبت کرنے کا عروج کا زمانہ تھا۔

میں بلاناغہ صبح کی سیر کو جایا کرتا تھا۔ صبح کی سیر میں اپنی صحت ٹھیک رکھنے کے
لئے نہیں کرتا تھا۔ میری صحت پہلے ہی ضرورت سے زیادہ ٹھیک تھی۔ صبح کی سیر میں صرف
پچھلے پہر کے آسمان پر پھیکے پڑتے ستاروں، شبنم کے موتیوں جڑے پودوں اور پھولوں ا
مشرقی افق سے رنگ و نور کی کرنیں لٹاتے سورج کو طلوع ہوتے دیکھنے کے لئے کیا کر
تھا۔

یہ سردیوں کا موسم تھا۔ سرگودھے میں بڑی سردی تھی۔ مگر میں صبح کو صرف ایک
قمیص اور پاجامہ پہن کر سیر کرنے جاتا تھا۔ یہ میری شروع سے ہی عادت تھی۔ میں کبھی
پر اونی ٹوپی پہن کر، گلوبند لپیٹ کر اور سویٹر اور جرابیں پہن کر سیر کرنے نہیں گیا تھا۔
سویٹر اور اونی ٹوپی پہن کر سردی سے بچنے کے جرم کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں سر
کو کھلے جسم اور کھلے دل کے ساتھ ملنا چاہتا تھا اور مجھے دسمبر میں بھی صبح کی سیر کرتے ہو
کبھی سردی نہیں لگی تھی۔

بدلتے موسم، گرمیوں کی لو، برسات کی بارش اور سردیوں کی دھند اور کہرا میر
قبیلے کے لوگ تھے۔ میرے اپنے خاندان کے افراد تھے۔ میرے اپنے بہن بھائی تھے۔
مجھے ان سے بچنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ایک شخص سے محبت
کروں اور اس سے بچتا بھی پھروں اور اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی بھی کوش
کروں۔ آدمی اپنے آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے دوستوں

نہیں۔ اپنے خیرخواہوں سے نہیں۔

یہ موسم، یہ بارشیں، یہ سردیوں کی دھند اور گرمیوں کی تپش اور چلچلاتی دوپہروں
کی لو۔ یہ سب میرے دوست تھے اور میرے دوست ہیں۔ میرے خیرخواہ تھے اور آج بھی
میرے خیرخواہ ہیں۔ یہ مجھے کبھی نقصان نہیں پہنچاتے۔ انہوں نے مجھے کبھی نقصان نہیں
پہنچایا۔ انہوں نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے۔ مجھ پر اتنا اتنا قرض چڑھا دیا ہے کہ میں ساری
زندگی اس قرض کو نہیں اتار سکوں گا۔

سرگودھا شہر مجھے بڑا اچھا لگا۔ مختصر سا شہر تھا۔ آبادی مناسب تھی۔ آس پاس
بڑے درخت تھے۔ سبزہ تھا۔ اس زمانے میں سرگودھے کا صابن اور سرگودھا کے مالٹے
بڑے مشہور تھے۔ شہر کا ایک بڑا بازار تھا۔ یاد نہیں اس بازار کا نام کیا تھا۔ شاید ریل بازار تھا
یا کچہری بازار تھا۔ کافی کشادہ بازار تھا۔ اس بازار میں ایک زمیندار ہوٹل ہوتا تھا۔ شاید اب
بھی ہو۔

سرگودھا پہنچنے کے بعد ہم سب نے اس ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اصلی دیسی
گھی میں بھنے ہوئے مرغ کا بے حد لذیذ سالن تھا۔ تندور کی گرم گرم اعلیٰ آٹے کی روٹیاں
تھیں۔ جن میں سے باداموں کی خوشبو آ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد سردار خان اور
دوسرے ڈرائیور حقہ لے کر بیٹھ گئے۔ چلم میں خاص دیسی سوکھا ہوا تمباکو گڑ ڈال کر بھرا ہوا
تھا۔ اس کی دھوئیں کی خوشبو مجھے بے حد اچھی لگی۔ ایک دو کش میں نے بھی لگائے لیکن
تمباکو بڑا سخت تھا۔ میں نے پاسنگ شو کا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ پاسنگ شو مڈل کلاس کا بڑا
شریف اور مدبر اور سفید پوش سگریٹ ہوا کرتا تھا۔ اس کے تمباکو کی خوشبو اور ذائقہ ہی سب
سے الگ تھا۔ دوسرے روز میں منہ اندھیرے اٹھ کر ریلوے پھاٹک کی دوسری طرف
کھیتوں میں سیر کرنے نکل گیا۔ خوب سردی بڑھ رہی تھی۔ کہیں کہیں کھیتوں میں دھند بھی
پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے سرگودھا کے یہ کھیت اور دھند بڑی اچھی لگی۔ میں کھیتوں میں سیر کرتا
دور تک چلا گیا۔

آگے باغ اور اونچے اونچے یوکلپٹس اور ٹاہلیوں کے درخت شروع ہو گئے۔ یہ

پھلدار باغ تھے۔ شاید مالٹوں کے باغ تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں کو ذرا سا ہاتھ لگاتا تو شبنم کے قطرے ٹپکنے لگتے۔ میں نے چلو میں شبنم بھر کر اپنی آنکھوں سے لگائی' اپنے چہرے پر لگائی تو میری آنکھیں اور چہرہ پہلے تو برف کی طرح یخ ہو گیا۔ پھر گرم ہو گیا اور اس سے سینک اٹھنے لگا۔ آہ! یہ نیچر کی پارسائی تھی۔ پاکیزگی تھی۔ یہ میرے لئے قدرت کا بہا انعام تھا۔ میں ایسے خوش ہوا جیسے مجھے دونوں جہان کی دولت مل گئی ہو۔ یہ وہ خوشی تھی دنیا کی ساری دولت دے کر بھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ جو مجھے نیچر کی طرف سے مفت رہی تھی۔ واپس آ کر میں بڑے کمرے کے باہر نلکے کے نیچے بیٹھ کر نہانے لگا۔ چھبی اٹھتی پی بی ایل 2638 کے ڈرائیور نے اتنی سخت سردی میں مجھے باہر نلکے کے نیچے بیٹھ کر نہا ہوئے دیکھا تو کہنے لگا۔

''خدا کا خوف کرو۔ اتنی سردی میں نہا رہے ہو۔ نمونیہ ہو جائے گا۔''

میں سوچنے لگا سخت سردی میں ساری رات گلاب کا پھول شبنم میں شرابور ر ہے۔ اسے نمونیہ کیوں نہیں ہوتا؟ کوئی چیز ہے جو اسے زندہ رکھتی ہے۔ بس مجھے اسی چیز تلاش تھی اور آج بھی اس چیز کی تلاش ہے۔ کپڑے پہننے کے بعد میں نے زمیندارہ ہو میں جا کر ناشتہ کیا اور سردار خان کے پاس چلا گیا۔ سردار خان زمیندارہ ہوٹل کے ا کمرے میں رہتا تھا جو ہوٹل کے بالکل سامنے والی گلی کی نکڑ پر ایک چوبارہ سا تھا۔ سر خان نسواری رنگ کی مخمل کے لحاف میں دبکا حقہ پی رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک رجسٹر د ہوئے کہا۔

''آج دوپہر کے بعد ہماری لاریاں ائرپورٹ پر بجری ڈھونی شروع کر د گی۔ میرا خیال ہے شام تک ہر ایک گاڑی چار پانچ چکر ضرور لگائے گی۔ تم ایک تو صبح اپنے سامنے لاریوں میں پٹرول ڈلوا کر نوٹ کر لیا کرو کہ کتنا پٹرول ڈالا گیا ہے اور پھر شا کو ہر لاری کے ڈرائیور سے حساب لینا کہ کتنے چکر لگائے ہیں اور کتنا پٹرول خرچ ہے۔''

◆.....◆.....◆

اس وقت تو مجھے یہ کام ایک مصیبت معلوم ہوا لیکن بعد میں اس کا عادی ہو گیا۔ اور معلوم ہوا کہ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ میں رجسٹر لے کر پٹرول پمپ پر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا اور نوٹ کرتا جاتا کہ لاریوں میں کتنا پٹرول ڈالا گیا ہے۔ پھر شام کو ہر ایک ڈرائیور کے پاس جا کر چیک کرتا کہ اس نے کتنے پھیرے لگائے ہیں اور کتنا پٹرول خرچ ہوا ہے۔ سارے ڈرائیور ایک جگہ نہیں رہتے تھے۔ چار ڈرائیور تو میدان والے کمرے میں رہتے تھے۔ باقی ڈرائیورز زمیندارہ ہوٹل کی سامنے والی گلی کے ایک چوبارے پر رہتے تھے۔

یہ چوبارہ کرائے پر لیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر ڈرائیور اپنی طرز کی ایک الگ چیز تھی۔ لاری نمبر پی بی ایل 3512 نئی لاری تھی اور اس کا نوجوان ڈرائیور بھی بڑا شوقین مزاج تھا۔ پتلون کوٹ پہنتا تھا اور ریشمی مفلر گلے میں لپیٹا ہوتا تھا۔ بالوں میں خوشبو دار تیل لگا کر ماتھے پر بالوں کا ایک چھلا ضرور بنا لیتا تھا۔ چھبی اٹھتی یعنی پی بی ایل 2638 پرانی اور تباہ حال لاری تھی۔

اس کا ڈرائیور بھی بوڑھا اور دبلا پتلا تھا۔ اور کھڑ کھڑ کرتا تھا۔ ایک روز شام کو ساری لاریاں ائرپورٹ پر بجری اور پتھروں کی روڑی پھینک کر آ گئیں مگر چھبی اٹھتی کا نہ ڈرائیور آیا اور نہ اس کی لاری ہی آئی۔ سب کو فکر لگا کہ آدمی بوڑھا اور کمزور ہے۔ گاڑی بھی بوڑھی اور کمزور ہے۔ کہیں کوئی حرج مرج نہ ہو گیا ہو۔ پہلے تو کچھ دیر انتظار کیا مگر جب رات ہو گئی تو سردار خان نے میری ڈیوٹی لگائی کہ پینتیس بارہ (3512 پی بی ایل) کو لے جاؤں اور دیکھوں کہ چھبی اٹھتی کو کہیں کوئی حادثہ تو نہیں پیش آ گیا۔

میں نے لاری پکڑی۔ ڈرائیور کو لیا اور رات کے اندھیرے میں دھپ سڑی
طرف چل پڑا۔ یہ سڑک اگرچہ پکی تھی مگر چھوٹی سی تھی اور دن کے وقت سنسان ہوتی تھی
رات کو تو وہاں الو بھی بولتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ڈرائیور گاڑی آہستہ چلا رہا تھا اور ہم راستے
میں ادھر ادھر دیکھتے جا رہے تھے۔ سڑک پر کوئی بتی بھی نہیں تھی۔

رات بڑی تاریک اور سرد تھی۔ بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ شاید کہرا بھی پڑ
تھا۔ اس زمانے میں موسم بڑے شدید ہوا کرتے تھے۔ اور سرگودھا میں کچھ زیادہ ہی ٹھ
پڑتی تھی۔ ہم نے لاری کے شیشے چڑھا رکھے تھے مگر لاری کا پچھلا دروازہ غائب تھا
بالکل ٹرک کی طرح تھی اور پیچھے سے ہمیں سرد یخ ہوا کے پھانڈے پڑ رہے تھے۔ دس گیا
میل ہم سڑک پر نکل گئے۔ دائیں بائیں کیکر اور ٹاہلیوں کے درخت سائیں سائیں کر ر
تھے۔ آخر ایک جگہ ہمیں ایک گاڑی نظر آئی۔ گاڑی پکی سڑک سے اتر کر کچے میں چھوٹی
نہر یعنی سوئے کے کنارے کھڑی تھی۔ گاڑی پر ہماری لاری کی روشنی پڑی تو ڈرائیور نے
کہا۔

''چھبی اٹھتی کھڑی ہے۔''

ہم لاری ایک طرف روک کر گاڑی کے پاس گئے۔ یہ اپنی گاڑی تھی۔ کمزور سا
بوڑھا ڈرائیور اگلی سیٹ پر کمبل میں گٹھڑی بن کر سو رہا تھا۔ ہم نے اسے جگایا تو وہ ہڑبڑا کر
اٹھ بیٹھا۔ کہنے لگا۔

''گاڑی کی بیلٹ ٹوٹ گئی ہے۔'' ہم اپنی لاری میں احتیاط کے طور پر ایک رسا
لے گئے تھے۔ دونوں ڈرائیور رسا نکال کر گاڑی کے پیچھے باندھنے لگے۔ میں نے آسمان
کی طرف دیکھا۔ میرے خدا! اتنے چمکیلے، موٹے موٹے، نیلے سرخی مائل اور سفید ستارے
میں نے زندگی میں شاید کبھی نہیں دیکھے تھے۔

میں نے ڈرائیوروں کو وہیں چھوڑا اور نہر کے کنارے چلا گیا۔ فضا شفاف تھی۔
جیسے میرے اور ستاروں کے درمیان کوئی شے حائل نہ ہو۔ نہر کے پانی میں ستاروں کا عکس
پڑ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے نہر میں ہیرے جواہرات کا خزانہ لٹا دیا ہو۔

کیکر کی شاخیں اور پتیاں شبنم میں تر بہ تر تھیں۔ میرا جی واپس سرگودھا جانے کو
نہیں چاہ رہا تھا۔ یہی دل چاہتا تھا کہ اس ہیرے جواہرات والی نہر کے ساتھ ساتھ اوپر کی
طرف چلتا چلا جاؤں اور اس فردوس ارضی تک پہنچ جاؤں۔ جہاں جہاں قدرت کا دریا دل
جوہری اس نہر میں ہیرے جواہرات کے انمول خزانے لٹا رہا تھا۔ لیکن پینتیس بارہ کے
ڈرائیور نے ہارن دے کر مجھے میرے خواب ارضی سے جگا دیا۔

شبنم میں بھیگی ہوئی، سرد خاموش رات نے آسمان پر ستاروں کے زرد جواہر کا
خزانہ کھول رکھا تھا۔ قدرت کے اس حسین منظر سے جدا ہونے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا مگر
مجھے جدا ہونا پڑا۔ خراب گاڑی پی بی ایل 2638 کو ہم اپنی گاڑی کے پیچھے باندھ کر اڈے
پر لے آئے۔

کبھی کبھی مجھے دن کے وقت کسی نہ کسی گاڑی میں بیٹھ کر چیکنگ کے لئے زیر تعمیر
ائرپورٹ پر جانا پڑتا تھا۔ ائرپورٹ پر بڑے زور شور سے کام ہو رہا تھا۔ کہیں رن وے پر
بجری بچھائی جا رہی تھی۔ کہیں بڑے بڑے ٹرکوں کے ذریعے رن وے پر مسالہ ڈال کر اسے
کارپٹ کیا جا رہا تھا۔

مزدوروں میں کہیں کہیں محنت کش دیہاتی خواتین بھی کام کرتی نظر آ جاتیں۔
میں ان عورتوں کی جفاکشی پر بڑا حیران ہوتا تھا کہ یہ کس طرح بجری کی بھری ہوئی ٹوکریاں
اٹھا اٹھا کر رن وے پر ڈال رہی ہیں۔ میرے دل میں ان کے لئے بڑے احترام کا جذبہ
پیدا ہوتا تھا۔

موسم سردیوں کا تھا۔ ایک دن میں اپنے ایک ڈرائیور کی ٹرک نما گاڑی پر سوار
ائرپورٹ سے واپس آ رہا تھا کہ دور سے مجھے سڑک کے کنارے پھلاہی کے درختوں کے
نیچے ایک اونٹ بیٹھا نظر آیا۔ اس کے اوپر سوکھی لکڑیوں کا ٹنگو لدا ہوا تھا۔ ہمارا ٹرک معمول
کی رفتار سے سڑک پر جا رہا تھا کہ اس اونٹ پر ڈرائیور کی نظر پڑ گئی۔ اس نے گاڑی کی سپیڈ
کم کی اور اسے پکی سڑک سے اتار کر کچے پر لے آیا اور گاڑی اونٹ سے ذرا قریب کھڑی
کر دی۔ میں نے پوچھا۔

"گاڑی یہاں کس لئے کھڑی کی؟"

اس گاڑی کا ڈرائیور بڑا خاموش طبع تھا اور بڑی مسکین طبیعت والا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی سے اتر کر دائیں بائیں دیکھا۔ اونٹ کا مالک کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ ڈرائیور نے کلینر سے کہا۔

"ادھر آکر تنگو کو ذرا ہاتھ ڈالو۔"

اور میرے دیکھتے دیکھتے انہوں نے اونٹ کے اوپر سے سوکھی لکڑیوں کا تنگو اٹھایا اور گاڑی کے پیچھے رکھ دیا۔ اس کے بعد ڈرائیور اپنی سیٹ پر آگیا اور گاڑی کو کچے سے نکال کر پکی سڑک پر لایا اور گاڑی دوبارہ اپنی معمول کی رفتار سے چل پڑی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"تم نے غریب اونٹ والے کی لکڑیاں چرالی ہیں یہ اچھا نہیں کیا۔"

ڈرائیور نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلاتا رہا۔

اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ ہماری لاریوں کے اڈے پر ہوا۔ ریلوے پھاٹک کے پاس جس چھوٹے سے میدان میں ہماری لاریاں کھڑی ہوتی تھیں وہاں ایک ایک کافی بڑی کوٹھڑی میں چار پانچ ڈرائیور رات کو سوتے تھے۔ کھانا وغیرہ بھی وہ وہیں پکاتے تھے۔

اس روز ڈرائیور کی پھیرے لگانے کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ وہ کوٹھڑی میں ہی تھے۔ دونوں ڈرائیور ایک دن پہلے پھیرے لگا چکے تھے۔ دن کے دس ساڑھے دس کا وقت ہوگا۔ میں رجسٹر ہاتھ میں لئے ان کے ڈیرے پر پٹرول کا حساب لینے گیا تو ایک ڈرائیور باہر دھوپ میں چارپائی پر چادر کی بکل مارے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

میں اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس ڈرائیور کا نام کچھ اور تھا۔ سب لوگ اسے تھیلا کہہ کر بلاتے تھے۔ تھیلے نے مجھے اپنی گاڑی کے پٹرول کا حساب لکھوایا اور سامنے ریلوے لائن کی طرف دیکھتے ہوئے سگریٹ کے کش لگانے لگا۔

اتنے میں ریل کی پٹڑی پر سے ایک بکری نیچے اتر کر جھاڑیوں میں ادھر ادھر منہ

مارنے لگی۔ پھر وہ چلتی چلتی ہماری چارپائی کے قریب آگئی۔ تھیلے کو نہ جانے کیا سوجھی۔ اس نے چادر اتار دی اور اپنے کلینر کو آواز دی جو کوٹھڑی میں تھا۔

"پھوکے۔ باہر آؤ۔ جلدی۔"

میرے دیکھتے دیکھتے ڈرائیور چارپائی سے اترا۔ بکری چارپائی کی پائنتی کی طرف آگئی تھی۔ ڈرائیور نے ایک دم سے بکری کو گردن سے دبوچا اور گھسیٹتا ہوا کوٹھڑی کی طرف لے گیا۔ اس کا کلینر بھی باہر آگیا۔ تھیلے ڈرائیور نے کلینر سے کہا۔

"اسے پیچھے سے اٹھاؤ۔"

اور وہ بکری کو ڈنڈا ڈولی کر کے کوٹھڑی کے اندر لے گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈرائیور اس قسم کی حرکتیں کرتے ہی رہتے تھے۔ میں چارپائی پر ہی دھوپ میں بیٹھا رہا۔ کوٹھڑی میں سے بکری کے بلبلانے کی دلدوز آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی آواز بند ہوگئی۔ جیسے کسی نے بکری کا منہ بند کر دیا ہو۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور تھیلا صاحب بڑے اطمینان سے کوٹھڑی سے نکلے اور میرے پاس چارپائی پر آکر بیٹھ گئے۔

میں نے اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے کیا کیا ہے۔ اس سے کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ اتنے میں ریلوے لائن کی طرف سے ایک بکروان چھڑی ہاتھ میں پکڑے بکری کی تلاش میں اس طرف آگیا۔ اس نے ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

"میری بکری تو ادھر نہیں آئی۔"

ڈرائیور تھیلے نے بڑا معصوم سا منہ بنا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے تو ادھر کوئی بکری نہیں دیکھی۔"

بے چارا بکروان مایوس سا چہرہ لے کر واپس چلا گیا۔ جیسے ہی وہ ریل کی پٹڑی کی دوسری جانب نگاہوں سے اوجھل ہوا ڈرائیور تھیلا ایک دم سے اٹھا اور بولا۔

"یا میرے مولا!"

یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی میں گھس گیا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں دھوپ

میں وہیں بیٹھا رہا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے بکری کے ممیانے کی ایسی بھیانک آواز سنائی د
کہ میں اپنی جگہ پر کانپ گیا۔ جلدی سے اٹھ کر کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کلینر
پوچھا۔

''کون ہو؟''

میں نے کہا۔

''میں ہوں۔''

اس نے دروازہ کھول دیا۔ اندر جو میں نے منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ ڈرائیور تھ
نے بکری کو کھرے کے فرش پر گرایا ہوا تھا اور اس کی گردن پر چھری پھیر رہا تھا۔ کلینر
جلدی سے دروازہ بند کر کر کنڈی لگا دی۔ تھیلے ڈرائیور نے کلینر سے کہا۔

''پانی ڈالو اوئے۔ پانی ڈالو اس کی گردن پر۔''

کلینر لوٹا اٹھا کر ذبح شدہ بکری کی گردن پر پانی ڈالنے لگا۔ لال لال خو
کھرے میں پھیلا ہوا تھا۔ کوٹھڑی میں جو دوسرا ڈرائیور تھا وہ اپنی چارپائی پر لحاف اوڑھے
بیٹھا تھا۔ کہنے لگا۔

''تھیلے سب سے پہلے مسجد کے مولوی صاحب کو گوشت بھیج کر ختم پڑھوالینا۔''

تھیلے نے جواب دیا۔

''مولوی صاحب کا حق سب سے پہلے ہے۔''

دوسری جنگ عظیم بس ختم ہی ہونے والی تھی چنانچہ ہم سرگودھا کے اس زیر تعم
ائیرپورٹ کو ادھورا چھوڑ کر لاریاں لے کر امرتسر واپس آگئے تھے کیونکہ ہمارے وہاں ہوتے
ہوئے ہی جنگ ختم ہوگئی تھی۔ انگریز کا زمانہ تھا۔ شراب کھلے عام تھی مگر حیرت کی بات ہے
کہ ان ڈرائیوروں میں سے کوئی بھی شراب نہیں پیتا تھا۔ دو تین ڈرائیور چرس ضرور پیتے
تھے۔ کبھی کبھی میں رات کو سخت سردی میں اڈے والی کوٹھڑی میں پھیروں کا حساب نوٹ
کرنے جاتا تو کوٹھڑی کا دروازہ بند ہوتا اور کوٹھڑی کے اندر چرس کی انتہائی ناگوار بو پھیلی
ہوئی تھی۔

میں جلدی جلدی پھیرے نوٹ کر کے باہر نکل آتا تھا۔ ایک اونچا لمبا دبلا پتلا
ڈرائیور اردو پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ اس کو جاسوسی ناول اور رسالے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔
مجھے یاد ہے ایک رات میں کوٹھڑی میں پھیرے نوٹ کرنے گیا تو وہ دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی
چارپائی کے قریب رکھے لالٹین کی روشنی میں بڑے انہماک سے کوئی رسالہ پڑھ رہا
تھا۔ میں اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور رجسٹر پر اس کے پھیروں کا حساب لکھا اور پوچھا۔

''یہ کون سا رسالہ پڑھ رہے ہو؟''

ڈرائیور بولا۔

''عالمگیر رسالہ ہے۔ اس میں ایک انگریزی کہانی کا ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ
ایک انجن ڈرائیور کی کہانی ہے جو صبح صبح ٹرین لے کر دوسرے شہر جاتا ہے اور جب ٹرین
اس کے کوارٹروں کے سامنے سے گزرتی ہے تو تین بار وسل دیتا ہے جس کو سن کر اس کے
بچے مکان سے نکل کر دوڑتے ہوئے ٹرین کی طرف جاتے ہیں اور دور کھڑے اپنے بابا کو
ہاتھ ہلاتے ہیں۔''

میں نے ابھی کہانیاں افسانے لکھنے شروع نہیں کئے تھے۔ لیکن کہانیاں پڑھنے کا
بڑا شوق تھا۔ خاص کر انگریزی کہانیوں کے ترجمے ضرور پڑھتا تھا۔ مجھے ڈرائیور کا بیان کیا
ہوا منظر بڑا اچھا لگا۔ ریل گاڑیاں دیکھنے کا ویسے بھی مجھے بڑا شوق تھا۔ کھیتوں کے درمیان
سے چھک چھک کرتی گزرتی ریل گاڑی مجھ پر ایک طلسم سا طاری کر دیتی تھی اور میں اسے
دیکھتا رہ جاتا تھا۔

ریل گاڑی میں مجھے ایک رومانس کی کیفیت ملتی تھی۔ یہ سارا رومان کوئلے سے
چلنے والے دیوپیکر انجن کی سیٹی کی آواز اور اس کی ہیبت ناک گڑگڑاہٹ میں تھا۔ جب یہ
انجن سینہ تانے دھواں اڑاتا وسل پر وسل دیتا شاہانہ دبدبے کے ساتھ زمین کے سینے کو
دہلاتا سامنے سے آ کر گزر جاتا تو دل پر قدرت کی ہیبت اور جلال سا طاری ہو جاتا۔ اب
ڈیزل کے بدشکل بھدے انجنوں میں وہ بات، وہ رومانس کہاں۔

اب ریلوے انجن ایسے گزر جاتا ہے جیسے کوئی بہت بڑی مشین گزر گئی ہو۔ وہ

رومانس ختم ہوگیا۔ اس زمانے میں ریل گاڑی کی ایک اپنی ثقافت تھی۔ ایک اپنا کلچر تھا۔ اس کلچر میں مختلف آوازیں، منظر اور خوشبوئیں شامل تھیں۔ گارڈ کی سیٹی کی آوازیں، ریل گاڑی کے دوڑتے ہوئے پہیوں کے ریل کی پٹڑی سے ٹکرانے کی آوازیں۔ پلیٹ فارم پر پھیری لگانے والوں کی چائے گرم، چائے گرم کی آوازیں۔ مسافروں کا شور، ڈبوں کے اندر تازہ بھرے ہوئے رنگ روغن کی خوشبوئیں۔ دھواں اڑاتے دہکتے پتھر کے کوئلوں کی خوشبوئیں، پلیٹ فارم پر چائے، سگریٹ کے دھوئیں اور پان کی لطیف خوشبوئیں اور پھر ان سب خوشبوؤں اور آوازوں میں ہر سٹیشن کے شہر کی اپنی خوشبوئیں' اپنی آوازیں' ڈیزل انجنوں نے ریل گاڑیوں کے کلچر اور ثقافت کی ساری لطافتیں ختم کر دی ہیں۔ اب ریلوے سٹیشن پر جا کر دیکھو تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شہر میں غدر مچ گیا ہے اور لوگ افراتفری کے عالم میں شہر چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔

ہمارے سرگودھا والے لاریوں کے اڈے کی ریلوے لائن پر سے کوئی گاڑی گزرتی تو میں اسے بڑے شوق سے دیکھتا۔ اگر میں ڈرائیوروں کی کوٹھڑی میں بیٹھا ہوتا تو ریل گاڑی کے انجن کی آواز سن کر فوراً باہر آ جاتا۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ ریل گاڑی کے ڈبوں کے رنگ سرخ ہوا کرتے تھے۔ صرف فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں کے رنگ سبز ہوتے تھے۔ جو گاڑی پشاور سے کلکتے جاتی تھی اور جس کا نام ہوڑہ ایکسپریس تھا وہ ساری کی ساری سبز رنگ کی ہوتی تھی۔ یہ گاڑی اتنی تیز چلتی تھی کہ جب یہ پوری رفتار سے جارہی ہوتی تھی تو کھڑکی سے منہ باہر نکال کر سامنے کی جانب دیکھا نہیں جاتا تھا۔

یہ بات بڑی مشہور تھی کہ ہوڑہ ایکسپریس دلی سے آگے جا کر طوفان میل بن جاتی ہے۔ شاید اسی گاڑی یا پھر فرنٹیئر میل کو طوفان میل بھی کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بلکہ ہمارے بچپن کے زمانے میں طوفان میل نام کی ایک فلم بھی آئی تھی۔ یہ فلم بمبئی کی رنجیت مووی ٹون کی بنی ہوئی تھی اور اس میں اس زمانے کی سٹنٹ فلموں کے مشہور اداکاروں مثلاً ای بلیموریا، ایشور لعل، ڈکشٹ، چارلی، غوری، کیسری، مادھوری اور خاتون نے کام کیا تھا۔ اس کا ایک سین بے حد مشہور ہوا تھا۔ یہ سین بہت بڑے بورڈ پر پبلسٹی کے

ے بھی اور فلم کے اشتہاروں پر بھی بنایا گیا تھا۔

اس سین میں فلم کے ہیرو کو ریلوے انجن کے اگلے چھجے پر جھکے نیچے ریل کی پٹڑی پڑے ہوئے ایک بچے کو اٹھاتے دکھایا گیا تھا۔ فلم میں جب یہ سین آتا تھا تو ہال میں سناٹا ا جاتا تھا اور جب ہیرو چلتے انجن کے چھجے پر سے جھک کر ریلوے پٹڑی پر سے لڑکے کو ٹھا لیتا تھا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھتا تھا۔ یہ سین اس فلم کی ہائی لائٹ تھا۔ یہ فلم کئی ے چلی تھی۔ اس سین کی بعد میں بلکہ اب تک فلموں میں نقل اتاری جاتی ہے۔ اس زمانے ے سرگودھا شہر میں بھی ایک سینما ہاؤس تھا۔ یہ سینما ہاؤس بڑی شکستہ حالت میں تھا۔

شاید یہ پہلے تھیٹر ہوا کرتا تھا۔ اس کی چھت بڑی اونچی تھی اور اس کے چھت میں بوتروں نے گھونسلے بنائے ہوئے تھے۔ چلتی فلم کے دوران کبوتروں کی غٹرغوں کی آوازیں تی رہتی تھیں اور تماشائیوں پر اوپر سے کبوتروں کی بیٹیں بھی گرتی رہتی تھیں۔ ان دنوں اس ینما ہاؤس میں ''بھگت کبیر'' نام کی فلم لگی ہوئی تھی جس میں مظہر خان اور بھارت بھوشن نے ام کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ بھارت بھوشن کی پہلی فلم تھی۔ وہ بھگت کبیر بنا ہوا تھا۔ اس فلم ے بعض سین آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

◆......◆......◆

اس زمانے میں ابھی میں نے بھگت کبیر کو نہیں پڑھا تھا۔ کئی سالوں کے
جب میں نے کہانیاں افسانے اور ناول لکھ کر نام پیدا کر لیا تھا تو صوفی شاعروں کا مطا
کرتے ہوئے بھگت کبیر کو بھی پڑھا۔ یہ شخص خدا کی وحدانیت کو ماننے والا اور خدا سے
کرنے والا شاعر تھا۔ بنارس کا رہنے والا تھا۔ کبیر کی پیدائش کے بارے میں ایک روا
بڑی مشہور ہے کہ بنارس کا ایک مسلمان جولاہا نیرو نامی اپنی بیوی نیما کے ساتھ جا رہا تھ
اس نے تالاب کے کنارے ایک بچہ پڑا دیکھا۔ مسلمان جولاہا یہ بچہ اٹھا کر گھر لے آ
اس کی پرورش کرنے لگا۔ اس نے بچے کا نام کبیر رکھا۔ بڑے ہو کر کبیر فقیر بن گئے
میں بیٹھ کر کپڑا بنتے اور پھر بازار لے جا کر بیچ آتے۔ دو چار آنے جو محنت کا معاوضہ ملت
میں سے بہت کم اپنے پاس رکھتے اور باقی فقیروں میں بانٹ دیتے۔ کبیر ایک خدا
ماننے والے تھے اور بت پرستی کے سخت خلاف تھے۔ کبیر کا کلام ظاہر کرتا ہے کہ ان کے
و دماغ پر اسلام کا گہرا اثر تھا۔ کبیر صاحب کا مزار مگھر ریلوے سٹیشن کے قریب آدھ م
ہے۔ راستہ صاف نہیں ہے۔ مزار ایک پختہ چار دیواری میں ہے۔ اس کے دو دروا
ہیں۔ احاطہ کے اندر چند مکان شاگرد پیشوں کے بنے ہوئے ہیں جو اب غیر آباد ہیں۔
پر املی کے دو درختوں نے سایہ کر رکھا ہے۔ 28 ربیع الثانی کو عرس ہوتا ہے۔

یہ پاکستان کے قیام سے پہلے کا زمانہ تھا۔ ابھی ہندوستان پر انگریزو
حکومت تھی۔ سرگودھا میں ہندو اور سکھ بھی رہتے تھے مگر زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی
مسلم بہت کم تھے۔ ان دنوں سرگودھا بڑا پرسکون تھا۔ آبادی زیادہ نہیں تھی۔ ہم سردیو

موسم میں وہاں گئے تھے۔ بڑی سخت سردی پڑتی تھی۔ چیزوں میں ابھی ملاوٹ شروع نہیں
ہوئی تھی۔ ہر شے میں سے اس کی اصلی خوشبو آتی تھی۔ ابھی ایسنس کا بھی رواج نہیں چلا
تھا۔ ملاوٹ سے تو جہاں تک میرا خیال ہے لوگ ناواقف تھے۔ سرگودھا کے کچہری بازار
(غالباً یہی نام تھا بازار کا) کے زمیندار ہوٹل میں دوپہر کے وقت دیسی گھی کے تڑکا لگانے کی
خوشبوئیں اڑا کرتی تھیں۔ آج کل تو یہ خوشبو اجنبی لگتی ہے۔ اس زمانے میں یہ خوشبوئیں
عام تھیں۔ میں اور دو ایک خوش لباس ڈرائیور اپنے مینیجر سردار خان کے ساتھ اس ہوٹل میں
کھانا کھایا کرتے تھے۔ کھانے کے بعد جب لپٹن چائے پکتی تھی تو اس کی خوشبو مجھے اڑا کر
بنگال اور سری لنکا کے چائے کے باغات میں لے جاتی تھی۔ ایک لاری کا مالک خود ڈرائیور
بن کر ساتھ آیا تھا۔ وہ بڑے صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا اور کریون اے کے سگریٹ پیتا
تھا۔ کریون اے کے سگریٹ اس زمانے میں سب سے مہنگے سگریٹوں میں شمار ہوتے تھے۔
اسے کالی بلی والی ڈبی بھی کہتے تھے۔ ہر سگریٹ کا ذائقہ اور فلیور الگ ہوتا تھا۔ تمباکو خالص
ہوتا تھا۔ اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ دو پیسے والی سب سے سستی
تار کی ڈبی کے سگریٹوں میں بھی خالص تمباکو ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ گھٹیا تمباکو ہوتا تھا یعنی تمباکو
کی جڑیں اور ڈنٹھل کوٹ کر بھرے ہوتے تھے۔

سرگودھا سے امرتسر آتے اور امرتسر سے سرگودھا ریل گاڑی میں جاتے ہوئے
چنیوٹ سے آگے سرخ رنگ کی پہاڑیاں مجھے بہت پسند تھیں اور پھر جب گاڑی دریائے
چناب کے دونوں عالی شان پلوں پر سے گزرتی تو میں کبھی نیچے دریا کو دیکھتا اور کبھی اردگرد
کے پہاڑی سلسلے کو دیکھتا۔ خشک پہاڑیاں تھیں مگر ان میں ایک عجیب شان جبروت و ہیبت
تھی۔ بے آب و گیاہ اتنی خوبصورت پہاڑیاں میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں اور ان پہاڑیوں
کے درمیان بلندی پر تعمیر کئے گئے دونوں ریلوے پل تو انجینئرنگ کا حیرت انگیز نمونہ ہیں۔
اس علاقے کے لوگ بھی خوش اخلاق، تنومند اور بہادر لوگ ہیں اور کمال کے ہنرمند ہیں۔
چنیوٹ کے لوگوں کی ہنرمندی اور صناعی کی تو ایک دنیا گواہ ہے۔ یہاں کے تاجروں کا
کاروبار جنوبی ایشیا کے کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ بڑے مخیّر اور خوشحال اور دین دار

لوگ ہیں اور چنیوٹ شہر کی عمارتیں تو عجوبہ روزگار ہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوگئی اور سرگودھا کے ہوائی اڈے کا کام وہیں رک گ
انگریزوں کو اب اس ہوائی اڈے کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ ہم بھی اپنی تیرہ لاریاں ل
امرتسر واپس آ گئے۔ میرے دن ایک بار پھر کمپنی باغ اور بڑی نہر کی آوارہ گردیوں
گزرنے لگے۔ عشق کا بخار پھر تیز ہونے لگا۔ سینما کی تھرڈ کلاس کا ٹکٹ دو آنے کا ہوتا
روز کبھی امرت ٹاکیز اور کبھی رائل ٹاکیز اور کبھی پرل ٹاکیز میں ایک فلم دیکھتا۔ کوشش کر
والد صاحب کی نظروں سے دور رہوں لیکن انہیں میری آوارہ گردیوں اور عشق و محبت
ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے کوچوانوں والا سانٹا پکڑ لیا جو انہوں نے خاص طور پر میرے
میرے چھوٹے آرٹسٹ بھائی کے لئے بنوایا تھا۔

ایک دن میں امرت ٹاکیز میں واڑیا موی ٹون کی فلم ''ہنٹر والی'' کا میٹنی شو
کر گھر آیا تو والد صاحب نے سانٹا پکڑ لیا اور مجھے مارا۔ میں نے اسی وقت ایک بار
سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ امرتسر میں ظہور الحسن ڈار میرا دوست ہوا کرتا تھا۔ اس
مضامین اور کہانیاں ''عالمگیر'' رسالے میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اس کا مکان ہمارے
والے محلے میں تھا۔ اسے دنیاوی معاملات کی بڑی سمجھ تھی۔ بڑا ذہین اور عزم و ہمت
نوجوان تھا۔ مجھ سے عمر میں دو چار سال بڑا تھا۔ ہماری بڑی دوستی تھی۔ ہم ایک دو
کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ اس کی بڑی آرزو تھی کہ وہ بمبئی جا کر فلموں کی کہانیاں
میں نے جب گھر سے بھاگنے کا ارادہ کیا تو قرعہ فال ایک بار پھر بمبئی شہر ہی کا نکلا
نے ڈار سے کہا۔

''میں تو گھر سے بھاگ کر بمبئی جا رہا ہوں۔''

ڈار نے بڑی سنجیدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بڑی متانت سے پوچھا۔

''وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

میں نے یونہی کہہ دیا۔

''میں فلموں میں کام کروں گا۔''

ڈار نے ماہرانہ انداز میں میری ٹھوڑی کو ہاتھ سے اوپر نیچے کر کے میرے چہرے
کا جائزہ لیا اور بولا۔

''چہرہ تو تمہارا ٹھیک ہے۔ تم فلموں میں کام کر سکتے ہو۔''

وہ خود فلموں میں کہانی لکھنے کے لئے بمبئی جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ کہنے
لگا۔

''تو پھر میں بھی قسمت آزمانے تمہارے ساتھ ہی بمبئی چلوں گا۔''

ان دنوں وہ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے لاہور ہیڈ کوارٹر میں ملازم تھا اور ہر روز
صبح بابو ٹرین میں جسے سبربر ٹرین بھی کہتے تھے امرتسر سے لاہر جاتا اور شام کو اسی ٹرین میں
واپس آ جاتا تھا۔ ہم دونوں نے گھر سے بھاگ کر بمبئی جانے کا پروگرام طے کر لیا۔ کچھ
پیسے میں نے اپنی والدہ اور بہنوں سے لے کر جمع کر رکھے تھے۔ ڈار نے بھی کچھ رقم اپنے
پاس رکھ لی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ریلوے کی نوکری چھوڑ کر میرے ساتھ بمبئی جائے گا لیکن
وہ بڑا دنیادار اور سمجھدار لڑکا تھا۔ اس نے دفتر سے ایک ماہ کی چھٹی لے لی اور مجھے بالکل
نہیں بتایا۔ بھاگنے کا ایک دن مقرر ہو گیا۔ ہمیں صبح کی گاڑی پکڑنی تھی۔ اب یاد نہیں دن
کے وقت بمبئی جانے والی کون سی گاڑی لاہور سے آتی تھی۔ ہم دن کے آٹھ سوا آٹھ بجے
الگ الگ راستوں سے امرتسر کے ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ سولہ سترہ روپے کا بمبئی کا تھرڈ
کلاس کا ٹکٹ آتا تھا۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور پلیٹ فارم پر آ کر ٹرین کا انتظار کرنے
لگے۔ ہم دونوں کے پاس ایک ایک چھوٹا سا اٹیچی تھا جس میں ہمارا ایک ایک جوڑا کپڑوں
کا اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ تھے۔

مجھے والد صاحب کے جاسوسوں کا ڈر لگا تھا کہ ان میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا
تو سارا کام خراب ہو جائے گا لیکن ٹرین آ گئی اور ہم ایک ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔ جب
تک ٹرین کھڑی رہی میرے دل کو دھڑکا لگا رہا۔ آخر ٹرین چل پڑی۔ جب ٹرین شریف
پورے سے بھی آگے نکل گئی تب مجھے اطمینان ہوا کہ اب میں آزاد ہوں۔ بمبئی میں ظہور کا
کوئی جاننے والا تھا جو ہفتہ وار فلمی رسالہ نکالتا تھا۔ ہم بمبئی میں اس کے پاس جا کر ٹھہر

گئے۔ کچھ روپے ہمارے پاس تھے چنانچہ ہم ناشتہ اور کھانا وغیرہ ایرانی ہوٹل میں کھا
تھے۔ ہمارے میزبان کی فلم انڈسٹری میں کافی واقفیت تھی۔ اس کے ساتھ ہم اس زما
کے دو چار فلم ڈائریکٹروں سے بھی ملے مگر کہیں فوری طور پر کام نہ مل سکا۔ سب یہی کہ
آتے جاتے رہیں کام مل جائے گا۔ اتنی دیر ہم بمبئی ایسے شہر میں کسی کے مہمان بن کر
نہیں سکتے تھے۔ ہمارے پیسے بھی ختم ہو گئے۔ میزبان نے بھی ہمیں کہہ دیا کہ آپ لو
واپس ہی چلے جائیں۔ اس وقت یہاں کام ملنا مشکل ہے۔ ظہور کے پاس واپسی کا کر
تھا۔ میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے بمبئی کے سیر سپاٹوں میں اور فلمیں دیکھ کر سارے
ختم کر دیئے تھے۔ ایک رات ہم بمبئی کے بوری بندر کے سٹیشن سے ٹرین میں سوار ہو گ
ظہور کے پاس ٹکٹ تھا۔ میرے پاس نہیں تھا۔ میں بغیر ٹکٹ بیٹھ گیا تھا اور مجھے کوئی فکر نہ
تھا۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی مجھے عادت تھی۔ لیکن یہ لمبا سفر تھا راستے میں شاید جہاں ش
ہوشنگ آباد سٹیشن پر ایک ٹی ٹی ٹکٹ چیک کرنے ہمارے ڈبے میں آ گیا۔ مجھ سے ٹکٹ
تو میں نے کہا۔ میری جیب کٹ گئی تھی اس لئے بغیر ٹکٹ بیٹھ گیا ہوں۔ ٹکٹ چیکر نے
بڑے آرام سے ٹرین سے نیچے اتار دیا کہ میں تمہیں یہی سزا دے سکتا ہوں۔ ٹرین آ
نکل گئی اور میں اجنبی سٹیشن پر اکیلا کھڑا ٹرین کو نظروں سے دور ہوتے دیکھتا رہا۔

بمبئی سے ٹرین رات کے ساڑھے نو بجے کے قریب چلی تھی اور جس وقت ٹی ٹی
مجھے ہوشنگ آباد (شاید یہی نام تھا اس سٹیشن کا) کے سٹیشن پر اتار دیا تو ٹرین کے پلیٹ فا
خالی کر دینے کے بعد میں نے سٹیشن کی گھڑی پر وقت دیکھا تو رات کے تین بجنے وا
تھے۔ میری عمر اس وقت کتنی ہو گی؟ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا لیں کہ میٹرک
جماعت سے بھاگا تھا۔ میرا جو چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا جس میں کپڑوں کا ایک جوڑا وغیرہ
وہ بھی میں اپنے ساتھ نہیں لا سکا تھا۔ خیر اس کی مجھے پروا نہیں تھی۔ مجھے اس کا بھی کچھ زیا
فکر نہیں تھا کہ رات کے تین بجے اپنے شہر امرتسر سے سینکڑوں میل دور ایک اجنبی شہر
سٹیشن پر اکیلا ہوں۔ پیسہ دھیلا بھی پاس نہیں ہے۔ کیا کروں گا۔ کہاں سے کھاؤں گا
وغیرہ وغیرہ۔ میرا جو ایڈونچر اور خانہ بدوشی کا شوق تھا وہ مجھے پر لگا کر اڑاتا پھرتا تھا۔ م

یقین کریں اس زمانے میں گھر سے بھاگنے کے بعد ایک لمحے کے لئے بھی کبھی نہیں
سوچا تھا کہ جہاں جا رہا ہوں وہاں رہوں گا کہاں؟ وہاں سوؤں گا کہاں؟ کھاؤں گا کہاں؟
میرے جذبہ بے اختیار کو دیکھ کر قدرت ہی میرا کچھ خیال کر رہی تھی اور جہاں بھی میں جاتا
تھا وہاں میرا کچھ نہ کچھ اچھا برا بندوبست ہو جاتا تھا اور کہیں رات کو سونے کی جگہ نہیں ملتی تھی
تو بے دھڑک کسی فٹ پاتھ پر ہی لیٹ کر سو جاتا تھا۔ خدا کی قسم فٹ پاتھ پر کم از کم اس
زمانے میں ایسی گہری نیند آتی تھی کہ صبح سڑکیں دھونے والے ٹرک کے پانی کی بوچھاڑ ہی
مجھے جگاتی تھی۔

بس یہی شوق تھا کہ جنگل دیکھوں، جنگلوں کی بارشیں دیکھوں۔ بارشوں میں
بھیگتے درخت دیکھوں۔ نئے نئے شہروں کے لوگ دیکھوں۔ ان شہروں کی گلیاں بازار
دیکھوں۔ وہاں کا میوزک سنوں۔ یہ دیکھوں کہ ان شہروں میں جب سورج طلوع ہوتا ہے تو
آسمان کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ شام کی ہوا کس طرف سے کس طرف کو چلتی ہے۔ دریاؤں
میں کشتیاں چلانے والے مانجھی کون سے گیت گاتے ہیں۔ ان کے دردناک گیتوں کا درد
کہاں سے آتا ہے۔ وہاں کے دریا کیسے ہوتے ہیں۔ ندیاں کون سے جنگلوں سے، کون
سے دریاؤں سے نکل کر بل کھاتی ہوئی بہتی ہیں اور سمندروں کی طرف سے آنے والی
ہواؤں میں ناریل کے درخت کیسے لہراتے ہیں۔ ناریل کا درخت تو ہمارے پنجاب کے
میدانی اور پہاڑی علاقوں میں کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ امرتسر کے کمپنی باغ میں بھی اس کا
کوئی درخت نہیں تھا۔ یہ درخت جنوب مشرقی ایشیا کا بیٹا ہے اور یہ اسی زمین میں پروان
چڑھتا ہے۔ یہ درخت میں نے رسالوں اور کتابوں کی تصویروں میں ہی دیکھے تھے۔ میں
انہیں قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ ان سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔ ان سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔
یہ بھی شوق آوارگی تھا۔ یہی میرا جذبہ بے اختیار تھا۔

رات کے تین بجے بغیر ٹکٹ کے میں ہوشنگ آباد کے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر
ایک بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت میں صرف امرتسر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ ایک بار پھر تازہ دم ہو
کر بمبئی شہر پر اپنے ایڈونچر کا حملہ کر سکوں لیکن جس گاڑی کو مجھے لے کر امرتسر جانا تھا وہ نکل

چکی تھی اور اس وقت اگر کوئی ٹی ٹی مجھ سے آ کر ٹکٹ طلب کرتا تو دوسرے لمحے میں پلیٹ فارم
سے بھی باہر ہوتا۔ اب میں اسی انتظار میں تھا کہ دلی کی طرف جانے والی کوئی ریل گاڑی
بمبئی کی طرف سے آئے تو میں اس میں بیٹھ کر کم از کم دلی کی طرف تو نکل جاؤں۔
ضروری نہیں تھا کہ اس گاڑی میں بھی ٹی ٹی آ کر مجھے نیچے اتار دے۔

میں نے کرتا پاجامہ اور چمڑے کے بوٹ پہن رکھے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔
اس علاقے میں بارشیں شروع ہو گئی تھیں۔ بارش نہ بھی ہو تو آسمان پر بادل چھائے رہتے
تھے۔ کبھی حبس ہو جاتا تھا اور کبھی ہوا چلنے لگتی تھی۔ اس وقت بھی سٹیشن پر خوشگوار ہوا چل رہی
تھی۔ میں بنچ پر بیٹھا ریلوے لائن کی اس جانب دیکھ رہا تھا جدھر بمبئی شہر تھا۔ ایک آدمی
میرے قریب سے گزرا۔ میں نے اس سے دلی جانے والی گاڑی کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ
دلی کی طرف جانے والی گاڑی آدھے گھنٹے میں آئے گی۔ میں مطمئن ہو گیا کہ یہاں رات
نہیں گزارنی پڑے گی۔ بیٹھے بیٹھے مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی اور میں واقعی بنچ پر سر پیچھے
کر سو گیا۔ ایک بڑے زبردست شور نے مجھے جگا دیا۔ کوئی ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو
رہی تھی۔ اس کا دیوہیکل انجن زبردست شور مچا رہا تھا۔ میں نے سوتی جاگتی حالت میں ایک
آدمی سے پوچھا کہ یہ گاڑی دلی جائے گی؟ اس نے جواب دیا۔

''ہاں اسی طرف جائے گی۔''

میں نے اس کے جملے پر غور نہ کیا کہ یہ گاڑی دلی نہیں بلکہ دلی کی طرف جا رہی
تھی۔ مجھ پر اس وقت نیند کا غلبہ تھا۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح ٹرین کے کسی ڈبے میں گھس کر
جاؤں۔ چنانچہ ٹرین کھڑی ہوئی تو میں جو ڈبہ سامنے آیا اس میں گھس گیا۔ مسافر سو رہے
تھے۔ دو ایک مسافر جاگ رہے تھے۔ کسی سیٹ پر کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں ڈبے کے فرش پر
ہی ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور سر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میری دونوں جانب مسافروں کے
ٹرنک اور گٹھڑیاں وغیرہ پڑی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھ پر دوبارہ نیند طاری
ہو گئی۔ میں سو گیا۔

نیند میں ہی مجھے محسوس ہوا کہ ٹرین چل پڑی ہے۔ اس کے بعد مجھے ٹرین کا کوئی

ہوش نہ رہا کہ چل رہی ہے یا نہیں چل رہی۔ جس وقت دھچکا لگنے سے آنکھ کھلی تو باہر
روشنیوں کا عکس ڈبے میں پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں نے دروازے کی کھڑکی میں
سے باہر دیکھا۔ ٹرین کسی سٹیشن کو چھوڑتی ہوئی پوری رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ پتہ
نہیں کونسا سٹیشن تھا۔ مجھے یہی اندازہ تھا کہ دلی صبح کے وقت یا پھر دوپہر کے وقت آئے گا۔
میں پھر سو گیا۔ دوسری بار جب آنکھ کھلی تو صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ ڈبے کے
مسافروں کے چہرے نظر آنے لگے تھے۔ اس علاقے کے لوگوں کے زرد زرد چہروں سے
میں واقف تھا۔ یہ تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ زیادہ تر مسافر دیہاتی تھے۔ میں نے دیکھا کہ
جہاں میں دروازے کے قریب فرش پر بیٹھا تھا وہاں میرے پاس ہی سیٹ پر ایک دبلی پتلی
زرد چہرے اور اداس سی آنکھوں والی ایک لڑکی بھی بیٹھی تھی۔ وہ ابھی ابھی سیٹ پر سے سو کر
اٹھی تھی اور اپنے سیاہ بالوں کو پیچھے باندھ رہی تھی۔ اس نے ہلکے کاسنی رنگ کی معمولی ساڑھی
پہنی ہوئی تھی۔ ماتھے پر بندیا لگی تھی۔ اس کی سامنے والی سیٹ پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا
کٹورے میں پانی پی رہا تھا۔ پانی پی کر اس نے لڑکی سے کہا۔

''رمکلی! پانی پی لے۔ اپنے گاؤں کا سٹیشن آ رہا ہے۔ گھر چل کر ہی کچھ بھوجن
کریں گے۔''

اس لڑکی کا نام رمکلی تھا۔ لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بال باندھ کر اس نے اپنی
ساڑھی کو درست کیا اور کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور باہر دیکھنے لگی۔

❖......❖......❖

ٹرین فل سپیڈ سے جا رہی تھی۔ لڑکی کا رخ میری طرف تھا اور میں اسے پوری طرح سے دیکھ سکتا تھا۔ میں جس عمر میں تھا اس عمر میں مجھے ہر لڑکی اچھی لگتی تھی کہ میں ہر لڑکی سے پیار کرنے لگ جاتا تھا۔ یہ میری حماقت تھی۔ لیکن اس قسم کی حماقتیں اب مجھے بڑی قیمتی اور انمول لگ رہی ہیں اور افسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے جدا ہو گئی ہیں اور مجھے خشک اور بے رس عقل کے حوالے کر گئی ہیں جس کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ اپنی عادت کے مطابق مجھے اس وقت اس دبلی پتلی اداس آنکھوں والی لڑکی سے پریم ہو گیا۔ اس زمانے میں محبت نہیں ہوتی تھی۔ پریم ہوتا تھا۔ یہ پریم کا لفظ کتابوں رسالوں کی کہانیوں اور فلموں میں بڑا چلتا تھا۔ تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا اور پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں۔ اس قسم کے گانوں کے ریکارڈ پر شہر کے ہوٹلوں میں بڑے بجا کرتے تھے۔

ایک دو بار لڑکی نے بھی میری طرف دیکھا۔ جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں ہم نے فوراً اپنی اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔ ایک بار ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں تو مجھے ایسے لگا جیسے لڑکی میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔ محبت میں بدگمانیاں بھی بہت ہوتی ہیں اور خوش فہمیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔ انسان یہی سمجھنے لگتا ہے کہ لڑکی تو مجھ پر جان چھڑکنے لگی ہے۔ وہ میرے بغیر اب رہ نہیں سکے گی۔ حالانکہ بہت ممکن ہے کہ لڑکی کو کچھ پتہ بھی نہ ہو کہ یہ جو ریل کے ڈبے کے دروازے کے پاس بیٹھا ہے کون ہے۔ کوئی ہے بھی یا نہیں لیکن عشق تو نام ہی ایک خوبصورت اور لطیف خیال کا ہے۔ عشق کے خیال ہی سے میرے ایسا آدمی خیال و خواب کی دنیا میں نکل جاتا ہے۔ مجھے تو خیال و خواب

کی دنیا میں نکل جانے کا کوئی بہانہ چاہئے۔

ٹرین کی رفتار ہلکی ہونی شروع ہو گئی تھی۔

ٹرین دریا کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ لڑکی کے بوڑھے چچا یا دادا نے لڑکی سے کہا۔

"ڈھلکر آ گیا بٹیا۔"

بوڑھے نے دریا کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"جے ریدا دیوی کی جے۔"

اور صدری کی جیب میں سے دو پیسے نکال کر لڑکی کو دیئے۔

"یہ لو رمکلی! دیوی کی بھینٹ کر دے۔"

لڑکی نے پیسے لے کر نیچے دریا میں پھینک دیئے۔ اس کے چہرے پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی اور اس کے بالوں کی ایک لٹ ہوا میں اڑتی ہوئی بار بار اس کے ماتھے پر گر رہی تھی۔ میرے خرمن ہوش و حواس پر بجلی گرانے کے لئے بس اتنا ہی کافی تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر یہ لڑکی مجھ سے جدا ہو گئی تو مجھے ساری زندگی چین نصیب نہ ہو سکے گا۔ لڑکپن کی محبتیں بھی کتنی معصوم اور کس قدر ناپائیدار اور کس قدر اثر انگیز ہوتی ہیں۔

کوئی سٹیشن آ گیا تھا۔ گاڑی بہت آہستہ ہو گئی تھی۔ لڑکی نے سیٹ پر بچھائی ہوئی دری اور چادر لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی تھی اور کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے لڑکی ایک بار پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی ہے۔ مجھ پر عشق کا بھوت اور زیادہ سوار ہو گیا۔ میں یہ بھوت کا لفظ نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ عشق کے ساتھ یہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔ لیکن اب ایسا ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔

اول تو آج کل عشق ہوتا ہی نہیں۔ اگر بڑی مشکل سے عشق ہو بھی جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس پر عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ لوگ عشق کرنا بھول گئے ہیں یا پھر لوگوں کو زر پرستی اور ہوس پرستی کا شکار ہوتے دیکھ کر عشق بوریا بستر اٹھا کر بھاگ گیا ہے لیکن جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں عشق کی بڑی بہار تھی۔ لوگ بڑے شوق سے

عشق کرتے تھے۔ دوسرا کام کاج لوگ اس لئے جلدی جلدی کر لیتے تھے کہ انہیں کام کاج سے فارغ ہو کر عشق بھی کرنا ہے۔ بڑے بوڑھوں کی زبان پر بھی عشقیہ گیت ہوتے تھے۔ ہماری گلی میں ایک بڑا پرہیز گار بوڑھا درزی ہوا کرتا تھا۔ وہ کپڑے سیتے ہوئے نیو تھیٹرز کا فلمی گیت گاتا رہتا تھا۔

سندر ناری سندر پیاری
پیاری چھب دکھلائے

تکیوں اور باغوں میں ہیر گانے کے مقابلے ہوتے تھے۔ شاید اس لئے اس زمانے میں قتل و غارت گری نہیں ہوتی تھی اور گینگ ریپ کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا کیونکہ لوگ عشق کرتے تھے اور عشق آدمی کی سیرت کو نیک بناتا ہے اور عشق کے درجات کی بلندی انسان کو عشق مجازی کے مقام سے نکال کر عشق حقیقی کی راہ پر لگا دیتی ہے۔

بہر حال یہ تو تصوف کی باتیں ہیں۔ یہ تصوف والے ہی بہتر جانتے ہیں۔ میں تو آپ کو اپنا قصہ سنا رہا ہوں۔ اپنی آپ بیتی سنا رہا ہوں کہ بغیر ٹکٹ کے تھا۔ بے زر بے پر تھا۔ جیب میں چائے کی ایک پیالی پینے کے لئے بھی پیسہ نہیں تھا۔ مگر دل میں عشق کا سمندر جوش مار رہا تھا اور وہ جو اداس آنکھوں والی (کم از کم میں اس خوش فہمی میں تھا کہ اس کی آنکھیں اداس ہیں) لڑکی میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہے اور جس کا نام رمکلی ہے۔

مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس سے جدا ہو جانے کے بعد میری دنیا میں سوائے اندھیروں کے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔ اس سے پہلے آٹھویں جماعت میں مجھے فلم ایکٹریس مس نسیم بانو سے عشق ہو گیا تھا تو اس وقت بھی مجھے یقین تھا کہ اگر مس نسیم بانو مجھے نہ مل سکی تو میری زندگی میں اندھیرے اور تاریکیاں چھا جائیں گی۔ مس نسیم بانو مجھے بالکل نہ ملی۔ وہ مجھے مل ہی نہیں سکتی تھی لیکن اس کے نہ ملنے سے میری زندگی میں پہلے سے زیادہ روشنی آ گئی تھی لیکن جب میں اس سے عشق کر رہا تھا تو اس وقت بالکل سچا تھا۔ میرا عشق سچا تھا۔ میرا خدا سچا تھا۔

مجھ میں اور میرے عشق میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ٹرین کسی سٹیشن کے

پلیٹ فارم پر رک گئی۔ لڑکی اپنے بوڑھے باپ یا چچا کے ساتھ ڈبے سے اترنے لگی تو اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میری پوری کائنات میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اس وقت مجھے وہ دبلی پتلی مدراسی لڑکی یاد آ گئی جس نے اپنے بالوں میں موتیے کے ہار سجا رکھے تھے اور جس نے ترچناپلی کے سٹیشن پر ٹرین سے اترتے وقت مڑ کر میری طرف دیکھا تھا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ تم بھی ٹرین سے اتر کر میرے ساتھ آ جاؤ۔ کہاں زندگی برباد کرتے پھرو گے۔ مگر میں سوچتا ہی رہ گیا تھا کہ ٹرین سے اتروں یا نہ اتروں اور ٹرین چل پڑی تھی اور وہ موتیے کے پھولوں والی لڑکی۔ وہ فردوس ارضی کی طرف بلانے والی لڑکی آہستہ آہستہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس بات کو کئی یگ بیت گئے ہیں۔ وہ لڑکی مجھے دوبارہ نظر نہیں آئی۔ نظر آ بھی نہیں سکتی۔ سمندر کے سینے پر ابھر کر واپس سمندر میں تحلیل ہو جانے والی لہر پھر کہاں ملتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ زمانہ ایک بار پھر اپنے ایک گزرے ہوئے منظر کو دہرا رہا ہے۔ اگر اس دفعہ یہ لڑکی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو پھر کبھی کوئی لڑکی میری طرف دیکھ کر نہیں مسکرائے گی۔

بس اس خیال کے ساتھ ہی میں بھی لڑکی کے پیچھے ڈبے سے اتر گیا اور جس طرف لڑکی جا رہی تھی۔ میں بھی اس طرف چلنے لگا۔ یہ کوئی بڑا اسٹیشن نہیں تھا۔ آمنے سامنے اس کے دو پلیٹ فارم تھے۔ درمیان میں ٹرین کھڑی تھی۔ سامنے سٹیشن کا چھوٹا سا گیٹ تھا جہاں سے لوگ ٹکٹ دکھا کر باہر نکل رہے تھے۔ لڑکی اور اس کے بوڑھے باپ کے پاس تو ٹکٹ تھے میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ مگر مجھے سٹیشن سے باہر نکلنے کے سارے گر آتے تھے۔ میں نے دیکھ لیا کہ گیٹ کے دوسری طرف جہاں تانگے وغیرہ کھڑے تھے اس طرف میں ریلوے لائن پار کر کے بھی جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں وہیں سے ریلوے لائن کے ساتھ ہو گیا۔ میں تیز تیز چل رہا تھا کہ کہیں لڑکی میرے پہنچنے سے پہلے کسی تانگے میں بیٹھ کر چلی نہ جائے۔ مگر ریل کی پٹڑی کے ساتھ خاردار اونچا جنگلہ تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔

میں تیز تیز چلنے لگا۔ آخر ایک جگہ خاردار تاروں والی دیوار ختم ہو گئی اور میں دوڑ کر جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کچی سڑک پر آ گیا۔ اتنے میں ایک یکہ میرے قریب سے

بڑی تیزی سے گزر گیا۔ میں نے دیکھا کہ یکے کی پچھلی سیٹ پر وہی اداس آنکھوں والی لڑ
اپنے بوڑھے باپ یا چچا یا دادا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس
آنکھوں میں حیرت تھی۔ میں بے اختیار ہو کر جدھر یکہ گیا تھا اسی طرف دوڑنے لگا۔

یہ میرا دیوانہ پن تھا مگر آج میں اپنے اس دیوانے پن پر اپنی آدھی سے زیا
عقل قربان کر سکتا ہوں۔ افسوس کہ یہ دیوانہ پن مجھ سے بچھڑ گیا۔ میں دوڑتے دوڑتے ج
ہی آہستہ ہو گیا۔ ایک تو یہ کہ یکہ کافی دور نکل گیا تھا۔ دوسرے یہ سوچنے لگا کہ لوگ کیا کہیں
گے۔ بس اسی ایک جملے نے مجھے میری منزل سے دور کر دیا کہ لوگ کیا کہیں گے لیکن جذ
عشق سلامت تھا۔

میں سٹیشن پر واپس نہیں آیا بلکہ جس طرف یکہ گیا تھا اسی طرف چلتا گیا۔ دا
پوری طرح سے نکل آیا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے دھوپ نہیں تھی۔ کچی سڑک آگے جا کر دائ
طرف کو مڑ گئی۔ یکہ اب نظر نہیں آیا لیکن وہ گیا اسی طرف تھا۔

سڑک کی دونوں جانب درخت تھے۔ کچھ دور جا کر سڑک پھر ایک طرف کو
جاتی تھی۔ کئی درختوں کی ٹہنیاں سڑک پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان درختوں نے یکے کو میر
نظروں سے اوجھل کر دیا تھا لیکن میں چلا جا رہا تھا۔ میں اس ذوق و شوق سے جا رہا تھا جیسے
اس لڑکی نے مجھے کسی جگہ ملنے کا وقت دے رکھا ہو جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس لڑکی کے بار
میں سوائے اس کے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ دیہات کی رہنے والی ہے اور ہندو ہے
کیونکہ اس نے ماتھے پر بندیا لگائی ہوئی تھی۔

آگے کھلی جگہ آ گئی جس کی دونوں جانب کھیت تھے۔ اس کے آگے پھر درختوں
سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی طرح چلتے چلتے میں ایک ندی پر پہنچ گیا۔ ندی کا پاٹ چوڑا تھا
ندی کے کنارے ایک جگہ پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو ندی میں اترتی تھیں۔ یہاں
ایک میری عمر کا لڑکا دھوتی باندھے نہا رہا تھا۔ وہ ندی میں بیٹھا ہوا تھا اور بار بار ڈبکی لگا کر
دونوں ہتھیلیوں سے پانی اپنے سر پر ڈال رہا تھا۔

ندی پر کوئی پل نظر نہیں آتا تھا۔ میں وہیں ایک جگہ بیٹھ گیا اور لڑکے کو نہا

دیکھتا رہا۔ لڑکا نہا کر ندی سے باہر نکل آیا اور کپڑے پہننے لگا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ
مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرایا اور بولا۔

''ندی کا پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔ کیا تم اشنان کرو گے؟''

میں نے جواب دینے کی بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔ لڑکا دھوتی کرتا پہن کر میرے
قریب آ گیا۔ کہنے لگا۔

''تم کون سے شہر سے آئے ہو؟''

میں نے کہا۔

''بمبئی سے دلی جا رہا تھا۔ یہ جگہ اچھی لگی۔ گاڑی سے اتر گیا کہ یہاں کچھ روز
سیر کی جائے۔''

لڑکے نے کہا۔

''میرا نام جے دیو ہے۔ تمہارا کیا نام ہے؟''

میں نے یونہی کہہ دیا۔

''میرا نام موہن ہے۔''

لڑکا بولا۔

''تم ہمارے پاس رہ لو۔ میرے پتا جی شمشان بھومی میں مردے جلاتے ہیں۔
یہاں یوگی مت کی پہاڑی ہے۔ اس پہاڑی میں ایک غار ہے جس کے اندر رام جی کی
مورتیاں ہیں۔ میں تمہیں مورتیاں دکھانے لے چلوں گا۔ میری ماتا جی اور بہنیں تو سیتا پور
میں رہتی ہیں۔ میں یہاں پتا جی کے پاس ہوتا ہوں۔ تم نے کچھ کھایا ہے کہ نہیں۔ میرے
ساتھ آؤ۔''

میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ چلتا ہوں شاید اس کے ذریعے مجھے میری گمشدہ
محبت کا کوئی سراغ مل جائے۔ اوپر سے مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ندی آگے جا کر ایک
جنگل میں چلی گئی تھی۔ جنگل کے کنارے پر ایک طرف دو تین کوارٹر سے بنے ہوئے تھے۔
ان کے آگے ایک میدان میں دو اینٹوں کے چبوترے تھے۔ جے دیو نے بتایا کہ ان

چبوتروں پر ہم مردے جلاتے ہیں۔

"پتا جی کہا کرتے ہیں کہ ہم راجہ مہاراجوں کے مردوں کا انتم سنسکار کیا کر
تھے۔ پر اب راجے مہاراجیبوگی نہیں رہے۔ اس لئے ہر جاتی کے مردوں کا کریا کرم کر
ہیں۔"

جے دیو کا ادھیڑ عمر کمزور سا باپ صرف دھوتی باندھے چارپائی پر بیٹھا نار
(حقہ) پی رہا تھا۔ جے دیو نے کہا۔

"پتا جی! یہ موہن ہے۔ بمبئی سے ہمارے گاؤں کی سیر کو آیا ہے۔ میں اسے ا
ساتھ لے آیا ہوں۔ میں اسے یوگی مت کی رام جنی کی مورتیاں دکھانے لے جاؤں گا۔"

جے دیو کا باپ ناریل گڑگڑاتے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک نظر مجھے دیکھا
بولا۔

"اسے کونے والے کوارٹر میں چارپائی ڈال دینا۔"

"اچھا پتا جی۔"

موہن مجھے کوارٹر کے اندر لے گیا۔ ہم نے بوریئے پر بیٹھ کر چاولوں پر دال ڈا
کر بڑے مزے سے کھائے۔ اس کے بعد موہن مجھے رام جنی کی مورتیاں دکھانے یو
مت کی پہاڑی کی طرف لے گیا۔ یہ جنگل کے شروع میں ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا جس
اوپر کسی صدیوں پرانے قلعے کا کھنڈر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ غار جس کے اندر رام جنی
مورتیاں تھیں اس ٹیلے کے اندر بنا ہوا تھا۔ میری جانے بلا یہ رام جنی کی مورتیاں کیا
ہیں۔ غار دیکھنے کا شوق مجھے اس لڑکے کے ساتھ لئے جا رہا تھا لیکن اس غار میں میر
ساتھ کیا گزرنے والی تھی؟ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

یوگی مت پہاڑی کا غار کیا تھا پوری طرح بھول بھلیاں تھیں۔ پہاڑی کے
غاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ایک غار میں سے دوسرا اور دوسرے غار میں سے تیسرا غار
تھا۔ یہ قدرتی غار تھے اور اسی کے اندر دیواروں کے پتھر تراش کر پجاریوں نے عورتو
مورتیاں بنائی ہوئی تھیں۔ کوئی مورتی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ کوئی ڈانس کرنے کے

ی۔ کوئی آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ غاروں کے اندر ہوا آ رہی تھی۔ میں نے جے
سے پوچھا۔
کہنے لگا۔

"یہ غار آگے جا کر پہاڑی کے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ اس طرح ہوا ان
اندر چلتی رہتی ہے۔"

مجھے ان پتھر کی مورتیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جے دیو نے ایک مورتی کو
جوڑ کر پرنام کیا۔ کہنے لگا۔

"یہ رام جنی کی مورتی ہے۔ اس کو تم بھی پرنام کرو۔"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں نہیں کروں گا۔ تم کرو۔"

کہنے لگا۔

"تمہاری مرضی۔ مگر پرنام نہیں کرو گے تو رام جنی کا شراپ (بددعا) لگے گا۔"

میں نے کہا۔

"مجھے کوئی شراپ وراپ نہیں لگتا۔ میں نے مورتیاں دیکھ لی ہیں۔ میں تو باہر جا
ں۔"

جے دیو بولا۔

"اکیلے مت جانا۔ راستہ بھول گئے تو یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ میں
کچھ مورتیوں کی پوجا کر لوں پھر اکٹھے واپس چلیں گے۔"

میں وہیں بیٹھ گیا اور جے دیو سے کہا۔

"اچھا تو پھر تم پوجا کر لو۔ میں یہیں تمہارا انتظار کرتا ہوں۔"

جے دیو بولا۔

"یہاں سے اٹھ کر ادھر ادھر مت جانا میں جلدی آ جاؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ میں بیٹھ کر اپنی اداس آنکھوں والی محبوبہ کے خیال میں گم ہو گیا۔

سوچنے لگا کہ یہاں ضرور آگے کوئی گاؤں ہوگا۔ وہ لڑکی اسی گاؤں میں رہتی ہوگی۔
جے دیو کے ساتھ اس گاؤں میں جا کر لڑکی کو تلاش کروں گا۔ ہوسکتا ہے مجھے اس کا د
نصیب ہو جائے۔ یہ تو میں سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ اگر وہ لڑکی مجھے گاؤں میں مل گئی تو
اس کا کیا کروں گا؟ اس کو کیا کہوں گا؟ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں نے اس سے کوئی بات کی
وہ جوتا اٹھا کر مجھے مارنا شروع کر دے۔ یا پھر شور مچا دے اور گاؤں کے لوگ مجھے مار مار
برباد کر دیں۔ عشق اور پھر لڑکپن کا عشق انجام سے بے نیاز ہوتا ہے۔

بیٹھے بیٹھے جب کافی دیر ہوگئی اور جے دیو نہ آیا تو میں نے دل میں اسے برا
کہا اور اٹھ کر اکیلا ہی واپس چل پڑا۔ اپنی طرف سے میں واپس جا رہا تھا۔ مجھے یقین
کہ میں اسی راستے سے واپس جا رہا ہوں جس راستے سے ہم غار میں داخل ہوئے تھے
جیسا کہ میں نے بتایا ہے پہاڑی کے نیچے غاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور ایک غار میں
دوسری اور تیسری غار نکل کر آگے چلی جاتی تھی اس بھول بھلیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں بھٹ
گیا۔ جس غار میں جاتا وہ آگے ایک اور غار سے مل جاتا۔ میں گھبرا گیا۔ ایک لمحے
مجھے ایسے لگا کہ جیسے میں ان غاروں میں سے کبھی باہر نہ نکل سکوں گا۔

◆......◆......◆

میں نے گھبرا کر جے دیو کا نام لے کر اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ مگر کسی
ف سے بھی جے دیو میری مدد کو نہ آیا۔ شاید میری آواز وہیں غار میں بلند ہو کر دفن ہو
تی تھی۔ یقین کریں مجھے پسینہ آ گیا۔ میں عشق وشق سب کچھ بھول گیا اور دیوانوں کی
ح غاروں میں کبھی ادھر کبھی ادھر دوڑ دوڑ کر باہر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ مجھے یاد آ
یا کہ جے دیو نے کہا تھا کہ یہ غار پہاڑی کی دوسری طرف نکل جاتے ہیں چنانچہ میں ایک
ف تیز تیز چلنے لگا۔

یہ غار سرنگ کی طرح تنگ نہیں تھے بلکہ پرانے قلعوں کی راہ داریوں کی طرح
ے کشادہ تھے اور چھت بھی اونچی تھی اور ہوا بھی آ رہی تھی۔ چلتے چلتے میں کافی آگے
گیا۔ لیکن غار ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ ایک عجیب بات تھی کہ غار میں تاریکی
تھی۔ سارے غاروں میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ خدا جانے یہ روشنی کہاں سے آ
تی۔

میں تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اپنے دل کو قابو میں کیا۔ گھبراہٹ کو دور کیا اور
چنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ یہی فیصلہ کیا کہ جس طرف سے آیا ہوں اسی جانب
چل پڑو۔ آخر یہ غار واپس تو اسی جگہ نہیں آئے گا۔

میں اٹھا اور واپس چل پڑا۔ چلتے چلتے میں پسینے میں شرابور ہوگیا۔ غار ختم نہیں ہو
تھا۔ ایک جگہ غار کی دو شاخیں پھوٹ رہی تھیں۔ اب مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں
طرف سے آیا تھا۔ بس اللہ توکل ایک طرف مڑ گیا۔ سو ڈیڑھ سو قدم چلا ہوں گا کہ غار

بند ہو گیا۔ آگے دیوار آ گئی۔ گھبرا کر واپس مڑا اور جلدی جلدی اسی جگہ واپس آ گیا سے غار کی دو شاخیں پھوٹتی تھیں۔ اب میں دوسرے غار میں مڑ گیا۔ یہ غار بھی آگے بند ہو جاتا تھا۔ سخت پریشانی کے عالم میں پھر اسی جگہ پر واپس آ گیا۔ پریشانی مجھے اس کی تھی کہ پیچھے جانے کا اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ دونوں غار آگے جا کر بند ہو جاتے سخت حیران تھا کہ اگر غار بند ہو جاتے ہیں تو میں کس طرف سے آیا تھا؟

کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ عجیب تذبذب اور حیرانی پریشانی کے عالم میں ایک با میں سامنے کی طرف غار میں تیز تیز چلنے لگا۔ اندر سے میں گھبرا گیا تھا اور پچھتانے لگا میں نے لڑکی کے پیچھے ٹرین سے اترنے کی حماقت کیوں کی۔ مگر اب پچھتانا بیکار تھا۔

میں ایڈونچر پسند ضرور تھا مگر زمین کے اندر قبر کی طرح بند غار کے ایڈونچر کی نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ یہ تو مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی عذاب میں پھنس ہوں۔ میں نے اپنے حواس کو کسی حد تک اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ اور سوچ سمجھ کر اور ایک قدم پر دائیں بائیں طرف سے دیکھ دیکھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک جگہ غار کی دیوار میں ایک طاق سا بنا ہوا تھا۔ یہ لکڑی کا نہیں تھا۔ پتھر کا تھا۔ میں رک کر اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہ پتھر میں سے تراش کر بنایا ہوا ہے۔ میں نے اسے ہاتھ لگا کر آگے کو دبایا تو ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ طاق کی پتھر کی سل اپنی جگہ سے ایک طرف گھوم گئی۔ نے ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ طاق کی دوسری طرف اندھیرے میں پتھر کی سیڑھیاں نظر آ جو اوپر کو جا رہی تھیں۔ اس خیال سے کہ شاید یہیں سے باہر جانے کا کوئی راستہ مل ج میں طاق کے اندر داخل ہو گیا اور زینے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

جیسے ہی میں نے زینے پر قدم رکھا طاق کی سل اپنے آپ بند ہو گئی۔ سیڑ میں اندھیرا ہو گیا۔ میں نے جلدی سے پیچھے مڑ کر طاق کی سل کو زور سے دبایا کہ سل جگہ سے ہٹے اور میں اوپر جانے کی بجائے طاق میں سے نکل کر واپس غاروں میں جاؤں۔ جب دیکھا کہ طاق کی پتھر کی سل کسی طرف سے کھلتی ہی نہیں تو ایک بار تو

آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ دیوار کو ٹٹول کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دس پندرہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد زینہ ختم ہو گیا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا۔ آگے دیوار نہیں تھی بلکہ لکڑی کا دروازہ تھا۔ میں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا تو وہ کھل گیا۔

دوسری طرف سے تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اونچی چھت والا کافی کشادہ دالان ہے جس میں کئی ستون زمین سے چھت تک چلے گئے ہیں۔ میں دالان میں داخل ہو گیا۔ وہاں ویسی ہی پھیکی پھیکی روشنی تھی جیسی غاروں میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ دالان کی دیواروں میں طاق بنے ہوئے ہیں جن میں عورتوں کی پتھر کی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ مورتیوں کی تمام عورتوں کی شکلیں الگ الگ تھیں۔ سب کے بالوں کے جوڑے تھے۔ سب نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ عجیب تماشہ تھا۔ میں نے مورتوں کو تو وہیں چھوڑا اور وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے لگا۔

لیکن دالان کی دیواریں چاروں طرف سے بند تھیں۔ کسی جگہ کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا لیکن میں نے مایوس ہونے کی بجائے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں یہاں سے نکل کر رہوں گا۔ میں جھک کر دیواروں کا جائزہ لینے لگا کہ شاید کسی جگہ باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہو۔ باہر جانے کا تو کوئی خفیہ راستہ نہ ملا لیکن اوپر جانے کا ایک اور زینہ نکل آیا۔ وہ اس طرح کہ ایک جگہ مورتی کے نیچے دیوار کے ساتھ پتھر کی ایک سل لگی ہوئی نظر پڑی۔

میں نے اسے ایک طرف ہٹایا تو اس کے اندر ایک زینہ اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے شگاف میں سر ڈال کر اوپر کی جانب دیکھا۔ سب سے اوپر والی سیڑھی پر ہلکی روشنی تھی۔ یہ سوچ کر میں شگاف میں داخل ہو گیا کہ شاید اسی زینے سے باہر نکلنے کا کوئی سبب بن جائے۔ یہ ایک اوپر کو اٹھی ہوئی سرنگ تھی جس کی دیوار میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

میں دونوں پاؤں ایک جگہ ٹکا ٹکا کر زینے پر چڑھنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر میں نے سر باہر نکال کر دیکھا تو ایک اور دالان تھا جو نیچے والے دالان سے چھوٹا تھا۔ میں

شگاف سے باہر نکل آیا اور دالان کا جائزہ لیا۔ اس دالان میں روشنی نیچے والے دالان سے بہت ہی کم تھی اور اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ اس نیم تاریکی میں مجھے دالان کے وسط میں ایک تابوت نما بکس پڑا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا کہ خدا جانے اس تابوت کے اندر کیا ہے۔

دالان میں صرف وہی ایک تابوت تھا۔ باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ چھت قدرے نیچی تھی اور اس کے جالے نیچے تک لٹکے ہوئے تھے۔ عجیب پراسرار اور ڈراؤنا ماحول تھا۔ میں نے سوچا شاید اس تابوت کے اندر سے کوئی راستہ ان منحوس غاروں سے باہر نکلا ہو۔ میں ڈرتے ڈرتے تابوت کے قریب گیا اور نیم اندھیرے میں جھک کر بڑے غور کے ساتھ تابوت کو دیکھا۔

تابوت کے اوپر بھی ایک عورت کی ابھری ہوئی شکل بنی تھی۔ اس عورت کا بھی جوڑا تھا اور ماتھے پر سیاہ بندیا تھی۔ میں نے تابوت کو کھولنے کی بہت کوشش کی مگر اس کا ڈھکنا اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہلا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ ڈھکنا مضبوط کیلوں سے بند کر دیا گیا ہے۔ تابوت پتھر کا نہیں تھا۔ سیاہ لکڑی کا تھا۔ مجھے امرتسر کے چھاؤنی والے سینما میں دیکھی ہوئی انگریزی دہشت ناک فلمیں یاد آنے لگیں اور خوف سے میرا حلق خشک ہونا شروع ہو گیا۔

میں نے تابوت سے ہٹ کر دالان کی دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ دیواریں پتھر کی تھیں۔ نہ کہیں کوئی کھڑکی یا طاق تھا اور نہ کوئی روشندان ہی تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ تازہ ہوا وہاں بھی محسوس ہو رہی تھی اور سانس لینے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ یہی جگہ میرا مدفن بن جائے گی اور میری لاش تک کسی کو نہ مل سکے گی۔

ٹرین میں ملی ہوئی اداس آنکھوں والی لڑکی پر مجھے کسی چڑیل کا شبہ ہونے لگا جو مجھے اپنی مسکراہٹ کے جال میں پھنسا کر اس جہنم میں لے آئی تھی۔ کسی وقت سوچتا کہ نہیں اس میں اس لڑکی کا کیا قصور ہے۔ یہ سب کچھ مجھے میرے گناہ کی سزا ملی ہے۔ مجھے اپنے

آپ کو ہندو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھا۔

اگر اپنے آپ کو ہندو ظاہر نہ کرتا تو بڑی آسانی سے جے دیو کے آگے ان منحوس غاروں میں آنے سے انکار کر سکتا تھا لیکن مجھے میرا شوق فضول بھی لے ڈوبا تھا کہ ذرا ان پراسرار غاروں کی سیر کی جائے۔ اب میں ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے لگا کہ میں مسلمان تھا اور اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے میں نے گناہ کیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہاں سے نیچے بڑے دالان میں آنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں سخت تھک چکا تھا۔ اوپر سے مایوسی اور ناامیدی دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ مجھ پر غنودگی چھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ میں سو گیا تھا۔ پتہ نہیں پانچ دس منٹ سویا ہوں گا کہ ایک گھنٹے تک سوتا رہا تھا کہ اچانک ایک عجیب سی آواز نے مجھے جگا دیا۔

میں آنکھیں کھول کر نیم اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ یہ آواز کیسی تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی صدیوں سے بند دروازہ کھلتے وقت چرچرایا ہو۔ مگر وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ دیواریں اسی طرح اپنی جگہ پر ساکت کھڑی تھیں۔ دالان کے وسط میں تابوت بھی ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں تھا کہ دن ہے یا شام ہے یا رات ہے۔ بس ایک پھیکا سا اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا کہ شاید اس طرح سے پریشان ذہن کو تھوڑا سا سکون ملے۔ ابھی میں نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ وہی چرچراہٹ کی آواز پھر سنائی دی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے جلدی سے آنکھیں کھول لیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ تابوت کا ڈھکنا آہستہ آہستہ اپنے آپ اوپر اٹھ رہا ہے۔

دہشت کے مارے میرا جسم سرد پڑ گیا۔ میں اٹھ کر وہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ حلق خشک بلکہ کڑوا ہو گیا۔ میں ٹکٹکی باندھے تابوت کو دیکھ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا آہستہ آہستہ کھلتے کھلتے ایک طرف کو ڈھلک گیا اور چاروں

طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ یہ بڑا گہرا، سرد اور ڈراؤنا سناٹا تھا۔ میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی اچھل کر باہر آجائے گا۔

میری نظریں تابوت پر جمی ہوئی تھیں۔

میرے دیکھتے دیکھتے تابوت میں سے نسواری رنگ کے دھوئیں کا غبار سا اٹھنے لگا۔ یہ دھواں مکڑی کے جالے کی طرح کا تھا۔ پتلا اور ٹھہرا ٹھہرا سا تھا۔ تابوت کے اوپر آ کر وہ مکڑی کے جالے کی طرح تن گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ تابوت میں سے ایک انسانی سر آہستہ آہستہ باہر نکل کر اوپر اٹھنا شروع ہو گیا۔

یہ ایک عورت کا سر تھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ عورت کا جسم بہت بڑا تھا۔ یہ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا گیا۔ پھر اس کا سر چھت کے ساتھ لگ گیا۔ دہشت کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ وہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تابوت سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگا ایسی جگہ بیٹھا تھا۔ جہاں ایک تو اندھیرا تھا اور دوسرے میرے آگے ساتھ ساتھ لگے ہوئے دو ستون تھے۔

میں نے سمٹ کر اپنے آپ کو ستونوں کی اوٹ میں کر لیا کہ اس تابوت والی بلا کی مجھ پر نظر نہ پڑے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس بلا کی مجھ پر نظر پڑ گئی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

وہ منحوس عورت ایک بہت بڑے اونچے لمبے جن کی طرح تابوت سے آدھی باہر نکلی ہوئی تھی اور اس کا سر چھت کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی پھر وہ آہستہ آہستہ گھوم کر میری طرف ہو گئی۔ میں مزید سکڑ کر ستونوں کے پیچھے ہو گیا۔ اس کا چہرہ اب میری طرف تھا۔ مجھے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جہاں دو سیاہ سوراخ تھے۔ اور اس کے کان اس کے کندھوں تک لٹکے ہوئے تھے۔ بند ہونٹوں میں سے دو نوکیلے دانت نکل کر نیچے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔

خوف کے مارے مجھے پسینے آ رہے تھے۔ میں سانس لیتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا۔ خدا جانے کیا وجہ تھی کہ ابھی تک اس نے مجھ پر حملہ نہ کیا تھا۔ شاید میں اسے نظر نہیں آ رہا تھا

کیونکہ اس کی آنکھیں نہیں تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو سیاہ گڑھے نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس بلا کے سانس لینے کی صرف آواز آ رہی تھی۔ جب وہ سانس اوپر کو کھینچتی تو سیٹی کی سی آواز نکلتی تھی۔ اچانک یہ بلا چھوٹی ہونا شروع ہو گئی۔ وہ نیچے ہوتی گئی اور پھر تابوت میں بیٹھ گئی۔

اب اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ تابوت میں سے باہر نکل آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا نیچے کا دھڑ غائب تھا۔ اس کی دونوں باہیں لٹک رہی تھیں۔ اس کا اوپر کا دھڑ ہوا میں لٹکا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ جسم پر موت کی بے حسی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے چیخ مارنی چاہی لیکن میری آواز نہ نکل سکی۔ یہ کوئی چڑیل ہی ہو سکتی تھی۔ وہ میرے بالکل سامنے آ کر رک گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ اس کا اب بھی مجھ سے سات آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس کا بازو لمبا ہوتا گیا اور پھر اس کا لمبے نوکیلے ناخنوں والا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھا۔ میں نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔

اس عورت نما چڑیل نے مجھے گردن سے پکڑ کر زمین سے اوپر اٹھا لیا تھا۔ اب میں بھی اس کے ساتھ ہوا میں لٹکنے لگا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب قسم کی دبی دبی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ مجھے اس طرح اٹھائے تابوت کے پاس لے آئی پھر اس نے مجھے تابوت میں پھینک دیا۔ میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے اوپر گرا۔ تابوت کی تہہ میں پتھر بچھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس بلا کے حلق سے ایک بھیانک چیخ کی آواز نکلی جس کے ساتھ ہی میری بھی چیخ نکل گئی۔

اس بلا نے زور سے تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا۔ تابوت کے اندر گھپ اندھیرا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں قبر میں زندہ دفن کر دیا گیا ہوں۔ باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ جس بلا نے مجھے تابوت میں بند کیا تھا اس کے سانس لینے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ تابوت کے اندر میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے دو تین لمبے لمبے سانس لئے اور تابوت کی چھت پر زور زور سے مکے مارنے لگا۔ میں نے دو تین بار ڈھکنے کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اس طرح بند ہو گیا تھا جیسے اب نہیں کھلے گا۔

میں تابوت کی چھت اور دیواروں پر ہاتھ بھی مار رہا تھا اور چلا بھی رہا تھا کہ مجھے باہر نکالو۔ مجھے باہر نکالو۔ اچانک مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں خاموش ہو گیا۔ کوئی تابوت کے قریب آ رہا تھا۔ یہ سوائے اس منحوس بلا کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اپنی حالت پر رونا آ رہا تھا کہ میں خوامخواہ کیوں سٹیشن پر ٹرین سے اتر گیا اور اگر اتر بھی گیا تھا تو مجھے جے دیو کے ساتھ ان غاروں کو دیکھنے نہیں آنا چاہئے تھا۔ باہر سے کسی عورت کی آواز آئی۔

''گھبراؤ نہیں۔ میں تابوت کھول رہی ہوں۔''

یہ آواز کسی عام عورت کی تھی۔ اس بلا کی آواز نہیں تھی۔ میں کان لگا کر سننے لگا۔ باہر سے تابوت کا ڈھکنا کھل گیا۔ ڈھکن کے اٹھتے ہی ایک دم دن کی روشنی ہو گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دالان میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے سامنے ایک لڑکی ہاتھ میں چھتری لئے کھڑی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا تھا۔ میں چونک پڑا۔ یہ وہی ٹرین والی اداس آنکھوں والی لڑکی تھی جس کے عشق میں دیوانہ ہو کر میں ٹرین سے اتر کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔ اور آخر اس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ لڑکی بھی مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ کہنے لگی۔

''تم ریل گاڑی میں تھے۔ یہاں کیسے آ گئے۔؟''

میں اسے کیا کہتا کہ میں وہاں کیسے آ گیا تھا۔ میں تابوت سے باہر نکل آیا تھا۔ دالان کا سارا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ اندھیرا غائب ہو گیا تھا۔ دیواروں کے اوپر قدیم طرز کے روشندان کھل گئے تھے جن میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ چھت کے ساتھ پہلے جو جالے لٹک رہے تھے وہ اب غائب ہو گئے تھے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

''میں کہاں ہوں؟''

اس نے کہا۔

''تم یوگی مت کی پہاڑی والے پرانے مندر میں ہو۔ میں پہاڑی پر جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے آئی تھی کہ مندر میں سے کسی کے چلانے کی آواز سن کر ادھر آ گئی۔''

میں نے کہا۔

''سب سے پہلے مجھے یہاں سے باہر نکالو۔''

وہ مجھے لے کر دالان کی طرف گئی تو وہاں دروازہ تھا جس کے کواڑ نہیں تھے۔ باہر دن کی روشنی ہی روشنی تھی۔ میں سوچنے لگا یہ سب کچھ جو میرے ساتھ ہوا ہے کہیں میں نے دن کے وقت کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا۔ پہاڑی کی ڈھلان اتر کر ہم نیچے آ گئے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

''یہاں جو شمشان بھومی ہے اس کے باوے کا لڑکا جے دیو مجھے رام جنی کے غار دکھانے لایا تھا۔ وہ غار کس طرف ہیں؟''

لڑکی کہنے لگی۔

''وہ ٹیلے کی دوسری طرف ہیں۔ چلو میں تمہیں وہاں لئے چلتی ہوں۔''

میں نے پوچھا۔

''اس مندر میں تابوت کیوں پڑا ہے۔ مندروں میں تو مورتیاں ہوتی ہیں یہ تابوت کہاں سے آ گیا؟''

لڑکی ایک لمحے کیلئے خاموش ہو گئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کہنے لگی۔

''تمہیں اس طرف نہیں جانا چاہئے تھا۔''

ہم ٹیلے کی ڈھلان پر اس جگہ آ گئے جہاں سے غار شروع ہوتے تھے۔ باہر جے دیو کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہیں بڑا تلاش کیا۔''

میں نے کہا۔

''تمہارے غاروں میں بھٹک گیا تھا۔ اس نے مجھے باہر نکالا ہے۔''

''کس نے؟'' جے دیو نے پوچھا۔

❖......❖......❖

میں نے پلٹ کر دیکھا تو اداس آنکھوں والی لڑکی وہاں نہیں تھی۔ وہ تو جیسے کسی چھلاوے کی طرح اچانک غائب ہوگئی تھی۔ جے دیو حیران تھا کہ مجھے کون سی لڑکی غاروں میں سے نکال کر لائی ہے اور میں حیران ہو رہا تھا کہ اداس آنکھوں والی جو لڑکی مجھے تابوت میں سے نکال کر لائی تھی وہ کہاں غائب ہوگئی ہے۔ جے دیو نے پوچھا۔

''تم کس لڑکی کی بات کر رہے تھے؟''

میں نے اسے اداس آنکھوں والی لڑکی کا حلیہ بتایا تو میں نے دیکھا کہ اس لڑکے کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

''وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟''

میں نے اس سے بہت کچھ چھپا لیا۔ صرف اتنا بتایا کہ یہ لڑکی مجھے یوگی مت پہاڑی کی دوسری جانب ملی تھی اور اس نے مجھے یہاں تک کا راستہ بتایا تھا۔ جے دیو خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگا کہ۔

''میرے ساتھ گھر چلو۔''

وہ مجھے اپنے شمشان بھومی والے کوارٹر میں لے گیا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا اور کہنے لگا۔

''اس مکان سے باہر مت نکلنا۔ میں پتا جی کو بلاتا ہوں۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آخر بات کیا ہے۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔ تم یہ سب کچھ کس لئے کر رہے ہو؟''

جے دیو بولا۔

''تم بڑے خوش قسمت ہو کہ اس لڑکی نے تمہیں کچھ نہیں کہا اور تم جان بچا کر آ گئے۔''

جے دیو کی باتوں سے اس لڑکی کے بارے میں میری حیرانی اور میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

جے دیو بولا۔

''موہن بھیا! وہ لڑکی جو تمہیں غاروں میں سے نکال کر لائی تھی وہ ایک بھٹکی ہوئی آتما ہے۔ اس کا نام ترشنا ہے۔ وہ جس آدمی کو دکھائی دیتی ہے وہ آدمی اگلے روز مر جاتا ہے۔ اگر نہ مرے تو ترشنا کی بھٹکی ہوئی آتما خود آ کر اسے مار ڈالتی ہے۔ اب تم یہاں سے باہر نہ نکلنا۔ میرے پتا جی ابھی آ کر تم پر ایسا جادو ٹونہ کر دیں گے کہ ترشنا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

اس سے پہلے کہ میں جے دیو سے کچھ اور پوچھتا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں حیرت میں گم ہوگیا اور سوچنے لگا کہ کیا واقعی یہ لڑکی بھٹکی ہوئی روح ہے؟ اور جس کسی کو ملتی ہے وہ اگلے روز مر جاتا ہے اور اگر نہ مرے تو وہ خود آ کر اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ ساری کہانی مجھے جھوٹی لگ رہی تھی۔ ہندو لوگوں کا عقیدہ بڑا کمزور ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے توہمات پر زبردست یقین رکھتے ہیں۔ مجھے جے دیو کی باتوں پر حیرانی ضرور ہوئی مگر یقین بالکل نہیں آیا تھا۔ یہ کہانی مجھے الف لیلیٰ کی کوئی کہانی کی طرح لگی مگر یہ کہانی ہی تھی۔ محض ایک کہانی جسے لوگوں نے اپنی طرف سے مبالغہ شامل کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔ اس قسم کی من گھڑت اور مبالغہ آمیز کہانیاں میں پہلے بھی ان علاقوں میں ہندو لوگوں کی زبانی بہت سن چکا تھا۔

اتنے میں جے دیو اپنے دبلے پتلے بوڑھے باپ کو لے کر آ گیا۔ اس نے اداس آنکھوں والی لڑکی ترشنا کے بارے میں جو نئی کہانی سنائی وہ یوں تھی کہ ترشنا کے ماں باپ

بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ وہ اسی گاؤں کی رہنے والی تھی اور اپنے ماں باپ کی واحد اولا
تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے دادا نے اس کی پرورش کی۔ جب وہ جوا
ہوئی تو دادا نے گاؤں کے ایک لڑکے سے اس کا بیاہ کر دیا۔ شادی کی پہلی رات اس کا خا
مر گیا۔ اس گاؤں کے لوگ پرانی رسومات کے بڑے سختی سے پابند تھے اور ان میں یہ طے
کہ اگر کسی عورت کا خاوند شادی کی پہلی رات کو مر جاتا تھا تو اس کی نوبیاہتا دلہن کو ا
خاوند کی چتا پر بیٹھ کر ستی ہونا پڑتا تھا یعنی اپنے خاوند کے مردے کے ساتھ خود بھی جل جا
پڑتا تھا۔ لیکن ترشنا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ جل کر نہیں مرے گی چنا
جب ترشنا کے خاوند کی لاش کو جلانے کے لئے شمشان کی طرف لے جانے لگے تو ترشنا گ
سے بھاگ گئی۔ گاؤں والے اس کے پیچھے بھاگے اور اسے دریا کے گھاٹ پر جا کر دبو
لیا۔ ترشنا چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ میں ستی نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے آگ میں نہ ڈالو۔ میں زن
رہنا چاہتی ہوں۔ مگر وہاں اس کی فریاد کون سنتا تھا۔ اس کا بوڑھا دادا بھی اسے نہیں بچا سک
تھا۔ چنانچہ لوگوں نے ترشنا کو زبردستی اٹھا کر چتا کی لکڑیوں پر ہاتھ پاؤں باندھ کر اس
خاوند کی لاش کے ساتھ لٹا دیا اور اس کے اوپر گھی چھڑک کر آگ لگا دی۔ کہتے ہیں کہ آگ
لگتے ہی ترشنا کی خوفناک چیخ بلند ہوئی اور وہ تڑپ کر بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس
دونوں ہاتھ پاؤں لوہے کے تار سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے کپڑوں میں آگ
ہوئی تھی۔ شعلے اس کے جسم کو جلا رہے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ترشنا آگ کے بگولے
طرح چتا کے اوپر گھومنے لگی اور گھومتے گھومتے وہاں کھڑے لوگوں کی طرف بڑھی۔ اس
چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ لوگ جوتیاں چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔ لڑکی ترشنا کے سارے جسم
آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ بگولے کی طرح گھوم رہی تھی۔ گھومتے گھومتے وہ شمشان گھاٹ
احاطے میں چکر لگانے لگی۔ پھر وہ زمین پر گر پڑی اور جل کر راکھ ہو گئی۔ اس کی راکھ ا
ہڈیاں ساری رات وہیں پڑی رہیں۔ صبح اس کا بوڑھا دادا اپنی پوتی کے پھول یعنی ہڈیا
اور راکھ لینے آیا تا کہ وہ انہیں دریا میں بہا سکے۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا چھوٹا سا گھڑا تھا
جے دیو کا باپ اسے اس جگہ لے گیا جہاں اس کی پوتی ترشنا آگ کے شعلوں میں

زمین پر گر کر جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ وہاں ترشنا کی ہڈیاں اور راکھ پڑی تھی۔ جے دیو کا باپ اشلوک وغیرہ پڑھتے ہوئے ترشنا کے پھول اٹھا کر مٹی کے مٹکے میں ڈالنے لگا۔ جے دیو کے باپ کا کہنا ہے کہ جب وہ ترشنا کی ساری ہڈیاں اور راکھ سمیٹ کر برتن میں ڈال چکا تو اس نے جہاں ترشنا جل مری تھی ترشنا کو زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ ترشنا کے دادا نے پوچھا۔

"کیا ہوا پجاری جی؟"

جے دیو کے پجاری باپ نے اس وقت تو ترشنا کے دادا کو کچھ نہ بتایا صرف اتنا ہی کہا کہ وہ یونہی ڈر گیا تھا لیکن بعد میں اس نے اپنے بیٹے جے دیو کو بتایا کہ اس نے جہاں ترشنا جل کر مری تھی وہاں ترشنا کو بالکل زندہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ سیاہ تھا اور بال جل چکے تھے۔ اس نے ایک بھیانک چیخ مار کر جے دیو کے باپ سے کہا تھا کہ میں تم لوگوں سے اپنی جان کا بدلہ لوں گی اور پھر غائب ہو گئی تھی۔ جے دیو کے باپ نے بتایا کہ اب کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترشنا بالکل زندہ حالت میں اپنے دادا کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر اپنے گاؤں آتی ہے حالانکہ اس کا دادا بھی مر چکا ہے۔ گاؤں کے سٹیشن پر اتر کر وہ دادا کے ساتھ یکے میں سوار ہو کر اپنے گاؤں کی طرف آ جاتی ہے۔ اس دوران اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتی نہ اس کا یکہ کسی کو نظر آتا ہے۔ جو کوئی اس کو دیکھ لیتا ہے وہ اس کے دوسرے ہی دن مر جاتا ہے۔ اگر نہ مرے تو ترشنا کی آتما خود آ کر اسے مار ڈالتی ہے۔ جے دیو کا باپ کہنے لگا۔

"اس واقعے کو چار سال بیت گئے ہیں۔ ان چار سالوں میں ترشنا کی بھٹکی ہوئی آتما گاؤں کے صرف تین آدمیوں کو نظر آئی تھی۔ وہ تینوں کے تینوں اگلے روز مر گئے تھے۔"

میں نے جے دیو کے باپ کو بتایا کہ ترشنا کی بھٹکی ہوئی روح مجھے ریل گاڑی میں بھی اپنے دادا کے ساتھ نظر آئی تھی اور میں نے اس یکے کو بھی گاؤں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

جے دیو کے باپ نے پوچھا۔

''ریل گاڑی میں کیا وہ تمہیں دیکھ کر مسکرائی تھی؟''

میں نے کہا۔

''ہاں۔ جب ٹرین سٹیشن پر رک گئی تھی اور وہ اپنے دادا کے ساتھ ڈبے سے اترنے لگی تھی تو اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا تھا اور وہ مسکرائی تھی۔''

جے دیو کے بوڑھے باپ نے پوچھا۔

''اس کے بعد آج جب وہ تمہیں یوگی مت کے غار کے باہر ملی تھی تو اس نے تم سے کوئی بات کی تھی؟''

میں نے کہا۔

''ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ میں ادھر جڑی بوٹیوں کی تلاش میں آئی ہوں۔ آؤ میں تمہیں راستہ دکھاتی ہوں اور وہ مجھے وہاں لے آئی تھی جہاں جے دیو پہلے سے موجود تھا۔''

بوڑھے پجاری نے گھبرا کر جے دیو سے پوچھا۔

''جے دیو تم نے تو ترشنا کی آتما کو نہیں دیکھا؟''

جے دیو بولا۔

''نہیں پتا جی! وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔''

میں نے بوڑھے سے کہا۔

''جے دیو کے پاس پہنچنے کے بعد جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہ لڑکی غار سے نکال کر لائی ہے تو جے دیو نے پوچھا تھا کہ کون سی لڑکی؟ میں نے گردن موڑ کر کہا کہ یہ لڑکی اور اس وقت ترشنا کی بھٹکتی روح غائب ہو چکی تھی۔''

بوڑھے نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

''ہے بھگوان! تیری بڑی کرپا ہے کہ اس منحوس آتما نے میرے بیٹے کو نہیں دیکھا۔ نہیں تو میرا بیٹا بھی موت کے منہ میں چلا جاتا۔''

تب بوڑھے نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''موہن! تم بڑی بھاری مصیبت میں پھنس چکے ہو۔ ترشنا کی آتما نے تمہیں صرف دیکھا ہی نہیں ہے بلکہ تم سے باتیں بھی کی ہیں۔ اب تمہارا زندہ رہنا ناممکن ہے۔''

میں ان کی اس قسم کی باتوں پر دل میں ہنس رہا تھا لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گا میرے دل میں کسی وقت یہ خوف بھی سر اٹھانے لگا تھا کہ کہیں واقعی ترشنا کی آتما مجھے ہلاک نہ کر دے۔ ایک تو میری عمر چھوٹی تھی۔ دوسرے مجھے اس قسم کے واقعات کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ میرا اپنے رب العالمین پر ایمان بھی پختہ تھا مگر تقاضائے بشری اور کم عمری کے باعث میں دل میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں میں ان کفار کے ان توہمات اور جادو ٹونے کے چکر میں پھنس کر بیچ نہ مارا جاؤں۔ میرے ضمیر میں یہ کانٹا بھی کھٹک رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے چنانچہ میں دل میں بار بار خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگ رہا تھا۔ چنانچہ جب بوڑھے پجاری نے کہا۔

''موہن! تم میرے بیٹے کے دوست ہو۔ میں ترشنا کی آتما سے تمہیں بچانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ میں کچھ منتر پڑھ کر اس کوارٹر کے اردگرد پھونک دوں گا۔ ان منتروں کی طاقت کے اثر سے کل ترشنا کی بدروح اس کوارٹر میں داخل نہ ہو سکے گی اور کم از کم کل وہ تم پر حملہ نہیں کر سکے گی۔''

میں بھی ان لوگوں کی مشرکانہ باتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

''لیکن اس کے بعد بھی وہ مجھے ہلاک کر سکتی ہے۔ میں کہاں کہاں اس بدروح سے اپنے آپ کو بچاتا پھروں گا۔''

جے دیو کے باپ نے کہا۔

''اس کا علاج، اس کا اپائے بھی میرے پاس ہے۔ میں تمہیں منتر پھونک کر ایک مہرہ دوں گا۔ وہ مہرہ تم اپنی جیب میں بڑی حفاظت سے رکھنا۔ جب تک یہ مہرہ تمہارے پاس رہے گا ترشنا کی آتما تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گی۔ بس تم صرف کسی طرح آج کی رات اس کمرے میں بند رہ کر گزار دو۔''

اس کے بعد جے دیو کا باپ منتر پڑھتے ہوئے کوارٹر کے گرد چکر لگانے لگا۔ جے

دیو نے مجھے بتایا کہ پتا جی نے منتر اور اشلوک پڑھتے ہوئے کوارٹر کے پندرہ چکر لگائے
ہیں۔ چکر پورے کرنے کے بعد بوڑھا میرے کمرے میں آ کر بولا۔
''موہن! میں نے اپنا چلہ پورا کرلیا ہے۔ اب تم کل سارا دن اس کمرے میں
بند رہو گے۔ ایک پل کے لئے بھی باہر قدم نہیں رکھو گے۔ جے دیو تمہارے لئے بھوجن
پانی لا کر دے جایا کرے گا۔''
اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے دوسرے دن اپنے آپ کو کوارٹر کے اس بوسیدہ کمرے
میں بند کرلیا۔ کسی وقت مجھے لگتا کہ میں خوامخواہ ان توہم پرست لوگوں کی باتوں میں آ گیا
ہوں۔ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔ پھر خیال آتا کہ کہیں ان لوگوں کی باتیں سچ
نکل آئیں اور ترشنا کی بدروح سچ مچ گلا گھونٹ کر مجھے مار نہ ڈالے۔ ایک دو دفعہ میرے
دل میں خیال بھی آیا کہ میں کیوں ان لوگوں کی باتوں میں آ کر کمرے میں قید ہو گیا ہوں
مجھے یہاں سے بھاگ کر سیدھا سٹیشن پر چلے جانا چاہئے۔ وہاں سے دلی جانے والی کوئی
کوئی گاڑی مجھے مل ہی جائے گی لیکن میں کمرے سے باہر قدم نہ رکھ سکا۔ جے دیو مجھے آ
دوپہر اور رات کو کھانا وغیرہ دے گیا تھا۔
دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ اگلا دن طلوع ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا
کہ سر سے بلا ٹل گئی۔ اب آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں اس علاقے میں رہوں گا
نہیں تو ترشنا کی بدروح کہاں آئے گی۔ صبح کے وقت جے دیو کا باپ آ گیا۔ کہنے لگا۔
''موہن! بھگوان کی تم پر بڑی کرپا ہوئی ہے کہ میرے منتروں نے تمہیں [illegible]
ایسی بلا سے بچا لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ رات کو وہ آئی تو نہیں تھی؟ تمہیں چیخیں تو سنائی نہیں دیں
تمہارے سپنے میں آ کر تو اس نے تمہارا گلا دبانے کی کوشش نہیں کی؟''
میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ترشنا کی بدروح خواب میں بھی
نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے جے دیو کے باپ کو بتا دیا کہ کچھ نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔
''میں نے اپنے گورو مہان گورو گورکھ ناتھ کے منتروں کا جاپ کیا تھا۔ ترشنا
بدروح آ کر تمہیں کیسے تنگ کر سکتی تھی۔''

میں نے کہا۔
''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب میں یہاں سے چلے جانا چاہتا ہوں۔''
''تم کہاں جاؤں گے؟'' جے دیو کے باپ نے پوچھا۔
میں نے کہا۔
''میں دلی جاؤں گا۔ دلی میں میرے ماتا پتا رہتے ہیں۔''
وہ کہنے لگا۔
''میں کم از کم تین چار دن سے پہلے یہاں سے جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔
تر ہوگا کہ تم کم از کم تین دن ہمارے پاس اس کوارٹر میں ہی رہو۔ میں منتر پھونک کر مہرہ
پنے ساتھ لایا ہوں۔ یہ تم اپنے پاس رکھو گے۔ تمہیں کوارٹر میں بند ہونے کی ضرورت نہیں
ہے۔ تم کوارٹر سے نکل کر ادھر ادھر چل پھر سکتے ہو لیکن میں کم از کم تین دن تمہیں اپنی نگرانی
رکھنا چاہتا ہوں۔''
میں نے یونہی کہہ دیا۔
''لیکن میرا دلی جانا بڑا ضروری ہے۔ مجھے گھر سے نکلے کئی روز ہو گئے ہیں۔
رے ماتا پتا میرے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے۔''
بوڑھے پجاری نے سوچ کر کہا۔
''موہن بیٹا! میری ایک بات مان لو۔ گورکھ ناتھ کا مہرہ میں تمہیں دے رہا
ہا۔ اس کی طاقت ترشنا کی آتما کو تمہارے پاس نہیں آنے دے گی۔ لیکن میں چاہتا ہوں
کم از کم تم دو دن اور میرے پاس رہ جاؤ۔ اس کے بعد بے شک بے فکر ہو کر چلے جانا۔''
بت پرستوں کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے ان کے توہمات کا مجھ پر بھی کچھ
ہو چکا تھا۔ یہ قدرتی بات تھی اور میں کوئی پختہ عمر کا آدمی بھی نہیں تھا۔ چودہ پندرہ سال کی
عمر تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو دو دن اور رہ لیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں آنے والی کسی بلا
بچ جاؤں کیونکہ یوگی مت کے پرانے مندر میں، میں ایک بلا کے قابو آ چکا تھا اور خدا
مجھے وہاں سے نکالا تھا۔ اگر خدا میری مدد نہ فرماتا تو پتہ نہیں قبر ایسے تابوت کے اندر میرا

کیا حال ہوتا۔ میں زندہ بھی رہتا یا نہ رہتا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی
جس لڑکی ترشنا کی بدروح کے بارے میں یہ لوگ مجھے ایسی ایسی خوفناک باتیں بتا رہے
اس نے مندر میں آ کر مجھے تابوت سے باہر نکالا تھا۔ اگر وہ بقول جے دیو کے باپ
واقعی میری جان کی دشمن تھی اور مجھے ہلاک کرنا چاہتی تھی تو مجھے بند تابوت سے کیوں نکال
وہیں مجھے مرنے کے لئے چھوڑ دیتی۔ اگر وہ لڑکی ترشنا زندہ انسانی حالت میں نہیں تھی
اس کی بدروح تھی تو وہ مجھے بڑی آسانی سے وہیں ہلاک کر سکتی تھی۔ جب ان باتوں
خیال آتا تو مجھے جے دیو کے باپ کی ساری باتیں جھوٹ لگتیں اور میرے دل سے ترشنا
بدروح کا خوف کچھ دیر کے لئے نکل جاتا۔ لیکن پھر کفر غالب آ جاتا اور میرا ناپختہ
توہمات کا شکار ہو جاتا کہ کیا پتہ ترشنا کی روح واقعی کسی وقت اچانک نمودار ہو کر میرا گلا
دے۔

عجیب شش و پنج کی حالت تھی میری۔ لیکن میں نے وہاں مزید دو دن ٹھہر
فیصلہ کر لیا تھا۔ اب وہ اداس آنکھوں والی لڑکی جو مجھے ریل گاڑی میں ملی تھی اور جس
مجھے محبت ہو گئی تھی میرے دل و دماغ سے غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ ایک ڈراؤنی چ
نمودار ہو گئی تھی جو مجھے ہلاک کرنے کے لئے میرا پیچھا کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس
کہ میں نے ان لوگوں کی باتوں کو سچ مان لیا تھا ورنہ کسی کسی وقت جب مجھ پر خالص
اور صرف محبت کا غلبہ ہوتا تو اس لڑکی کی معصوم مسکراہٹ والا بھولا بھالا چہرہ میری آنک
کے سامنے آ جاتا اور مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکی کوئی چڑیل بھی ہو سکتی ہے۔

◆......◆......◆

اس کے باوجود یوگی مت کے ٹیلے کے مندر والی چڑیل کا ڈراؤنا مسئلہ اپنی جگہ پر قائم تھا۔ ابھی تک میں اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ وہ حقیقت تھی یا میرا دن میں دیکھا ہوا کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ جے دیو کے پتا جی نے مجھے منتروں والا مہرہ دے دیا تھا۔ یہ کالے رنگ کا خوبانی کی گٹھلی کے برابر تھا۔ میں اس مصیبت کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن مجبور ہو کر رکھ لیا تھا کہ جہاں اور سب کچھ ہو رہا ہے وہاں یہ بھی سہی۔

مزید ایک دن گزر گیا۔ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ میں کوارٹر سے نکل کر ٹہلنے کے لئے کھیتوں میں یا ندی کی طرف نکل جاتا تھا۔ اس روز کا ذکر ہے کہ شام کے قریب کچھ لوگ مرگھٹ میں جلانے کے واسطے ایک مردہ لے کر آئے۔ جے دیو نے بتایا کہ یہ شہر کی ایک گانے بجانے والی طوائف کی لاش ہے جو اسی گاؤں کی رہنے والی تھی اور اس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میری لاش کو میرے گنوں والے مرگھٹ میں نذر آتش کیا جائے۔ لاش کے ساتھ چھ سات آدمی بھی تھے۔ جے دیو کے باپ نے مچان پر لکڑیاں چن دی تھیں۔ عورت کی لاش کو لکڑیوں کے اوپر لٹا کر اس کے اوپر لکڑیوں کی ایک اور تہہ لگا دی۔ ایک آدمی نے لکڑیوں پر پیتل کی کٹوری میں سے گھی انڈیل دیا۔ ان کے ساتھ آخری رسومات کے وقت اشلوک پڑھنے والا کوئی برہمن وغیرہ نہیں تھا۔ یہ کام جے دیو کے باپ نے ہی انجام دیا۔ تین چار آدمی جو عورت کا مردہ لے کر شہر سے آئے تھے ان میں سے ایک نے چتا کو آگ دکھا دی۔ تھوڑی دیر بعد لکڑیوں نے آگ پکڑ لی اور شعلے بلند ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی مردے کو لانے والے آدمی جے دیو کے باپ کو کچھ پیسے وغیرہ دے کر واپس چلے

گئے۔ میں اور جے دیو جلتی ہوئی چتا سے کچھ فاصلے پر املی کے درخت کے نیچے بیٹھے یہ
دیکھ رہے تھے۔ اس کا باپ چتا کو آگ لگا کر کچھ دور ایک تخت پوش پر بیٹھا ناریل پی
تھا۔ میں نے جے دیو سے پوچھا۔

"آگ لگنے سے مردے کو تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہوگی۔"

وہ بولا۔

"آدمی جب مر جاتا ہے تو اس کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔ وہ تو پتھر ہو جاتا ہے۔ اگر
چاہے زمین میں دبا دو۔ چاہے آگ میں جلا دو سب ایک برابر ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن آدمی کو آگ لگانا مجھے اچھا نہیں لگا۔"

جے دیو بولا۔

"اپنے اپنے دھرم کی بات ہے۔ ہماری ماتا جی کہا کرتی تھیں کہ جب ہم مرد
کے جسم کو آگ لگاتے ہیں تو اگنی دیوی اسے اٹھا کر لے جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ اگنی دیوی کون ہے۔ کہاں سے آ کر مردے کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔"

جے دیو نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور بولا۔

"تم ہندو ہو کر اگنی دیوی کو نہیں جانتے؟ اگنی دیوی آگ کی دیوی ہے۔
آکاش سے آتی ہے اور مردے کے جسم کو اٹھا کر آکاش کی طرف لوٹ جاتی ہے۔"

مجھے فوراً خیال آ گیا کہ میں نے تو جے دیو کے آگے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا
ہے۔ میں نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ ہاں۔ اب میں سمجھ گیا میں بھول گیا تھا۔"

اتنے میں جے دیو کا باپ تخت پوش سے اٹھ کر ناریل ہاتھ میں لئے آیا اور
دیو سے کہنے لگا۔

"ان لوگوں میں سے عورت کے پھول اکٹھے کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ وہ ک

ئے ہیں کہ آپ لوگ خود ہی پھول اٹھا کر ندی میں بہا دینا۔ ہمیں جلدی شہر پہنچنا ہے۔ میں
ات کو مردے کے پھول ایک کٹورے میں ڈال کر رکھ دوں گا۔ تم صبح صبح ندی پر اشنان
رنے جاتے ہوئے ساتھ لے جانا اور ندی میں بہا دینا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ تم بھی جا
ر آرام کرو۔"

جے دیو کا بوڑھا باپ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جے دیو کہنے لگا۔

"موہن! ایک کام کرتے ہیں۔ میں صبح صبح اشنان کرنے کے لئے نہیں اٹھ سکتا۔
ہ تھوڑی دیر کے بعد جل کر راکھ ہو جائے گا۔ میں سلاخوں سے انگارے ہٹا کر بڑے
ٹے سے مردے کی ہڈیاں اور کچھ راکھ چتا میں اٹھا کر مٹی کے کٹورے میں ڈال کر تمہیں
ے دوں گا۔ تم اسے اپنے کمرے کے کونے میں رکھ دینا۔ کل دوپہر کو میں لے جا کر اسے
ی میں بہا دوں گا۔ پتا جی نے صبح پوچھا تو میں کہہ دوں گا کہ میں نے صبح صبح ہی پھول ندی
ا بہا دیئے تھے۔"

ہندو لوگ اپنے مردوں کی راکھ اور ہڈیوں کو پھول کہتے ہیں۔ امیر ہندو تو اپنے
یزوں کے پھول گنگا دریا میں لے جا کر بہاتے ہیں۔ غریب لوگ وہیں کسی ندی یا دریا
ا بہا دیتے ہیں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم مٹی کا کٹورا کمرے میں رکھ دینا۔"

ہم وہیں بیٹھے رہے۔ چتا کی آگ آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی۔ پھر شعلے غائب
گئے اور صرف انگارے باقی رہ گئے۔ رات نو ساڑھے نو بجے کا وقت ہوگا۔ جے دیو اٹھ
ر چتا کے قریب گیا۔ لوہے کی ایک لمبی کنڈے والی سلاخ سے اس نے لکڑی کے بڑے
ے انگاروں کو ایک طرف ہٹا دیا۔ پھر ایک بہت لمبے چمٹے سے اس نے چتا میں سے دس
ہڈیاں اور تھوڑی سی راکھ نکال کر کٹورے میں ڈالی اور اسے اٹھا کر میرے کمرے میں آ
یا۔ اس نے مردے کے پھول یعنی مردے کی ہڈیوں اور راکھ والا کٹورا کونے میں رکھ دیا
یہ کہہ کر چلا گیا کہ کل کسی وقت اسے ندی میں بہا دیں گے۔ اس کے جانے کے بعد میں
ے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ مجھے بڑی سخت نیند آ رہی تھی۔ میں چارپائی پر

لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں سو گیا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ کھٹ کھٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ دروازے پر کوئی آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ میں یہ سمجھا کہ صبح ہو گئی ہے اور جے دیو نے دوپہر کا ارادہ بدل دیا ہے اور مردے کی ہڈیوں والا کٹورا لینے آیا ہے۔ میں چارپائی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ میں نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

''کون ہے؟''

دوسری طرف سے ایک عورت کی آواز آئی۔

''میں جھانسی کی لکشمی طوائف ہوں۔ اپنے پھول لینے آئی ہوں۔''

دہشت کے مارے میرے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ یہ اس عورت کی آواز تھی جس کے مردہ جسم کو ہم شام کے وقت جلا کر راکھ کر چکے تھے۔

باہر سے اس عورت کی ایک بار پھر آواز آئی۔

''دروازہ کھولو میں جھانسی کی لکشمی ہوں۔ میں اپنے پھول لینے آئی ہوں۔''

میں ایک بھٹکتی بدروح کے لئے کیسے دروازہ کھول سکتا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کمرے کی طرف ایک ہی کھڑکی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دہشت کی وجہ سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے سونے سے پہلے بتی بجھا دی تھی۔ اتنے میں دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ میں ڈر کر چارپائی کے پیچھے چھپ گیا۔ میری آنکھیں دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک عورت کا ہیولا سا اندر داخل ہوا۔ میرے دل کی دھڑکن خوف کے مارے ڈوب رہی تھی۔ عورت اندھیرے میں کچھ کچھ نظر آ رہی تھی۔ اس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سیدھی اس طرف آ گئی جہاں جے دیو نے جھانسی کی طوائف لکشمی کی ہڈیاں اور راکھ مرتبان میں رکھی ہوئی تھیں۔ عورت کا ہیولا مرتبان کے پاس آ کر رک گیا۔ مجھے عورت کے سرد آہ بھرنے کی آواز آئی۔ وہ مرتبان پر جھک گئی۔ پھر اس نے مرتبان کو اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی۔ اس

نے گردن موڑ کر اس جانب دیکھا جہاں میں چارپائی کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''میرے ساتھ چلو گے۔ میں جھانسی کی رانی کے محل میں رہتی ہوں۔''

مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا۔ خوف سے میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت نہیں ہے بلکہ لکشمی کی بدروح ہے جو مرنے کے بعد اسی دنیا میں بھٹکنے لگی ہے۔ جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ بھٹکتی بدروح بولی۔

''تمہاری آتما بڑی اچھی ہے۔ یہاں سے چلے جاؤ۔''

اور وہ دروازے میں سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد دروازہ اپنے آپ بند ہو گیا۔ پانچ سات منٹ تک میں اسی طرح بت بنا چارپائی کے پیچھے چھپ کر بیٹھا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ روح کمرے سے جا چکی ہے اور دوبارہ نہیں آئے گی۔ تو میں اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اب نیند مجھے کہاں آنی تھی۔ باقی کی ساری رات چارپائی پر کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کر پہلو بدلتے گزار دی۔ دن نکل آیا میں نے دیکھا کہ کونے میں لکشمی طوائف کی راکھ اور ہڈیوں والا مرتبان نہیں تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ رات کو میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ جب مرتبان کو غائب پایا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ رات کو مردہ لکشمی کی بدروح آئی تھی۔ اور اپنے پھول لے گئی ہے۔

دن کافی نکل گیا تھا کہ جے دیو آ گیا۔ کہنے لگا۔

''میں مردے کے پھول ندی میں بہا آؤں پھر اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کریں گے۔''

میں خاموش رہا۔ جے دیو میرا ہم عمر لڑکا سا ہی تھا۔ وہ اس کونے کی طرف گیا جہاں اس نے شام کو خود مرتبان رکھا تھا۔ مگر مرتبان وہاں نہیں تھا۔ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ کہنے لگا۔

''مرتبان کہاں چلا گیا؟''

میں پھر بھی خاموش رہا وہ بولا۔

''کیا بات ہے موہن! تم خاموش کیوں ہو؟ اگر صبح صبح تم نے مرتبان کی راکھ اور

ہڈیاں ندی میں بہادی ہیں تو یہ تو بڑی اچھی بات کی ہے تم نے۔"

میں نے کہا۔

"میں نے مردے کے پھول ندی میں نہیں بہائے۔"

جے دیو اور زیادہ حیران ہو کر بولا۔

"تو پھر مرتبان کہاں چلا گیا؟"

میں نے کہا۔

"مرتبان میں جس مردہ عورت کی راکھ اور ہڈیاں تھیں وہ خود اسے لے گئی ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

جے دیو میرے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جب میں نے اسے رات والا واقعہ سنایا تو میرا منہ تکنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے فوراً جا کر اپنے پتا جی کو یہ واقعہ سنا دیا۔ اس کا بوڑھا باپ میرے پاس آ گیا کہنے لگا۔

"کیا تم پورے وشواس کے ساتھ کہتے ہو کہ رات جو عورت اپنے پھول لینے آئی تھی اس نے اپنا نام لکشمی بتایا تھا؟"

میں نے کہا۔

"بالکل میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ کوئی خواب ہوتا تو مرتبان کو تو یہاں موجود ہونا چاہئے تھا۔"

"اس عورت نے کیا کہا تھا؟" بوڑھے نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"اس نے دروازے پر دستک دی۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ دوسری طرف سے اس نے کہا۔ میں جھانسی کی لکشمی ہوں میں اپنے پھول لینے آئی ہوں۔ میں ڈر کر چارپائی کے پیچھے چھپ گیا کیونکہ جھانسی کی لکشمی کو تو ہم شام کو جلا چکے ہیں۔ عورت نے دوبارہ کہا دروازہ کھولو۔ میں جھانسی کی لکشمی ہوں میں اپنے پھول لینے آئی ہوں۔ میں ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور میں نے

ایک عورت کے ہیولے کو دیکھا۔ وہ اندر آئی اور سیدھی اس کمرے کی طرف گئی جہاں اس کی راکھ اور ہڈیوں والا مرتبان پڑا تھا۔ اس نے مرتبان اٹھایا اور واپس چل پڑی۔ دروازے کے پاس آ کر اس نے میری طرف گردن موڑ کر دیکھا اور کہنے لگی۔ میرے ساتھ چلو گے؟ میں جھانسی کی رانی کے محل میں رہتی ہوں۔ اس کے بعد وہ دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد دروازہ اپنے آپ بند ہو گیا۔"

جے دیو اور اس کا بوڑھا باپ دونوں بڑی حیرت سے میری بات سن رہے تھے۔

جب میں نے بات ختم کی تو بوڑھا بولا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ اس کے ساتھ نہیں گئے۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ میں جھانسی کے رانی محل میں رہتی ہوں۔ اس عورت کو جو کہ جھانسی کی مشہور طوائف تھی جھانسی کے رانی محل کے کھنڈر میں لے جا کر ہی گلا دبا کر مار دیا گیا تھا۔ پولیس اس کے قاتلوں کو تلاش کر رہی ہے۔"

میں نے جے دیو کے باپ سے کہا۔

"اب میرا جی یہاں سے اکھڑ گیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں اور کوئی بدروح مجھے نہ چمٹ جائے۔ اس لئے میں آج یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

بوڑھا کہنے لگا۔

"ابھی ترشنا کی بھٹکتی روح کے چلے کے دو دن باقی ہیں۔ میرا چلہ پورا نہ ہوا تو ترشنا کی بدروح تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس لئے میری مانو اور دو دن اور رک جاؤ اور مجھے چلہ پورا کر لینے دو۔"

مگر میں نے دل میں وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اور جے دیو نے ناشتہ کیا اس کے بعد میں وہاں سے بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگا؟ جے دیو کچھ دیر کے بعد چلا گیا۔ اس کے باپ نے مجھے کمرے سے باہر نکلنے سے سختی سے منع کیا تھا لیکن مجھے اب اس کے منتروں اور اس کے چلے وغیرہ کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ مجھے یہی ڈر لگا ہوا تھا کہ یہ جگہ بدروحوں کا مسکن بن چکی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بلا میرے

پیچھے بھی لگ جائے۔ میری جیب خالی تھی۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ مجھے ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کرنا تھا۔ میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا عادی تھا۔ مجھے صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ وہاں سے بھاگ کر ریلوے سٹیشن پر پہنچوں اور جو پہلی گاڑی دلی کی طرف جا رہی ہو اس میں بیٹھ جاؤں۔ میں کمرے سے نکل آیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں نہ تو جے دیو تھا اور نہ اس کا باپ ہی مجھے دکھائی دیا۔ موقع بڑا اچھا تھا۔ میں کھیتوں کی طرف چل دیا۔ سٹیشن کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ میں جلدی جلدی چل رہا تھا لیکن میں نے طے کر رکھا تھا کہ اگر جے دیو یا اس کا باپ آ بھی گیا تو میں واپس جانے سے صاف انکار کر دوں گا۔

مگر میرے پیچھے کوئی نہ آیا۔ کھیتوں سے نکل کر میں چھوٹی کچی سڑک پر ہو گیا جو سیدھی ریلوے سٹیشن کو جاتی تھی۔ ریلوے سٹیشن پہنچ کر میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ دلی جانے والی گاڑی کب آئے گی۔ اس نے بتایا کہ ایک گاڑی ابھی ابھی نکل گئی ہے۔ اب ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دوسری گاڑی آئے گی۔ میں پلیٹ فارم پر ہی بیٹھ گیا۔ ٹکٹ میرے پاس نہیں تھا۔ مگر میں بے فکر ہو کر بیٹھا تھا۔ ٹکٹ چیکر نے آ کر ٹکٹ چیک بھی کی تو زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا کہ مجھے سٹیشن سے باہر نکال دے گا۔ میں کچھ دیر بعد دوبارہ آ جاؤں گا۔ ان سارے چکروں سے میں اس کم عمری میں ہی گزر چکا تھا۔ مشکل صرف اس وقت پیش آتی تھی جب ٹرین میں ٹی ٹی ٹکٹ چیک کرتا تھا۔ میری کم عمری کی وجہ سے آج تک کسی ٹکٹ چیکر نے مجھے ریلوے پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ بس وہ مجھے ٹرین سے اتار دیتا تھا۔ اگر اس وقت ٹرین کسی سٹیشن پر کھڑی ہوتی تھی تو میں پلیٹ فارم پر اتر کر ادھر ادھر ہو جاتا۔ ٹرین چلتی تو دوڑ کر اس کے آخری ڈبے میں سوار ہو جاتا تھا۔ بڑودہ لائن پر بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے میں نے اس قسم کے ایڈونچر کئی بار کئے تھے۔ مصیبت اس وقت پڑ جاتی تھی جب ٹکٹ چیکر مجھے رات کے وقت کسی ویران سے سٹیشن پر اتار دیتا تھا۔

اس وقت چونکہ دن تھا اسی لئے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ چنانچہ میں پلیٹ فارم پر ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ میں نے کرتہ پاجامہ اور چپل پہن رکھی تھی اور کوئی سامان میرے ساتھ نہیں تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر تھی اس عمر میں میں کہاں سامان لے کر سفر کرتا پھرتا۔

سامان کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اب ان دنوں کا تصور ذہن میں لاتا ہوں تو بڑا حیران ہوتا ہوں کہ میں اتنے لمبے لمبے سفر بغیر ساز و سامان کے اور وہ بھی بغیر ٹکٹ کیسے کر لیا کرتا تھا۔ گاڑی آ کر پلیٹ فارم پر رکی تو میں تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ یہ گاڑی دلی جا رہی تھی۔ اس کی ایک بوگی کے اوپر بمبئی، جھانسی، دلی کی تختی لگی ہوئی تھی۔ گاڑی تھوڑی دیر کے لئے ہی رکی اور پھر چل پڑی۔ میری اس زمانے میں ایک عادت رہی تھی کہ میں کسی ایک ڈبے میں ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ دو تین سٹیشن گزر جاتے تو میں کسی دوسرے ڈبے میں چلا جاتا۔ یہ ضرور دیکھ لیتا تھا کہ یہ ڈبہ تھرڈ کلاس کا ہی ہے۔ یہاں سے بھی گاڑی چلی تو دو چار سٹیشن گزر جانے کے بعد میں تھرڈ کاس کے ایک اور ڈبے میں آ گیا۔ یہاں بیٹھنے کو جگہ نہیں تھی۔ میں دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا اور باہر کا نظارہ کرتا اور کھیتوں، درختوں اور پہاڑوں، ٹیلوں کو پیچھے کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔

وہاں سے دلی کافی دور تھا۔ کوئی بڑا سٹیشن آتا تو میں پلیٹ فارم پر اتر کر گھومنا پھرنا شروع کر دیتا۔

◆......◆......◆

کتابوں رسالوں کے سٹال پر جا کر رسالوں کی تصویریں دیکھتا۔ فسٹ کلاس کے ریفریشمنٹ روم کے سامنے سے ضرور گزرتا کیونکہ وہاں سے اکثر چائے کی خوشبو آیا کرتی تھی جو مجھے بڑی پسند تھی۔ چائے آج کل بھی پاکستان میں بڑی معیاری ملتی ہے مگر اس زمانے میں لپٹن کے کئی برانڈ ہوتے تھے۔ ایک اورنج پیکو چائے ہوا کرتی تھی۔ اس کی خوشبو مجھے اپنے ساتھ اڑا کر جنگلوں، سمندروں اور چائے کے ان دیکھے باغات کی طرف لے جاتی تھی۔

بڑے سٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پر ان دنوں انتشار نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ میں سن 1941/42ء کی بات کر رہا ہوں۔ حیرت کی بات ہے اور اس کا میں نے کافی مشاہدہ کیا ہے کہ اس زمانے میں ہر بڑے ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم کی فضا الگ ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر جیسے بڑودہ لائن پر ہردوئی نام کا ایک سٹیشن آتا تھا۔ یہ چھوٹا سا شہر ہوا کرتا تھا اور یہاں کے لڈو بڑے مشہور تھے۔ اس سٹیشن کے پلیٹ فارم پر بڑی بوندی والے لڈوؤں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوتی تھی۔ اس خوشبو میں گلاب کے عرق کی دھیمی دھیمی مہک بھی ہوتی تھی۔ جو ہردوئی کے لڈوؤں میں ڈالا جاتا تھا۔

یہاں پھیری والے ہردوئی کے لڈو لے لو ہردوئی کے لڈو لے لو کی آوازیں لگاتے پھرتے تھے۔ ان کے پاس مٹی کے کوزے ہوتے۔ ہر کوزے میں مالٹے کی سائز کے دو لڈو ہوتے تھے۔ لڈوؤں پر سفید بورا چینی کی بڑی باریک سی تہہ جمی ہوتی تھی جس میں سے لڈو کی بڑی بوندیاں زرد موتیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ اسی طرح بھوساول کے سٹیشن

پر گاڑی ٹھہرتی تو مجھے اس کے پلیٹ فارم پر ہمیشہ ہری چھیل کے کیلوں کی ہلکی ہلکی مہک آیا کرتی تھی۔ یہاں کے ہری چھیل کے کیلے بڑے مشہور تھے۔

ان پر نسواری دھبوں کے نشان بالکل نہیں ہوتے تھے۔ بالکل سرسبز ہوتے تھے۔ مگر اندر سے بے حد میٹھے، نرم اور خوشبودار ہوتے تھے۔ اسی طرح لکھنؤ کے سٹیشن پر مختلف عطریات اور پان کے قسم قسم کے قواموں کی خوشبوئیں پھیلی ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کا ریلوے سٹیشن اپنی نفاست، نزاکت اور خوبصورتی کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔

اس کی عمارت لاہور کے ریلوے سٹیشن کی عمارت کی ہو بہو نقل تھی۔ اس کے پلیٹ فارم پر پان سگریٹ کے سٹال بھی ہوا کرتے تھے۔ پتہ نہیں اب ہوتے ہیں کہ نہیں۔ یہ سٹال بڑے بنے سنورے ہوتے تھے۔ یہاں ایک بہت بڑا آئینہ ضرور لگا ہوتا تھا۔ جس کے سامنے کھڑے ہو کر گاہک اپنے بال وغیرہ درست کیا کرتے تھے۔ پان سگریٹ کے سٹالوں پر اتنی خوشبوئیں اڑتی تھیں کہ آدمی کو محسوس ہونے لگتا کہ یہ پان سگریٹ کا نہیں بلکہ لکھنؤ کے مشہور عطر سازوں اصغر علی، محمد علی کے عطریات کا سٹال ہے۔

کلکتے جاتے ہوئے جھریا کا سٹیشن آتا تو اس کے پلیٹ فارم پر اترتے وقت مجھے پتھر کے کوئلوں کی ہلکی ہلکی بو ضرور محسوس ہوتی۔ جھریا میں کوئلے کی کانیں تھیں اور یہاں انجن پر پتھر کا کوئلہ لادا جاتا تھا۔ بمبئی کے سٹیشن پر مجھے ہمیشہ ایرانی ہوٹلوں میں پی جانے والی چائے اور بارش کی خوشبو آتی تھی۔

ایک چائے اور اوپر سے بارش۔ بارش میں چائے۔ چائے میں بارش۔ پہلی بار جب میں آٹھویں جماعت سے بھاگ کر بمبئی سنٹرل کے سٹیشن پر پہنچا تھا تو مجھے بارش اور چائے کی اس خوشبو نے ریلوے سٹیشن سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ اسی طرح سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹے سے جنگلاتی ریلوے سٹیشن پر گاڑی رکی تو اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ اور سٹیشن کے سرخ مٹی والے پلیٹ فارم سے مٹی اور اناناس کی خوشبو آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہاں اناناس بیچنے والی سیلونی لڑکیاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے کیلے کے سبز پتوں پر کٹے ہوئے اناناس کے قتلے رکھے تھے اور آواز

گا رہی تھیں۔ پائن ایپل سر! فائیو پینٹ سر! ویری سویٹ سر!۔

یہ میرے ماضی کی آوازیں اور میرے ماضی کی خوشبوئیں ہیں جو میرے حال
ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہیں۔ ایک دن یہ ساری آوازیں، یہ ساری خوشبوئیں، یہ سار
معصوم خوبصورت چہرے مجھے اور میرے ماضی اور میرے حال کو لے کر مستقبل کی لا
روشنیوں کی وادیوں میں اتر جائیں گی۔

ابھی تک میں یہ بیان کر رہا تھا کہ میں بغیر ٹکٹ کے تھا اور ایک ریل گاڑی
تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھا بمبئی سے دلی کی جانب سفر کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ا
میں ٹی ٹی نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ خواہ مخواہ کی مشکل میں پھنس جاؤں گا۔

لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ آدھا دن ٹرین میں سفر کرتے گزر گیا۔ رات
ہی تو ایک سٹیشن سے گاڑی چلی تو ٹی ٹی صاحب ہمارے ڈبے میں دوڑ کر چڑھ گئے۔
ہمیشہ دوڑ کر اس وقت ڈبے میں چڑھتے تھے جب ٹرین چل پڑتی تھی۔ شاید اس خیال
کہ بغیر ٹکٹ کا کوئی مسافر اگر ڈبے میں موجود ہے تو وہ ڈبے سے اتر نہ جائے۔

میں نے ٹی ٹی کو ڈبے میں چڑھتے دیکھ لیا تھا۔ آگے کوئی بڑا سٹیشن آنے والا
اب یاد نہیں رہا کہ وہ کون سا سٹیشن تھا۔ بہر حال ٹی ٹی کو دیکھ کر میرا دل ایک دو بار زو
دھڑکا پھر میں سنبھل گیا۔ ٹرین کی سپیڈ تیز ہو چکی تھی ورنہ میں کھڑکی میں سے باہر چ
لگا دیتا۔ مسافروں کے ٹکٹ چیک کرتے کرتے وہ میرے پاس آ گیا۔ بولا۔

"چل بے لڑکے ٹکٹ دکھا۔"

میں نے اداکاری شروع کر دی۔ کبھی کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال
پاجامے کی جیبوں کو ٹٹولتا۔ اس زمانے میں ایسے پتلون نما پاجامے ہوا کرتے تھے جن
جیبیں لگی ہوتی تھیں۔ ٹی ٹی فوراً سمجھ گیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہوں۔ میں

"پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ میں نے اسی جیب میں رکھا تھا۔"

ٹی ٹی نے مجھے کان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بولا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ جی تو چاہتا ہے اگلے سٹیشن پر تمہیں ریلوے پو

والے کر دوں مگر تمہاری عمر پر ترس آتا ہے۔ بس یہی کر سکتا ہوں کہ جہاں گاڑی رکے
ہاں تمہیں نیچے اتار دوں گا۔"

بدقسمتی سے گاڑی کی رفتار ہلکی ہونے لگی اور تھوڑی دیر بعد گاڑی رات کے
دھیرے میں ایک ویران جنگل میں رک گئی۔ شاید آگے کوئی سگنل نہیں گرا تھا یا لائن کی
مت ہو رہی تھی۔

ٹی ٹی مجھے اٹھا کر ڈبے کے دروازے پر لے آیا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور دوبارہ
ل پڑی۔ ٹی ٹی نے مجھے زبردستی ٹرین سے نیچے اتار دیا۔ میں ریلوے لائن کے پتھروں پر
ے پھسل کر دور جا گرا۔ اگر میں کسی ہموار پلیٹ فارم پر ہوتا تو دوڑ کر ٹرین کے کسی ڈبے
ے دروازے کو پکڑ کر ٹرین میں سوار ہو سکتا تھا۔ دو تین بار میں ایسا کر چکا تھا۔ مگر وہاں کوئی
ٹ فارم نہیں تھا اور میں ریلوے لائن سے بھی نیچے ڈھلان پر تھا۔

رات کے اندھیرے میں کسی ڈبے کے دروازے کی آہنی ہتھی بھی نظر نہیں آ رہی
ا۔ میرے دیکھتے دیکھتے ٹرین گزر گئی اور میں اس کے سب سے پچھلے ڈبے کی سرخ بتی
دیکھتا رہ گیا جو رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔

کچھ دیر تو میں حسرت و یاس کے عالم میں ریلوے لائن کے پاس کھڑا ٹرین کی
خ بتی کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ پھر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اسی طرف
ا پڑا جس طرف ٹرین گئی تھی۔

یہ مجھے علم ہو چکا تھا کہ آگے کسی بڑے شہر کا سٹیشن آ رہا تھا۔ میں دل میں یہ امید
ے چلا جا رہا تھا کہ آگے جو بڑا شہر ہے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ہر طرف رات کا سناٹا تھا۔ کوئی
از سنائی نہیں دے رہی تھی۔

پہلے تو گھپ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اندھیرے میں درختوں
ریلوے لائن کے دھندلے دھندلے خاکے نظر آنے لگے اور میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔
انہ تو کہیں ریلوے لائن کی مرمت ہو رہی تھی اور نہ کسی سگنل کی بتی ہی نظر آ رہی تھی۔
خدا جانے ٹرین کیوں رک گئی تھی۔ شاید وہ صرف مجھے نیچے اتارنے کے لئے رکی تھی۔

مجھے نیچے اتارا اور آگے چل دی۔

خدا جانے میں کتنی دیر چلا ہوں گا کہ ایک ندی کا پل آ گیا۔ میں پل پر ...
گیا۔ سانپوں کا بھی مجھے ڈر لگا ہوا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سانپ ریل گاڑی کے ...
کی آواز کے عاشق ہوتے ہیں اور برسات کی راتوں میں ریل کی پٹڑی پر لیٹ کر ...
آتی ہوئی گاڑیوں کے پہیوں کی تھرتھراہٹ کو محسوس کر کے مست ہو جاتے ہیں۔ ...
قدموں کی آواز پر کوئی بھی سانپ گھبرا کر مجھے ڈس سکتا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے ...
اندھیرے میں کوئی سانپ ریلوے لائن پر لیٹا بھی ہوا تھا تو اس نے میری طرف توجہ ...
لیکن ایک آدمی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

ریل کی پٹڑی زمین سے چھ سات فٹ کی بلندی پر بنی ہوئی تھی۔ یہ آدمی ...
چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی جو جل رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں میں سے نکل ...
نظر آیا۔ وہ سامنے کی جانب سے میری طرف آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ وہیں رک گیا ...
جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے آواز دی۔

"کون ہو؟"

میں رک گیا۔ میں نے کہا۔

"گاڑی چھوٹ گئی تھی۔ پیدل اگلے سٹیشن پر جا رہا ہوں۔"

وہ آدمی لالٹین ہاتھ میں لئے اوپر میرے پاس آ گیا۔ اس کے دوسرے ...
لمبا بانس تھا۔ دیہاتی آدمی تھا۔ کہنے لگا۔

"اگلا سٹیشن تو کوسوں دور ہے۔ راستے میں کوئی شیر چیتا مل گیا تو ...
چھوڑے گا۔"

میں پریشان ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"پھر میں کیا کروں؟"

کہنے لگا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ گاؤں قریب ہی ہے۔ وہاں رات گزار کر صبح چلے جانا ...

اس کے لہجے میں بڑی شفقت تھی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم کھیتوں میں
سے گزر رہے تھے۔ شاید دیہات کے کھیت تھے کیونکہ چاولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو کسی وقت
آ جاتی تھی۔ ایک دو میل جانے کے بعد ایک گاؤں کی دو تین بتیاں دکھائی دیں۔ یہ ایک
چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے مکانوں پر اندھیرا چھا رہا تھا وہ آدمی مجھے ایک پرانی حویلی میں
لے آیا۔ یہاں اس نے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ ایک عورت نے دروازہ کھول کر نیند بھری آواز
میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

اس آدمی نے اپنا ہندوانہ نام بتایا جو میں بھول گیا ہوں۔ کہنے لگا۔

"پورب دادا سے کہو اس کا ایک مہمان آیا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے لالٹین میرے چہرے کے قریب کر دی۔ عورت
نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔

"اسے اندر لے آؤ۔"

دیہاتی بولا۔

"تم اسے اندر لے جا کر سلا دو۔ میں صبح پورب دادا سے مل لوں گا۔"

عورت نے مجھ سے کہا۔

"آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔"

مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ مجھے علم
کیسے ہو سکتا تھا۔ عورت نے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر دیا۔ ڈیوڑھی میں دھیمی روشنی والی
... روشن تھی۔ لالٹین کی روشنی میں عورت کی آگے مڑی ہوئی ناک سے مجھے اس پر کسی
... کا گمان ہونے لگا تھا مگر اس کا لہجہ بڑا شفقت بھرا تھا۔ کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ اندر والے صحن میں چارپائی پر سو جانا۔ تم کہاں سے آ رہے [illegible]

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر حویلی کے اندرونی صحن میں لے آئی جو چاروں طرف

سے اونچی اونچی قلعہ نما دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ بمبئی سے دلی جا رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ گاڑی رکی۔ میں نیچے اتر کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے ذرا دور چلا گیا تو گاڑی چل پڑی۔ دوڑ کر گاڑی پکڑنا چاہا مگر اس کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ میں اسے نہ پکڑ سکا۔ عورت بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ پورب دادا کی لاریاں چلتی ہیں۔ وہ تمہیں صبح کی لاری پر بٹھا دے گا۔ تم دلی چلے جانا۔''

میں نے پوچھا۔

''دلی یہاں سے کتنی دور ہے؟''

عورت نے کہا۔

''زیادہ دور نہیں ہے۔ اب تم سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔''

وہ عورت چلی گئی۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ فوراً ہی سو گیا۔ صبح اس عورت نے مجھے جگا کر کہا۔

''اٹھو۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو۔''

غسل خانہ کونے میں بنا ہوا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھو لیا۔ عورت مجھے رسوئی لے گئی۔ وہاں چائے پک رہی تھی۔ ساتھ رات کی پکی ہوئی روٹیاں اور مکھن تھا۔ بہت بھوک لگ رہی تھی۔ خوب ناشتہ کیا۔ عورت مجھے تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھور کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''پورب دادا کی لاریاں کہاں سے چلتی ہیں؟ مجھے وہاں چھوڑ آؤ۔ میرے پاس ٹکٹ کے پیسے ہیں۔''

عورت کے چہرے پر ایک پراسرار سا تبسم نمودار ہوا اور فوراً ہی غائب ہو گیا۔ وہ تازہ روٹیاں پکا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''صحن والی چارپائی پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ پورب دادا کا آدمی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔ اس کے ساتھ چلے جانا۔''

میں چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ حویلی کا ماحول بڑا پراسرار سا تھا۔ وہاں سوائے اس عورت کے مجھے کوئی دوسرا انسان ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی۔ ایک کالے رنگ کا دبلا پتلا آدمی جس نے سر پر نیلا رومال باندھ رکھا تھا صرف ایک صدری اور دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ عورت کے ساتھ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور میرا جائزہ لینے لگا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عورت نے مجھ سے کہا۔

''یہ شامو ہے۔ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ تمہیں خود دلی جانے والی لاری پر بٹھا دے گا۔ جاؤ۔''

شامو کی نسواری رنگ کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اسے اس کا شکار مل گیا ہو۔ کہنے لگا۔

''آ جاؤ بابو! آ جاؤ۔ تمہیں دلی پہنچائے دیتا ہوں۔''

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ حویلی کے باہر ایک خستہ حال سی پرانی جیپ کھڑی تھی جس کی چھت ترپال کی تھی۔ شامو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ کہنے لگا۔

''بابو! پنجاب سے آئے ہو؟''

میں نے کہا۔

''ہاں۔ امرتسر سے۔''

''ہوں۔'' شامو بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

جیپ کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے کچے راستے پر گرد اڑاتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیپ گاؤں کی طرف جانے کی بجائے اسے ایک طرف چھوڑ کر اس سے آگے نکل گئی ہے۔ میں نے جھجکتے ہوئے شامو سے پوچھا کہ لاری اڈا گاؤں میں نہیں ہے؟ اس نے کہا۔

''پورب دادا کا لاری اڈا گاؤں سے کچھ دور واقع ہے۔ ابھی پہنچ جائیں گے

وہاں۔"

جیپ کھیتوں سے نکلی تو چھوٹے بڑے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے سو
کہ پورب دادا کو گاؤں سے باہر لاری اڈا بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس وقت آسمان
بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہوا تو درختوں اور جنگلی جھاڑیوں وا
ایک جنگل شروع ہوگیا۔

اس جنگل کے وسط میں کھلی جگہ تھی جہاں میں نے دیکھا کہ پندرہ بیس میری ع
کے لڑکے کلہاڑیاں لئے درخت کاٹ رہے تھے۔ چھ سات آدمی بندوقیں اٹھائے ان
نگرانی کر رہے تھے۔ ابھی تک مجھے ان لڑکوں کے پاؤں میں پڑے ہوئے لوہے کے
کڑے نظر نہیں آئے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ اردگرد کے قصبوں کے لڑکے ہیں جو یہاں محنت
مزدوری کر رہے ہیں۔ شامو نے جیپ سے اترتے ہوئے کہا۔

"آ جاؤ۔ تمہیں دلی جانے والی لاری پر سوار کرا دوں۔"

وہاں درختوں کے نیچے کھپریل کی تین چار چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں
ان میں ایک کوٹھی لمبی تھی اور فوجی بیرک کی طرح کی تھی۔ ایک موٹا چوڑا چکلا، بھار
مونچھوں والا کالے رنگ کا آدمی مونڈھے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک آدمی اس کے
پاؤں میں بیٹھا اس کی پنڈلیاں دبا رہا تھا۔ سامنے تپائی پر کچھ پھل وغیرہ پڑا تھا۔ شامو نے
مجھ سے کہا۔

"یہ پورب دادا ہے۔ یہ تمہیں دلی پہنچا دے گا۔"

اس وقت میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا۔ کم بخت چھٹی حس نے مجھے خبردا
کرتے ہوئے بڑی دیر کر دی تھی۔ اگر ایک روز پہلے یہ چھٹی حس مجھے خبردار کر دیتی تو م
اس آدمی کے ساتھ کبھی نہ جاتا جو ایک رات پہلے مجھے ریلوے لائن پر ملا تھا۔ لیکن اب د
ہو چکی تھی اور جو کچھ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا وہ ہونے والا تھا۔

مجھے شامو نے پورب دادا کے سامنے پیش کر دیا۔

پورب دادا کی آنکھیں نسواری تھیں۔

پورب دادا نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"کیوں بے! کہاں سے آیا تھا؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"پنجاب سے۔"

پورب دادا نے شامو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ارے شاموا سے کام پر لگا دے۔ جا۔"

میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا کہ میں دلی جانا چاہتا ہوں۔ مجھے کام کی
ضرورت نہیں ہے۔ اس پر پورب دادا نے مجھے اردو میں ایک موٹی سی گالی دی اور کہا۔

"ابے تمہیں کام کی ضرورت نہیں ہے تو کیا ہوا۔ ہمیں تو کام کی ضروت ہے۔"

اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دیتا شامو مجھے بازو سے پکڑ کر ایک کوٹھڑی میں
لے آیا جہاں ایک آدمی چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ شامو نے اس آدمی سے کہا۔

"دادا نے کہا ہے، اس کا راکھی بندھن کر دو۔"

◆......◆......◆

میں نے دیکھا کہ دیواروں پر لوہے کی زنجیریں اور مختلف سائز کے پاؤں میں ڈالنے والے آہنی کڑے یا بیڑیاں لٹک رہی تھیں۔ میں گھبرا گیا اور وہاں سے بھاگنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ میری عقل کہہ رہی تھی کہ تم پھنس گئے ہو۔ تمہیں رات کے وقت لالٹین والے آدمی کے ساتھ کبھی نہیں جانا چاہئے تھا۔ اب تم بری طرح پھنس چکے ہو۔ اس آدمی نے چارپائی سے اٹھ کر میری ایک پنڈلی کو ہاتھ لگا کر دیکھا اور پھر دیوار پر لٹکے ہوئے لوہے کے دو کڑے اتار کر لے آیا۔ میں نے کچھ گھبراہٹ اور کچھ غصے کے ساتھ کہا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

شامو نے کہا۔

''ارے بابو! یہ کلوا لوہار ہے۔ تمہارے پاؤں میں کڑا ڈال کر تمہارا راکھی بندھن کر رہا ہے۔ تم ذرا پہن کر تو دیکھو۔''

جونہی وہ آدمی میری طرف بڑھا میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور اونچی آواز میں کہا۔

''خبردار جو میرے پاؤں میں کڑا ڈالنے کی کوشش کی۔''

اس کے ساتھ ہی شامو نے اتنی زور سے مجھے ایک تھپڑ مارا کہ میں نیچے گر پڑا اور میرے ہونٹوں کے کنارے سے خون بہنے لگا۔ شامو مجھے گالیاں دینے لگا۔ اسی نے اپنے آدمی سے کہا۔

''اسے پکڑ کر ڈالو اس کے پاؤں میں بیڑیاں۔''

میں جکڑا گیا تھا۔ سہم گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ بڑے ظالم جابر قسم کے لوگ ہیں اور مجھے قید کر رہے ہیں۔ اب میں ان کے قبضے میں ہوں۔ میرے پاؤں میں لوہے کے دو کڑے ڈال دیئے گئے۔ ان کڑوں کے ساتھ گز ڈیڑھ گز کی ایک زنجیر بھی بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں قدم قدم چل تو سکتا تھا مگر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ شامو نے اس کوٹھڑی میں سے ایک کلہاڑی اٹھا کر دیدی اور کہا۔

''چلو بے میرے ساتھ۔''

شامو مجھے کوٹھڑی سے نکال کر اس طرف بڑھا جہاں دس پندرہ لڑکے درختوں کی کٹائی کر رہے تھے۔ میں ٹھیک طرح سے چل نہیں سکتا تھا۔ مگر چلنے پر مجبور تھا۔ لوہے کے کڑے میرے پاؤں کو تکلیف دے رہے تھے۔ وہاں جو مسلح پہریدار لڑکوں کی نگرانی کر رہے تھے ان کے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے مجھے بھی کام پر لگا دیا۔ میں نے امرتسر کے لکڑی کے ٹال پر مزدوروں کو لکڑیاں کاٹتے دیکھا تھا مگر خود کبھی کسی درخت پر کلہاڑی نہیں چلائی تھی لیکن یہاں میں قیدی تھا۔ میں نے ذرا دیر کر دی تو پہلے سے ایک پہریدار نے مجھے گالی دیکر ایک تھپڑ مارا اور کہا۔

''دیکھتا کیا ہے بے! کام شروع کر۔''

میں نے مجبوراً درخت کاٹنا شروع کر دیا۔ دوسرے لڑکوں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جسم کمزور ہو گئے تھے۔ چہروں پر فاقہ کشی کے آثار تھے۔

دوپہر تک میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ مشقت کرتا رہا۔ کسی لڑکے کو ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر غلطی سے کوئی لڑکا کسی لڑکے سے کوئی بات کرتا تو پہریدار اسے مار مار کر اس کا برا حال کر دیتے۔ دوپہر کو ہمیں کھانے کیلئے دال اور باسی روٹی دی گئی۔ اس کے بعد پھر ہمیں کام پر لگا دیا۔

شام تک ہم مشقت کرتے رہے۔ میرا برا حال تھا۔ سارا جسم تھکاوٹ سے چور چور ہو گیا تھا۔ رات کو ہمیں ایک لمبی بیرک میں گھاس پھوس پر ڈال دیا گیا۔ بارک میں

صرف ایک لالٹین روشن تھی۔ دو پہریدار بندوقیں لئے بارک کے دونوں دروازوں پر بیٹھے پہرہ دے رہے تھے۔ تمام لڑکے اس قدر تھکن سے چور تھے کہ کسی کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا ہوش نہیں تھا۔ سب گھاس پھوس پر گرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی سو گئے۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سارا بدن درد کر رہا تھا۔ ہونٹ جہاں سے پھٹ گیا تھا وہاں بھی زخم میں درد ہو رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ میں کیوں اس آدمی کے ساتھ چل پڑا تھا۔ مگر اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف وہاں سے فرار کی ترکیبیں ہی سوچ سکتا تھا جو بظاہر بہت مشکل دکھائی دیتا تھا۔

ایک تو یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ سارا علاقہ ویران جنگلاتی تھا۔ ہمیں روز صبح اٹھا دیا جاتا۔ ایک ایک گلاس چائے کا ایک باسی روٹی کے ساتھ دیا جاتا۔ اس کے بعد ہمیں جانوروں کی طرح ہانک کر جہاں کٹائی ہو رہی تھی وہاں پہنچا دیا جاتا اور ہم درخت کاٹنے کی مشقت میں لگ جاتے۔ مسلح پہریدار ہر وقت ہماری نگرانی کرتے رہتے۔

اسی طرح جب ایک ہفتہ گزر گیا تو ایک دن ہم سب کے پاؤں میں سے لوہے کے کڑے اتار دیئے گئے۔ جنگل کے تقریباً سارے سوکھے درخت ہم نے کاٹ ڈالے تھے۔ اس کے بعد ہمارے پاؤں میں رسیاں باندھ دی گئیں۔ رسیاں اس طرح باندھی گئی تھیں کہ ہم چل تو سکتے تھے مگر بھاگ نہیں سکتے تھے۔

دو دن تک ہم سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ ہمیں ندی پر لے جا کر نہلایا گیا۔ پھر سب لڑکوں کو جن کی مشقت اور کم خوراک سے پسلیاں نظر آنے لگی تھیں ایک ایک کرتا اور ایک ایک نیکر پہننے کو دی گئی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہمیں کسی اور مہم کیلئے تیار کیا جا رہا ہے۔

آخر یہ راز بھی کھل گیا۔

معلوم ہوا کہ ہمیں وہاں سے ایک بڑے ٹرک میں ڈال کر بمبئی لے جایا جا رہا ہے جہاں ہمیں ایک اور ایجنٹ کے ہاتھوں فروخت کر دیا جائے گا اور وہ ایجنٹ ہمیں کسی طریقے سے بحری جہاز میں سوار کرا کر جنوبی افریقہ لے جائے گا جہاں ہمیں کسی گھنے جنگل کی کٹائی پر لگا دیا جائے گا۔ یہ بات مجھے ایک لڑکے نے سرگوشیوں میں بتائی تھی۔ اتفاق

سے ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس لڑکے نے پہریداروں سے یہ بات سنی تھی۔

میں اس انکشاف پر بڑا پریشان ہوا۔ میں کنوئیں سے نکل کر کھائی میں گرنے والا تھا۔ اگر ایک بار جنوبی افریقہ کے جنگلوں میں پہنچا دیا گیا تو پھر ساری زندگی وہاں سے رہائی نصیب نہیں ہو گی۔ سخت مشکل میں پھنس گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

پاؤں میں بندھی ہوئی رسی کی وجہ سے میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ تیسرے دن رات کے وقت وہاں ایک بہت بڑا ٹرک آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہمیں بارک سے نکال کر اس ٹرک میں جانوروں کی طرح ٹھونس دیا گیا۔ ٹرک کے اندر دونوں جانب دیوار کے ساتھ لوہے کی ہکیں لگی ہوئی تھیں۔

ہمارے پاؤں کی رسیاں کھول کر ہمارے پاؤں میں لوہے کی زنجیریں ڈال کر زنجیروں کے کنڈے ٹرک کی ہکوں میں پھنسا دیئے گئے۔ ٹرک چاروں طرف سے بند تھا۔ صرف دیواروں کے اوپر کچھ سوراخ رکھے گئے تھے جن میں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ ٹرک کے اندر اس قدر حبس تھا کہ ہم سب قیدی لڑکوں کا برا حال ہو رہا تھا۔

آخر ٹرک چل پڑا۔ ٹرک کے چلنے سے اندر تازہ ہوا آئی تو ہم سب کی جان میں جان آئی۔ ڈرائیور کی سیٹ کے عقب میں ایک چوکور کھڑکی تھی جس میں سے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھانک کر قیدی لڑکوں کو دیکھ لیتا تھا۔ ساری رات ٹرک چلتا رہا۔ دن نکلا تو ٹرک سڑک سے ہٹ کر جنگل میں کسی جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں ہمیں ٹرک سے نکال کر ایک جگہ درختوں کے درمیان تھوڑا بہت چلایا پھرایا گیا۔

چار مسلح پہریدار ہمارے آگے پیچھے تھے۔ اس وقت ہمارے پاؤں کھلے تھے۔ مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ بھاگ سکتا۔ یہاں ہمیں چائے اور باسی روٹی کھانے کو دی گئی۔ ایک ندی پر ہمیں سخت پہرے میں نہلایا گیا۔ اس کے بعد ہم سب قیدی لڑکوں کے ایک ایک پاؤں میں رسی باندھ کر ایک دوسرے سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ ہم چل

پھر تو سکتے تھے مگر بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بندوق لئے ایک پہریدار ہر وقت
ہمارے سر پر موجود ہوتا تھا۔

دوپہر کو ہمیں پتلی دال کے ساتھ دو دو روٹیاں کھانے کو دی گئیں۔ اسی طرح
رات کو بھی ہمیں یہی کھانا دیا گیا جب رات کا اندھیرا چھانے لگا تو ہمیں واپس ٹرک میں
مال مویشیوں کی طرح دھکیل کر ہمیں زنجیروں کے ساتھ باندھ دیا گیا اور ٹرک چل پڑا۔

تین راتوں کے سفر سے ہم بمبئی پہنچے۔

ان لوگوں نے ٹرک بمبئی کے ساحل سمندر سے کچھ فاصلے پر ایک ویران جگہ پر
کھڑا کیا تھا۔ یہاں دو آدمی آئے۔ انہوں نے ہمارا معائنہ کیا اور چلے گئے۔ یہاں ہمیں
بتایا گیا کہ ہم جنوبی افریقہ جا رہے ہیں جہاں ہم محنت مزدوری کریں گے اور ہمیں نئے
کپڑے بھی ملیں گے اور ہر مہینے اتنی تنخواہ دی جائے گی کہ ہم اپنے گھر والوں کو بھی پیسے بھیج
سکیں گے۔ ہمیں وہاں پوری آزادی ہوگی اور ہم شہر کی سیر بھی کر سکیں گے۔ یہ سب جھوٹے
دلاسے دینے والی باتیں تھیں۔ ہم سب لڑکوں کو معلوم تھا کہ ہم ایک کنویں سے نکل کر
دوسرے کنویں میں گر رہے ہیں۔

میرا دل یہ سوچ سوچ کر بیٹھا جا رہا تھا کہ اگر میں بھی ان کے ساتھ جنوبی افریقہ
چلا گیا تو پیچھے میرے ماں باپ، بہن بھائیوں کا تو برا حال ہو جائے گا۔ میں تو انہیں بتا بھی
نہیں سکوں گا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ یہ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ میں
کسی حادثے میں ہلاک ہو چکا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کہاں
جاؤں۔ میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے مجھے اس قسم کی سنگین صورتحال کبھی پیش
نہیں آئی تھی۔ ہمیں سمندر کے کنارے ایک ویران بارک میں بند کر دیا گیا۔ ہمیں دوسرے
ایجنٹ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ یہاں ہماری نگرانی کرنے والے نئے لوگ تھے۔ ان کے
پاس رائفلیں تھیں۔ بڑے ایجنٹ نے ہم سب کو ایک تقریر کر کے خبردار کر دیا تھا کہ اگر کسی
نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے وہیں گولی مار دی جائے گی۔

بارک میں ہمارے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ کسی لڑکے کے فرار

ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ معلوم ہوا کہ آدھی رات کے بعد سمندر کے کنارے
ایک سٹیمر آئے گا جو ہمیں لے کر روانہ ہو جائے گا۔

میرے سامنے فرار ہونے کا صرف یہی ایک موقع تھا کہ جب تک سٹیمر میں سوار
نہیں ہوتا یہاں سے کسی طرح فرار ہو جاؤں۔ ایک بار دوسرے لڑکوں کے ساتھ سٹیمر میں
ٹھونس دیا گیا تو پھر ساری زندگی اس عذاب سے نجات حاصل نہ کر سکوں گا۔ مگر سمجھ میں نہیں
آتا تھا کہ فرار کس طرح ہوا جائے۔ دونوں پاؤں ڈیڑھ گز لمبی زنجیر سے بندھے ہوئے
تھے۔

زنجیر کے ساتھ چلنا مشکل تھا۔ بھاگ کیسے جاتا۔ اس وقت ابھی رات کا پہلا
پہر تھا۔ باقی جتنے بھی لڑکے تھے سب ان لوگوں نے اپنے علاقے کے ادھر ادھر کے دیہات
سے پکڑے ہوئے تھے۔ سبھی غریب کسانوں اور محنت مزدوری کرنے والوں کے ان پڑھ
لڑکے تھے۔ ان میں صرف میں ہی ایک پڑھا لکھا تھا۔

ان سب کے رویئے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی اس مصیبت کو قبول کر
لیا ہوا تھا اور ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ فرار ہو سکیں۔ لیکن میں ہر حالت میں فرار ہونا
چاہتا تھا لیکن فرار کی کوئی کارگر تدبیر سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے پاس صرف چار پانچ
گھنٹے ہی باقی تھے۔ اگر ان چار پانچ گھنٹوں میں یہاں سے بھاگنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو
پھر میرا سمندر پار جنوبی افریقہ کے جنگلوں سے نکل کر اپنے وطن واپس آنا مجھے ناممکن لگتا
تھا۔

میں سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا اور مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات آہستہ
آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ باہر بھی خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں صرف کبھی کبھی سمندر کی
لہروں کی آواز آ جاتی تھی۔ سارے لڑکے سو گئے تھے۔

مجھے ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں جاگ رہا تھا اور بھاگ
جانے کو بے چین تھا مگر میرے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ سے زنجیر کو
ٹٹول کر دیکھا۔ یہ لوہے کی مضبوط زنجیر تھی اور اس ایک زنجیر کو تمام لڑکوں کے پاؤں میں

سے گزار کر باندھ دیا گیا تھا۔ میں نے بارک کے دروازے کی طرف دیکھا۔ مسلح پہرے دار لالٹین کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ سٹول پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھا ہوا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سوئے ہوئے لڑکوں پر نظر ڈال لیتا تھا۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ پاک! میرے یہاں سے فرار ہونے کا غیب سے کوئی سبب پیدا کر دے۔

یہ دعا مانگنے کے چند لمحوں کے بعد مجھے اپنے کانوں میں کسی کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ پہلے میں سمجھا کہ میرے آس پاس سوئے ہوئے لڑکوں میں سے کوئی آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ میں نے ان پر نگاہ ڈالی۔ سب سو رہے تھے۔ دوسری بار پھر وہ دھیمی سی آواز سنائی دی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ میں سنبھل گیا۔ میں لیٹا ہوا تھا مگر جاگ رہا تھا۔ تیسری بار عورت کی دھیمی آواز کے ساتھ مجھے اس کے الفاظ بھی صاف سنائی دیے۔ اس نے کہا۔

"اٹھو۔ باہر نکل آؤ۔ میں کھڑی ہوں۔"

میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ یہ سمجھ کر ڈر گیا کہ یہ کسی بھوت پریت کی آواز ہے۔ چوتھی بار پھر وہی مدھم آواز آئی۔

"ڈرو نہیں۔ میں کوئی چڑیل نہیں ہوں۔ میں ترشنا ہوں۔ تم نے میری آواز نہیں پہچانی؟ میں تمہیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔"

میں بے اختیار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ پھر فوراً خیال آیا کہ پہریدار نے دیکھ لیا تو وہ مجھے گالیاں بکنے لگے گا۔ ترشنا نے کان میں کہا۔

"پہریدار کا خیال نہ کرو۔ میں نے اسے گہری نیند سلا دیا ہے۔"

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ لالٹین کی روشنی میں مسلح پہریدار سر نیچے ڈالے سو رہا تھا۔ میں آہستہ سے اٹھا اور سوئے ہوئے لڑکوں کے درمیان احتیاط سے پاؤں اٹھاتا دروازے کی طرف بڑھا۔ پہریدار سچ مچ بڑی گہری نیند سو رہا تھا اور خراٹے بھی لے رہا تھا۔

میں اس کے قریب سے ہو کر بارک سے باہر نکل آیا۔ باہر آسمان پر چاند نکلا ہوا

تھا۔ چاندنی رات میں مجھے بارک کی دیوار کے پاس ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ میں اس کی طرف جاتے ڈر رہا تھا کیونکہ اب یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ترشنا ایک نارمل لڑکی نہیں ہے بلکہ واقعی ایک بدروح ہے۔ ترشنا نے مجھے ہچکچاتے دیکھا تو خود چل کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے نیلے رنگ کی بڑی خوبصورت ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی اور بالوں میں سفید پھول سجے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے لباس میں ایسے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی جو میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"میرے ساتھ آ جاؤ۔"

❖......❖......❖

ترشنا میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل پڑی۔ مجھے وہاں چار آدمی چاندنی رات
میں نظر آئے جو رائفلیں لئے ٹہل رہے تھے۔ میں نے ترشنا کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس نے
میرے کان میں سرگوشی کی۔

"گھبراؤ نہیں ہم انہیں نظر نہیں آئیں گے۔"

اور واقعی ہم انہیں نظر نہ آئے۔ ہم ان کے درمیان سے ہو کر گزر گئے اور کسی نے
ہماری طرف توجہ نہ کی۔ ترشنا نے کہا۔

"جب تک میں نے تمہارا ہاتھ پکڑ رکھا ہے تم کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔ ہاتھ چھوڑ
دوں گی تو تم سب کو نظر آنے لگو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"ترشنا! تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں سخت مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

بھٹکی ہوئی بدروح ترشنا نے کہا۔

"جس دنیا میں ہم بھٹکتی ہوئی بدروحیں رہتی ہیں اس دنیا کا اپنا ایک نظام ہے
اپنے کچھ اصول ہیں۔ کچھ قانون ہیں۔ جب ہمیں اجازت ملتی ہے تو ہم انسانوں کی دنیا
میں آ جاتی ہیں۔ مجھے اچانک تمہارا خیال آ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تم بہت بڑی مصیبت
میں ہو۔ پس میں اجازت لے کر تمہاری مدد کرنے آ گئی۔"

میں نے ترشنا سے کہا۔

"تم جب پہلی بار مجھے ریل گاڑی میں اپنے دادا کے ساتھ ملی تھیں تو مجھے خیا
کبھی نہیں آیا تھا کہ تم کوئی بھٹکی ہوئی روح ہو۔ تم نے بھی مجھ پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ جب تم نے
مجھے جوگی کی پہاڑی والے مندر کی چڑیل سے بچایا تھا تو اس وقت بھی تم نے مجھ پر ظاہر
نہیں کیا تھا کہ تم کوئی بھٹکی ہوئی روح ہو۔ اب تم نے مجھے یہ سب کچھ کیسے بتا دیا؟"

ترشنا کہنے لگی۔

"اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تمہیں شمشان گھاٹ کے بوڑھے نے میرے بارے
میں بہت سی من گھڑت باتیں بتا دی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ میں جس کسی کو نظر آ
جاؤں پھر میں اسے دوسرے دن آ کر مار ڈالتی ہوں جبکہ یہ جھوٹ ہے۔
میں ایسا نہیں کرتی۔ پس میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اب تم سے جب بھی
ملاقات ہو گی تو تم پر اپنی اصلیت ظاہر کر دوں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک بھٹکی ہوئی
بدروح ہوں مجھے چین اور سکون نصیب نہیں ہے لیکن میں شیطانی بدروح نہیں ہوں کیونکہ
میں نے زندگی میں کسی کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ مجھے میرے گاؤں کے لوگوں نے پکڑ کر چتا پر
لٹا کر جلا دیا تھا اور میں مر گئی تھی۔

میں نے کسی سے انتقام بھی نہیں لیا۔ میں مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کر کے
اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں تا کہ میرے گناہوں کی سزا کچھ کم ہو جائے۔ میں
نے بھی زندگی میں بڑے گناہ کئے ہیں اور یاد رکھو جو کوئی چھوٹے سے چھوٹا گناہ بھی کرتا ہے
اسے اس کی سزا مرنے کے بعد بھگتنی پڑتی ہے اور جب تک ایک گناہ گار روح اپنے
گناہوں کی سزا بھگت کر پاک صاف ہو جائے وہ آسمانوں کی پاکیزہ دنیا میں داخل نہیں ہو
سکتی اور اس دنیا کی فضاؤں میں ہی بھٹکتی رہتی ہے۔"

میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"تمہیں میرا خیال کیوں آ گیا تھا؟"

ترشنا نے کہا۔

"اس لئے کہ تم مجھے اچھے لگے تھے۔ میں نے جب پہلی بار تمہیں ریل گاڑی
میں دیکھا تھا تو تم پہلی نظر میں ہی مجھے اچھے لگے تھے۔ بس پھر تمہارا خیال مجھے کیوں نہ

آتا۔"

مجھے ترشنا کی زبانی یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ اگر میں اسے چاہتا تھا تو وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اگر وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے تو پھر کیا ہوا۔ محبت بھی ایک روحانی جذبہ ہی ہوتا ہے اور میں اپنی نوعمری کے جس حصے میں سے گزر رہا تھا اس وقت انسان کی روح پوری طرح بیدار ہوتی ہے۔

ترشنا مجھے ساتھ لے کر اس علاقے سے کافی دور نکل آئی تھی۔ جنگل اور سمندر ہمارے پیچھے رہ گیا تھا اور دور کچھ فاصلے پر بمبئی شہر کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے ترشنا سے کہا۔

"مجھے اپنے بہن بھائی اور ماں باپ بہت یاد آ رہے ہیں۔ میں ان کے پاس واپس جانا چاہتا ہوں مگر میرے پاس ریل گاڑی کی ٹکٹ خریدنے کے پیسے نہیں ہیں۔ اور میں اس دفعہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں پھر کوئی ٹی ٹی مجھے راستے میں نہ اتار دے۔"

ترشنا مسکرا رہی تھی۔ چاندنی رات میں اس کا چہرہ بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"میں تمہیں ٹکٹ لے دوں گی۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

میں نے اس سے کہا۔

"ابھی ساری رات پڑی ہے۔ دلی امرتسر کی طرف کو دن کے وقت ہی بمبئی سے گاڑی جاتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ مجھے ریلوے سٹیشن کا راستہ بتا دو۔"

وہ کہنے لگی۔

"میں تمہارے ساتھ ریلوے سٹیشن پر جاؤں گی۔ مجھے تمہیں ٹکٹ لے کر بھی تو دینا ہے۔"

میں نے کہا۔

"بمبئی کا سٹیشن تو یہاں سے کافی دور ہوگا۔"

وہ بولی۔

"ہمارے لئے کوئی شے دور یا نزدیک نہیں ہوتی۔ ہم تھوڑی دیر میں سٹیشن پہنچ ئیں گے۔"

باتیں کرتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دوبارہ میرا ہاتھ پکڑ اور کہنے لگی۔

"اب ہم بہت جلد سٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔"

مجھے نہیں پتہ کہ پھر کیا ہوا۔ ہم نے ایک بڑی سڑک عبور کی۔ اس کے بعد سامنے لے میدان میں داخل ہو گئے۔ اس میدان میں سے گزرے تو ہم بمبئی شہر کے روشنیوں جگمگاتے علاقے میں آ گئے تھے۔ ترشنا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کہنے لگی۔

"اب لوگوں کو تم نظر آنے لگے ہو۔ میں نظر نہیں آ رہی۔ صرف تم مجھے دیکھ سکتے ۔وہ سامنے بوری بندر کا سٹیشن ہے۔"

میں نے نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ واقعی کچھ فاصلے پر بمبئی کا عظیم الشان بت والا بوری بندر سٹیشن موجود تھا۔ اگرچہ اس وقت رات کے دس گیارہ بجے کا وقت ہو یکن سڑکوں پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ صرف بسیں نہیں چل رہی تھیں۔ ہم بہت بڑے ہے کو پار کر کے سٹیشن کے بڑے دروازے کے سامنے آ گئے۔ ترشنا نے میرا ہاتھ پکڑ کہنے لگی۔

"اب تم کسی کو نظر نہیں آ رہے۔ ہم بڑی آسانی سے گیٹ میں سے گزر جائیں ے۔"

گیٹ میں سے گزرنے کے بعد ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ترشنا نے میرا ہاتھ چھوڑ کہنے لگی۔

"تمہاری گاڑی اسی پلیٹ فارم پر سے جائے گی۔ تم یہاں بنچ پر بیٹھو میں سے لئے ٹکٹ لے کر ابھی آتی ہوں۔"

ترشنا کی بھٹکی ہوئی روح مجھے ایک بنچ پر بٹھا کر چلی گئی۔

میں اسے پلیٹ فارم کی روشنیوں میں گیٹ کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا۔ یہ
بات تھی میں اسے دیکھ رہا تھا لیکن دوسرا کوئی انسان اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ میری
نظروں سے بھی اوجھل ہو گئی۔ میرا خیال ہے بمشکل تین منٹ گزرے ہوں گے کہ
دور سے ترشنا آتی نظر آئی۔ وہ میرے پاس آ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ریلوے
ٹکٹ تھا۔ کہنے لگی۔

''یہ میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لائی ہوں۔ یہ بمبئی سے امرتسر تک کا ٹکٹ ہے۔''

میں نے کہا۔

''تم فسٹ کلاس کا ٹکٹ خواہ مخواہ لے آئی ہو میں تو ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتا
ہوں۔''

وہ بولی۔

''لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم اس دفعہ فسٹ کلاس میں سفر کرو۔''

میں نے کہا۔

''میرا حلیہ اور میرا لباس تو بالکل تھرڈ کلاس کے مسافروں جیسا ہے۔ فسٹ کلاس
کے ڈبے میں بالکل اجنبی لگوں گا۔ کہیں ٹی ٹی مجھے پکڑ نہ لے کہ میں نے یہ ٹکٹ کہاں سے
چرایا ہے۔''

ترشنا نے ذرا غصیلی آواز میں کہا۔

''میں اس ٹی ٹی کو ایسا مزا چکھا دوں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔''

میں نے کہا۔

''لیکن تم تو مجھ سے جدا ہو جاؤ گی۔''

وہ بولی۔

''اب میں تم سے جدا نہیں ہو سکتی۔ تم سے الگ ضرور ہو جایا کروں گی۔ مگر تم
سے جدا نہیں ہوں گی۔ مجھے تمہارا ہر وقت خیال رہے گا۔ تم جب بھی مجھے یاد کرو گے میں تم
سے ملنے آ جاؤں گی۔''

پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

''تم مجھے یاد کرو گے نا؟''

میری عمر ہی جذبات کے شباب کی عمر تھی۔ میں اس کی محبت میں سرشار ہو رہا
تھا۔ میں نے کہا۔

''میں تمہیں ہر وقت یاد کروں گا ترشنا۔''

وہ بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

''میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں۔ تم امرتسر میں رہتے ہو۔ مجھے معلوم ہے۔
امرتسر شہر میں سیتلا مندر کے پیچھے ایک مرگھٹ یعنی شمشان گھاٹ ہے یعنی وہ جگہ جہاں
ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ جب بھی تمہیں میری یاد آئے اور تم مجھے ملنا چاہو تو
اس مرگھٹ میں سورج غروب ہونے کے بعد آ جانا اور مجھے آہستہ سے تین بار آواز دینا۔
میں آ جاؤں گی۔''

ہم باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ ترشنا نے
ٹرین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''تمہاری گاڑی آ گئی ہے۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں خود فسٹ کلاس میں
بٹھاتی ہوں۔''

تھرڈ اور انٹر کلاس کے مسافر اپنا سامان لئے ٹرین میں سوار ہونے لگے تھے۔
فسٹ کلاس کا ایک ڈبہ خالی پڑا تھا۔ ہم اس ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

''اس سے پہلے میں نے فسٹ کلاس میں کبھی سفر نہیں کیا۔''

ترشنا بولی۔

''تم آرام سے اپنے گھر پہنچو گے تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔''

پھر اچانک اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''تمہارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہوں گے۔''

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

وہ بولی۔

"نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کیا راستے میں تم بھوکے رہو گے؟"

اس نے اپنے ہاتھ کی ایک مٹھی میرے سامنے بند کی اور جب کھولی تو اس میں سو کے دو نوٹ تھے۔ کہنے لگی۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو۔"

دو سو روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ ایک آدمی اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ فسٹ کلاس کے ہمارے والے ڈبے میں سوار ہوا تو ترشنا نے میرے کان کے قریب ہو کر کہا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔ پھر ملیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ ڈبے سے اتر گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے سر نکال کر باہر دیکھا ترشنا پلیٹ فارم پر کہیں بھی نظر نہ آئی۔ وہ جا چکی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ ترشنا سے واقعی مجھے محبت ہو گئی تھی۔

میں اسے محبت ہی کہوں گا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں فسٹ کلاس میں سفر کرتے ہوئے اپنے شہر امرتسر پہنچ گیا۔ والد صاحب نے تھوڑی بہت پٹائی کی اور مجھے نویں جماعت میں داخل کروا دیا۔ مگر سکول میں میرا جی بالکل نہیں لگتا تھا۔

ایک بار پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ مجھے زنجیریں ڈال دی گئی ہیں۔ میں ان زنجیروں کو توڑ کر ایک بار پھر فرار ہونے کے بارے میں سوچنے لگا۔

ترشنا نے مجھے جو دو سو روپے دیئے تھے ان میں سے صرف بیس روپے ہی خرچ ہوئے تھے۔ باقی سارے پیسے میرے پاس ہی تھے۔ جو میں نے اپنی چھوٹی سی الماری میں کتابوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دفعہ بغیر ٹکٹ سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مجھے بنگال کے جنگل اور کلکتے کی بارشیں بہت یاد آ رہی تھیں چنانچہ میں نے کلکتے

کی طرف فرار ہونے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ تیاریاں تو مجھے کوئی کرنی نہیں تھیں۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے ان ہی کپڑوں میں نکل جانا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دانت صاف کرنے کے لئے ایک ٹوتھ برش جیب میں رکھ لیتا تھا۔ نیو تھیٹرز کی فلموں میں ایک ہیروئن آیا کرتی تھی جو مجھے بے حد اچھی لگتی تھی۔

اس کا فلمی نام جمنا دیوی تھا۔ یہ لمبے قد کی دبلی پتلی لڑکی تھی جو اکثر خاموش رہتی تھی۔ کسی بھی فلم میں میں نے اسے زیادہ باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ نیو تھیٹرز کی فلم "زندگی" نئی نئی ریلیز ہوئی تھی جس میں جمنا نے سہگل کے ساتھ ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں جمنا کے پراسرار خاموش کردار نے میرے جذبہ عشق کے لئے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

میں نے سوچ رکھا تھا کہ کلکتے جا کر پہلا کام یہ کروں گا کہ جمنا دیوی کے درشن کروں گا۔ "زندگی" فلم کا آخری سین ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ جب جمنا جنگل میں دریا کنارے ایک جھونپڑی میں آخری سانس لے رہی ہوتی ہے اور سہگل اس کے سرہانے بیٹھا اسے لوری سناتا ہے۔

سو جا راج کماری! سو جا۔ جب وہ لوری گا چکتا ہے تو جمنا کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سہگل دل گداز لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"سو گئیں راج کماری! ہمیشہ کے لئے سو گئیں۔"

اور خاموشی سے اٹھ کر ناریل کے درختوں میں سے گزرتا دریا کی طرف چلا جاتا ہے۔ میں نے ریلوے سٹیشن پر جا کر پتہ کیا کہ کلکتے کون کون سی گاڑی کس کس وقت جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک تو ہوڑہ ایکسپریس ہے جو صبح کے ساڑھے نو بجے چلتی ہے۔ دوسری گاڑی کلکتہ ایکسپریس ہے جو رات کے وقت آٹھ بجے پشاور سے آتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے امرتسر سے روانہ ہو جاتی ہے۔

میرے لئے رات کے آٹھ بجے والی گاڑی زیادہ موزوں اور محفوظ تھی کیونکہ اس وقت والد صاحب کے جاسوس مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ والد صاحب کے یہ جاسوس کوئی

پیشہ ور جاسوس نہیں تھے۔ اور میرے پیچھے ہر وقت میری جاسوسی نہیں کرتے تھے۔ اصل میں والد صاحب کے جاننے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ ان میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے چنانچہ ریلوے سٹیشن پر بھی والد صاحب کے دوست موجود تھے۔ یہ لوگ مجھے دیکھتے ہی سمجھ جاتے کہ میں گھر سے فرار ہو رہا ہوں۔ میری شہرت بھی ایسی ہی تھی چنانچہ وہ مجھے سٹیشن پر ہی روک لیتے تھے۔ رات کے وقت ریلوے سٹیشن پر ان لوگوں سے بچ کر نکلا جا سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے رات کی گاڑی پر فرار ہونے کا پروگرام طے کر لیا۔

ایک دن پہلے میں نے اپنے جوتوں کو پالش کیا۔ اپنا رومال بھی دھو کر استری کر لیا۔ دوسرے دن مجھے امرتسر سے بھاگنا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ کل میں سکول نہیں جاؤں گا اور حساب کے ماسٹر صاحب میرا کان نہیں مروڑیں گے۔ حساب میں' میں بے حد نکما تھا۔ حساب کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

حساب کے پیریڈ میں ماسٹر صاحب بغیر یہ سوچے کہ اس طالب علم پر میری حد سے بڑھی ہوئی اور ہتک آمیز سرزنش کا کیا اثر پڑے گا۔ سب طالب علموں کے سامنے میری بے عزتی کر دیا کرتے تھے۔ اور مجھے میرے نام سے نہیں بلکہ کھوٹا پیسہ کہہ کر بلاتے تھے جو مجھے سخت ناگوار گزرتا تھا۔ گھر سے بھاگنے کا میں نے سوائے اپنے چھوٹے آرٹسٹ بھائی مقصود کے اور کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اس کو میں نے اس لئے راز دار بنا لیا تھا کہ وہ بھی سکول اور گھر سے بھاگ جانے کے پروگرام بنایا کرتا تھا۔ مگر بھاگا کبھی نہیں تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس بار کلکتے جا رہا ہوں اور نیو تھیٹرز کی ہیروئن جمنا دیوی سے بھی ملوں گا تو وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"تمہارے پاس ریل گاڑی کا کرایہ ہے؟"

میں نے اسے بتا دیا کہ میرے پاس ڈیڑھ سو سے زیادہ روپے موجود ہیں۔

اس نے مشتبہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"تم نے کہیں چوری تو نہیں کی۔"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ یہ میرے اپنے پیسے ہیں۔"

وہ بولا۔

"تمہارے پاس یہ پیسے کہاں سے آ گئے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"پرسوں میں کمپنی باغ کی سیر کر رہا تھا کہ ایک جگہ کسی کا بٹوہ گرا ہوا دیکھا۔ اٹھا کر کھولا تو اس میں ایک سو اسی روپے تھے۔ میں نے بٹوہ وہیں پھینک دیا اور پیسے اپنے پاس رکھ لئے۔"

◆.....◆.....◆

میں آرٹسٹ بھائی کو کرشنا کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ آرٹسٹ بھائی مجھ سے دو ڈھائی سال ہی چھوٹا تھا اور ہماری آپس میں بڑی دوستی تھی۔ ہم دونوں کا مزاج بھی ایک ہی تھا۔ بارش اور نیو تھیٹرز کے گانے اور فلم چتر لیکھا کے گیت میری طرح اسے بھی بہت پسند تھے۔ وہ واٹر کلر میں جنگلوں اور سمندروں کی تصویریں بھی بنایا کرتا تھا۔ تصویر بنا کر انہیں لپیٹ کر اپنے لکڑی کے صندوق میں رکھ دیتا تھا۔ سوائے میرے کسی کو دکھاتا نہیں تھا۔ کسی کے سامنے تصویر بھی نہیں بناتا تھا۔ تصویر بناتے وقت اگر کوئی اس کے پاس آ کر تصویر دیکھنے لگتا تھا تو آرٹسٹ بھائی کا چہرہ غصے میں لال ہو جاتا تھا اور وہ سخت لہجے میں تصویر دیکھنے والے کو جھڑک دیتا تھا کہ تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کہنے لگا۔

"یار چتر لیکھا کی فلم بھی کلکتے میں ہی بنی تھی۔ اس فلم میں رام دلاری نے بڑے زبردست گانے گائے ہیں۔ اگر ہو سکے تو کلکتے میں رام دلاری کو ضرور ملنا۔"

میں نے کہا۔

"سب سے پہلے تو میں جمنا دیوی سے ملوں گا۔ اس کے بعد کوئی دوسرا کام کروں گا۔"

آرٹسٹ بھائی نے کہا۔

"میں سٹیشن پر تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

میں نے اسے کہا۔

"اگر ہم دونوں ساتھ ساتھ ریلوے سٹیشن پر گئے تو کوئی نہ کوئی جاسوس ضرور

ہمارے پیچھے لگ جائے گا اور پھر والد صاحب کو خبر کر دے گا اور میں کلکتے نہیں جا سکوں گا۔"

آرٹسٹ بھائی بولا۔

"ٹھیک ہے پھر تم اکیلے ہی چلے جانا۔"

میں نے قمیص پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پاجامہ پتلون ٹائپ کا تھا جس کی دو جیبیں تھیں۔ ایک جیب میں میں نے ٹوتھ برش رکھ لیا اور قمیص کی جیب میں ایک سو اسی روپے کاغذ میں لپیٹ کر رکھ لئے۔

گاڑی یعنی کلکتہ ایکسپریس رات کے ساڑھے آٹھ بجے چھوٹتی تھی۔ میں ساڑھے سات بجے ہی گھر سے نکل کر کچھ دیر تک کمپنی باغ میں پھرتا رہا۔ پھر سٹیشن پر آ گیا۔ سٹیشن کی ایک جانب کھڑے ہو کر میں نے بڑی ہوشیاری سے جائزہ لیا کہ وہاں کوئی اپنا محلہ دار یا واقف تو نہیں ہے۔ مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائی نہ دیا میں اوپر سے ہو کر بکنگ ونڈو پر آ گیا۔ امرتسر سے کلکتے تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور تیز تیز چلتا گیٹ میں سے گزر کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ پلیٹ فارم پر آتے ہی میں آخری سرے پر جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہاں اردگرد کوئی آدمی نہیں تھا۔ جب گاڑی کے آنے میں پانچ سات منٹ رہ گئے تو میں اٹھ کر وہیں بنچ کے پیچھے ٹہلنے لگا۔

پلیٹ فارم پر بہت بڑی گھڑی لگی ہوتی تھی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے دیکھ لیتا تھا۔

لاہور کی طرف سے جب کلکتہ ایکسپریس شور مچاتی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹرین رکی تو میں تھرڈ کلاس کا ڈبہ تلاش کرنے لگا۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ آخر میں تھرڈ کلاس کا ایک ڈبہ نظر آ گیا اور سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے ڈبے کے دوسرے دروازے کے پاس جا کر فرش پر ہی بیٹھ گیا اور ٹرین کے چلنے کی دعائیں مانگنے لگا۔ میں نے اپنا چہرہ دروازے کی طرف کر رکھا تھا تاکہ اگر کوئی کھڑکی میں سے جھانک کر اندر دیکھے تو میں اسے نظر نہ آؤں۔ یہی دھڑکا لگا تھا کہ پیچھے سے کوئی آواز نہ دے دے کہ

کہاں جا رہے ہو تم؟

خدا خدا کر کے انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور گاڑی پلیٹ فارم سے کھسکنا شروع ہو گئی۔ جب ٹرین امرتسر کے ریلوے یارڈ سے بھی گزر گئی اور شریف پورے اور رام باغ والے پھاٹک بھی نکل گئے اور ٹرین نے بھی تھوڑی سپیڈ پکڑ لی تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈبے کا جائزہ لیا۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک سیٹ پر دو دو مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ اوپر برتھ پر بھی مسافر لیٹے ہوئے تھے۔ جب ٹرین رات کے اندھیرے میں کمپنی باغ اور چالیس کنوؤں والے پھاٹک سے بھی آگے نکل گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں کلکتے کی بارشیں، کلکتے کے جنگل اور جمنا دیوی کو دیکھ سکوں گا۔

میں کلکتے پہنچ گیا۔

اس وقت کلکتے میں بونداباندی ہو رہی تھی۔ سٹیشن پر اترتے ہی مجھے فضا میں اناناس اور چائے کی خوشبو آئی۔ میں سٹیشن سے باہر نکل کر ایک جگہ سائبان کے نیچے کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کہاں جانا چاہئے۔ یہ میرا کلکتے میں چوتھا پھیرا تھا۔ شہر کی سڑکیں میرے لئے اجنبی نہیں تھیں۔ زکریا سٹریٹ میں میرے لوہ گڑھ والے پھوپھا کے بیٹے سلیمان کی قالین بافی اور شالوں کو چرخ چڑھانے کی دکان تھی۔ اس کے پاس جاتے ہوئے میں اس لئے گھبراتا تھا کہ وہ پیچھے گھر والوں کو خبر کر دے گا اور گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی آ کر مجھے پکڑ کر لے جائے گا۔ میرا دوسرا ٹھکانہ امرتسر کے اپنے ایک دوست جے جے کا فلیٹ تھا۔ جے جے کے والد صاحب خشک میوے کا بزنس کرتے تھے۔ جے جے میرے ساتھ آٹھویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ پھر اس کے والد صاحب اسے کلکتے لے گئے اور وہیں کسی سکول میں اسے داخل کرا دیا۔ جے جے دبلا پتلا گورے رنگ کا شرمیلا سا لڑکا تھا۔ پڑھائی میں بڑا تیز ہوا کرتا تھا۔ گھر میں ہر وقت کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے جے جے کے فلیٹ پر ہی جانا چاہئے۔

میں نے ایک رکشہ پکڑا اور کلکتے کی بارش میں بھیگتے بازاروں میں سے گزرتا ہوا جے جے کے فلیٹ والی بلڈنگ کے باہر پہنچ گیا۔ جے جے گھر پر ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران

بھی ہوا اور خوش بھی ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟''

میں نے کہا۔

''ہاں۔''

کہنے لگا۔

''میرے ابو کو نہ بتانا۔ کہہ دینا میں زکریا سٹریٹ والے رشتے داروں کے ساتھ آیا ہوں۔''

چنانچہ جب جے جے کے والد صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں یہی بتایا۔ وہ اس سے پہلے بھی مجھے زکریا سٹریٹ میں اپنے پھوپھازاد کی دکان پر دیکھ چکے تھے۔ ویسے بھی جے جے کے والد صاحب اپنے کاروبار میں اس قدر الجھے رہتے تھے کہ انہیں کاروبار کے سوا کسی دوسری بات کا کم ہی ہوش ہوتا تھا۔ شام کو میں اور جے جے تال جھیل کی طرف سیر کرنے نکل گئے۔ جے جے نے پوچھا۔

''سکول سے چھٹی لے کر آئے ہو کیا؟''

میں نے کہا۔

''یہی سمجھ لو۔''

کہنے لگا۔

''تمہیں اپنی پڑھائی کا حرج نہیں کرنا چاہئے۔''

میں نے کہا۔

''یار تم تو مجھے نصیحتیں نہ کرو۔''

بولا۔

''میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اس لئے تمہیں کہہ رہا تھا۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ اس بار کب تک آوارہ گردی کا ارادہ ہے؟''

میں نے کہا۔

’’اس دفعہ میں چٹا گانگ کے سمندری جنگلوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

جے جے بولا۔

’’اس طرف مت جانا۔ ابو کا ایک دوست کہہ رہا تھا کہ ادھر جادو ٹونہ کرنے والے بیراگی ہوتے ہیں اور جنگلوں میں ایسے ایسے زہریلے سانپ ہوتے ہیں جو اچھل کر آدمی کے ماتھے پر ڈستے ہیں۔‘‘

میں ہنسنے لگا۔

’’ایسے سانپ تو ہر جنگل میں ہوتے ہیں بلکہ شہروں میں بھی ہوتے ہیں۔ باقی رہی جادو ٹونے والی بات۔ تو میں جادو ٹونہ کو نہیں مانتا۔‘‘

جے جے نے کہا۔

’’پھر بھی میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ چٹا گانگ کے جنگلوں کی طرف نہ جاؤ۔‘‘

میں نے جے جے کو بتایا کہ میں تو وہاں جانے کا پکا ارادہ کر چکا ہوں۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں ضد کا پکا ہوں اور ایک بار میرے دل میں کسی طرف جانے کا خیال آ جائے تو میں اس کی طرف ضرور جاتا ہوں۔ اپنی اسی ضد کی وجہ سے مجھے زندگی میں فائدہ بھی بڑا ہوا اور نقصان بھی بہت پہنچا ہے۔ جے جے نے پوچھا۔

’’چٹا گانگ جا کر رہو گے کہاں؟‘‘

میں نے کہا۔

’’کسی چھوٹے سے ہوٹل میں دو ایک روز کے لئے ٹھہر جاؤں گا۔ میرے پاس اس بار تھوڑے پیسے ہیں۔ اس کے بعد وہاں کے جنگلوں کی طرف نکل جاؤں گا۔‘‘

جے جے نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ کہنے لگا۔

’’معلوم نہیں تمہارے اندر کس خانہ بدوش کی روح سمائی ہوئی ہے۔‘‘

تین دن کلکتے میں جے جے کے ہاں رہنے کے بعد ایک روز میں ریل گاڑی میں سوار ہو کر چٹا گانگ روانہ ہو گیا۔ کافی لمبا سفر تھا۔ چٹا گانگ پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ اس

زمانے میں چٹا گانگ اتنا ترقی یافتہ شہر نہیں تھا۔ سڑکیں صاف ستھری اور اونچی نیچی تھیں۔ کلکتے کے مقابلے میں یہاں ٹریفک کا رش بالکل نہیں تھا۔ بازار کشادہ تھے اور سڑکوں کی دونوں جانب پختہ فٹ پاتھوں پر ناریل اور سنبل کے گھنے درخت جھکے ہوئے تھے۔

میں نے ریلوے سٹیشن ہی سے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ رات کا کھانا کھا کر بازار کی سیر کرنے نکل آیا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ریستورانوں میں بنگالی گانوں کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ کچھ دیر گھومنے پھرنے کے بعد میں ہوٹل میں واپس آ گیا۔ رات کو جلدی سو گیا۔ صبح کافی دن چڑھے آنکھ کھلی۔ نیچے آ کر چائے وغیرہ پی۔ ہوٹل کا مالک ایک سکھ سردار جی تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

’’کہاں سے آئے ہو لڑکے؟‘‘

میں نے جب امرتسر کا نام لیا تو خوش ہو کر بولا۔

’’تم تو ہمارے گوروؤں کی نگری کے رہنے والے ہو۔ ادھر کیا لینے آئے ہو؟‘‘

میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ مجھے اس طرف کے جنگلات دیکھنے کا بہت شوق ہے اور یہی شوق مجھے یہاں کھینچ لایا۔‘‘

سردار بڑا حیران ہوا۔ کہنے لگا۔

’’اوئے تمہاری اپنی عمر ہی کتنی ہے اور تم جنگلوں کی سیر کرنے جا رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے یہاں کے جنگل کتنے خطرناک ہیں؟‘‘

میں نے کہا۔

’’جی سردار جی! چاہے کچھ بھی ہو۔ میں گھر سے یہی ارادہ لے کر نکلا ہوں اور اس علاقے کے جنگل دیکھ کر ہی واپس جاؤں گا۔‘‘

جب سردار کو یقین ہو گیا کہ میں پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں اور ہر حالت میں اپنی ضد پوری کر کے رہوں گا تو کہنے لگا۔

’’تم ہمارے گروؤں کی نگری کے رہنے والے ہو۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تمہیں

کوئی نقصان پہنچے۔ ٹھیک ہے۔ کاکسز بازار کے اندرونی جنگل میں میرا ایک دوست سنگھ ٹھیکیدار رہتا ہے۔ وہ درختوں کی کٹائی اور چیرائی کا کاروبار کرتا ہے۔ یہ درختوں کی کا سیزن ہے۔ آج کل وہ وہیں پر ہے۔ میں تمہیں اس کے نام خط لکھ دوں گا۔ تم اس پاس چلے جاؤ۔ وہاں رہ کر تم اردگرد کے جنگلوں کی سیر کر سکو گے۔''

سردار جی نے مجھے بڑا اچھا موقع بہم پہنچا دیا تھا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ چ چٹاگانگ میں دو دن سیر کرنے کے بعد میں کاکسز بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ سردار ج مجھے اپنے دوست بشن سنگھ کے نام ایک خط لکھ کر دے دیا تھا۔ کاکسز بازار وہاں سے دور واقع تھا۔ ایک چھوٹے سے جنگلاتی سٹیشن تک میں نے چھوٹی لائن کی ریل گاڑی سفر کیا۔ اس کے بعد ایک کھڑکھڑاتی ہوئی مسافروں سے بھری بس میں بیٹھ کر کاکسز پہنچا۔ سردار جی نے مجھے پورا نقشہ بنا کر بتا دیا تھا کہ کہاں کہاں سے مجھے جانا ہوگا۔ نقشے کے مطابق ایک بیل گاڑی پر سفر کرتا جنگل میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں بشن سنگھ ٹھیکی آرا مشینیں کٹائی کا کام کر رہی تھیں۔ علاقے کے مزدور بھی کام میں لگے تھے۔ میں ایک مزدور سے بشن سنگھ کا پوچھا تو اس نے لکڑی اور بانس کے بنے ہوئے ایک کوا طرف اشارہ کیا۔ لکڑی اور بانس کا یہ کاٹیج نما کوارٹر زمین سے کوئی چار فٹ بلند ایک پ بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں کوارٹر کے برآمدے میں سردار بشن سنگھ کے سامنے بانس صوفے پر بیٹھا تھا اور بشن سنگھ وہ خط پڑھ رہا تھا جو مجھے چٹاگانگ والے سردار جی۔ تھا۔ خط پڑھ کر بشن سنگھ نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا اور بولا۔

''کیا تم جنگل میں شکار کرنا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔

''جی نہیں۔ میں صرف جنگلوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔''

بشن سنگھ کہنے لگا۔

''بھئی واہ۔ یہ جنگل کوئی لاہور کا چڑیا گھر نہیں ہے کہ تم اس کی سیر کر۔ گے۔ یہ تو سندر بن کے جنوبی جنگل ہیں۔ یہاں دنیا کے سب سے زیادہ خونخوار شیر

زہریلے سانپ رہتے ہیں۔ میری مانو اور ایک دو دن یہاں رہ کر واپس چلے جاؤ۔''

میں نے کہا۔

''سردار جی! اب میں اتنی دور سے یہاں آیا ہوں۔ کم از کم ایک آدھ دن ہی ے جنگل کی سیر کر لینے دیں۔ پھر واپس چلا جاؤں گا۔''

بشن سنگھ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

''اس وقت تو دن ڈھل رہا ہے۔ کل صبح تمہیں ایک آدمی کے حوالے کر دوں گا۔ تمہیں جنگل کی سیر کرا دے گا۔''

شام ہوئی تو سردار بشن سنگھ دو جنگلی مرغیاں شکار کر کے لے آیا۔ نوکر نے انہیں یا۔ ساتھ چاول اور سلاد تھا۔ کھانے کے بعد میری چارپائی بانس کے بنے ہوئے ایک ونپڑے کے باہر برآمدے میں ڈال دی گئی۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے الاؤ روشن کر گیا۔ سردار بشن سنگھ نے بتایا کہ یہ آگ رات کو اس لئے روشن رکھی جاتی ہے کہ کوئی درندہ رکا رخ نہ کرے۔

رات ہوئی تو جنگل میں گہری خاموشی چھا گئی۔ آدھی رات کے وقت جبکہ میں ا جاگ رہا تھا دور سے شیر کی دھاڑ سنائی دی۔ بنگالی نوکر نے مجھے آ کر کہا۔

''بابو شیر بول رہا ہے۔ کوئی پتہ نہیں ادھر آ جائے۔ چارپائی اندر کر لو۔''

میں چارپائی جھونپڑی کے اندر لے گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر تک شیر کے جنے کی گونج سنائی دیتی رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ جانے کس وقت میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو ا دن نکل آیا تھا۔ میں اٹھ کر درختوں کے نیچے پھرنے لگا۔ جہاں گھاس اور جھاڑیوں اوپر درختوں کی چھاؤں نہیں تھی وہاں جھاڑیوں کے پتے اور گھاس شبنم میں شرابور تھی۔ ں میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے پھول کھلے ہوئے تھے۔ دھوپ کی سنہری کرنیں ن کی شاخوں میں سے ترچھی ہو کر آ رہی تھیں۔ کئی درختوں پر ابھی تک چڑیاں اور ے بول رہے تھے۔ فضا پاکیزہ اور شفاف تھی۔ ہوا بھی شبنم میں بھیگی ہوئی تھی۔ بعض ت اتنے اونچے تھے کہ سر اٹھا کر دیکھنے سے بھی پورے نظر نہیں آتے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سردار جی نے ایک دبلا پتلا بنگالی میرے ساتھ کر

کہنے لگے۔

''یہ بھلوا ہے۔ یہ تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر جنگل کی سیر کرائے گا۔ میں نے ا

سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم بھی جنگل میں زیادہ دور جانے کی کوشش نہ کرنا۔''

بنگالی ملازم جس کا نام بھلوا تھا میرے آگے آگے چل پڑا۔ اس کے ہاتھ

ایک نیزہ تھا۔ جب ہم کٹائی کے علاقے سے نکل کر ایک دوسرے جنگل میں داخل ہو

میں نے بھلوا سے پوچھا۔

''بھلوا! میں نے سنا ہے بنگال میں جادو ٹونہ کرنے والے بیراگی سا

ہوتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟''

بھلوا بولا۔

''بیراگی لوگ بہت کم جادو ٹونہ کرتے ہیں لیکن یہاں کے سپیرے

زبردست جادو ٹونہ کرتے ہیں۔ بعض سپیروں کے پاس ایسی ناگنیں ہیں جو دن کے

سانپ کی شکل میں پٹاری میں بند رہتی ہیں اور رات کو عورت بن جاتی ہیں۔''

◆......◆......◆

بھلوا کی باتیں میرے ذوق تجسس کو مہمیز لگا رہی تھیں۔ میں اسی قسم کی داستانیں

ناچاہتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''بھلوا! کیا تم نے کبھی کسی ایسی عورت کو دیکھا ہے جو دن کے وقت سانپ اور

ت کے وقت عورت بن جاتی ہے؟''

بھلوا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ جسم پر

ائے ایک پرانی سی صدری اور دھوتی کے اور کچھ نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

''ایک بار مجھے ایسی ناگن عورت ملی تھی مگر میں نے اسے پہچان لیا تھا اور موقع

تے ہی بھاگ گیا تھا۔''

میں نے سوال کیا۔

''تمہیں بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ سانپ کی شکل میں تھی؟''

''نہیں۔'' بھلوا بولا۔

''وہ عورت کی شکل میں تھی مگر میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت اصل

لا سانپ ہے۔ ناگن ہے۔ بھاگا اس لئے تھا کہ یہ ناگن عورتیں رات کے وقت اپنے

کار کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ ان کا شکار جنگل میں بھولے بھٹکے مرد ہوتے ہیں۔ یہ پہلے انہیں

نی باتوں میں الجھاتی ہیں۔ جب مرد کو ایک خاص نشہ سا ہو جاتا ہے تو یہ ناگن عورت

انپ بن کر اسے ڈس دیتی ہے اور جہاں ڈستی ہے وہاں سے آدمی کا جی بھر کر خون پیتی

ہے اور غائب ہو جاتی ہیں۔''

بھلوا نے جو داستان سنائی تھی اس سے میں بڑا متاثر ہوا تھا اور میرے دل میں
یہ خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ میں بھی کسی ایسی عورت سے ملوں جو اصل میں سانپ ہو مگر لوگوں
سے بدلہ لینے کے لئے روح کی صورت میں چل پھر رہی ہو۔ میں نے بھلوا سے کہا۔

''بھلوا۔ کیا تم مجھے کسی ایسے سپیرے سے ملا سکتے ہو جس کے قبضے میں اس قسم کی
ناگن ہو؟''

ہم جنگل کی ایک پگ ڈنڈی پر جا رہے تھے۔ ہمارے دونوں جانب اونچی اونچی
جھاڑیوں میں سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ بھلوا نے کہا۔

''میں وعدہ نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا۔ ایک سپیرے کو میں جانتا ہوں۔ اس
کے پاس ناگن عورت کو سانپ اور سانپ سے عورت بنانے کا منتر آتا ہے۔ میں آج اس
سے بات کروں گا۔ پھر تمہیں اس سے ملوا دوں گا۔''

میری ساری توجہ اب اسی سپیرے کی طرف ہوگئی تھی جسے بھلوا نے مجھے ملوانا تھا
اور جس کے قبضے میں ایک ایسی ناگن تھی جو رات کو عورت کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ میں
نے جنگل کی تھوڑی سی سیر کی اور بھلوا سے کہا۔

''بس اب واپس چلتے ہیں۔''

ویسے بھی سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس وقت جنگل خطرناک ہو جاتا ہے۔ ہم
بشن سنگھ کے ڈیرے پر آ گئے۔ دوسرے دن بھلوا میرے پاس آیا اور بڑی رازداری سے
کہنے لگا۔

''میں نے سپیرے سے بات کر لی ہے۔ ایک گھنٹے بعد میں تمہیں اس کے پاس
لے چلوں گا۔''

ایک گھنٹہ میں نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ اس کے بعد بھلوا کے ساتھ سپیرے
سے ملنے کے لئے چل پڑا۔ اس کا جھونپڑا بشن سنگھ کے ڈیرے سے جنوب کی جانب دو کوس
دور جنگل میں واقع تھا۔

عجیب ڈراؤنی شکل کا یہ سپیرا تھا۔ کالا کلوٹا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور جسم پر

ہاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ جسم پر گھٹنوں تک صرف ایک دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے
ری طرف گھور کر دیکھا اور بھلوا سے بنگالی میں باتیں کرنے لگا۔ پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں
ے مخاطب ہوا۔

''ناگن دیوی یونہی کسی کو اپنے درشن نہیں دیتی۔ اس کے لئے تمہیں میرے
ہ رہ کر چلہ کاٹنا ہوگا۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟''

میں نے پوچھا۔

''یہ چلہ کس قسم کا ہے؟''

سپیرا بولا۔

''تمہیں تین راتیں ایک ندی کے کنارے آنکھیں بند کر کے بیٹھنا ہوگا اور یہ منتر
میں پڑھنا ہوگا۔ اے ناگن دیوی! مجھے اپنے درشن دے۔ چوتھی رات کو ناگن دیوی
ہیں درشن دے گی اور پہلے سانپ کی شکل میں ہوگی اور پھنکار مارے گی۔ اس کی پھنکار
آنکھیں کھول دو گے۔ جب تمہاری اور سانپ کی آنکھیں چار ہوں گی تو ناگن فوراً
ت کی شکل اختیار کر لے گی اور تم سے کہے گی۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔ اس وقت تم جو کچھ مانگو
ناگن وہ تمہیں پیش کر دے گی۔''

یہ بہت بڑا لالچ تھا۔ میں اس لالچ میں آ گیا۔ میں نے کہا۔

''میں چلہ کاٹنے پر تیار ہوں۔''

سپیرے نے کہا۔

''ایک بار پھر سوچ لو۔ اگر تم نے چلہ ادھورا چھوڑ دیا اور بھاگ گئے تو جہاں بھی
گے ناگن وہاں آ کر تمہیں ڈس دے گی۔''

میں نے کہا۔

''میں ہر حالت میں چلہ پورا کروں گا۔ میں آج رات کو ہی چلہ شروع کرنے پر
ہوں۔''

بشن سنگھ کے بنگالی نوکر نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے کہا۔

''بھلوا! میں ابھی سے سپیرے بابا کے پاس رہوں گا اور رات کو چلہ شروع کر دوں گا۔ تم سردار جی سے جا کر کہہ دینا کہ میں تین دنوں کے بعد واپس چٹا گانگ چلا گیا ہوں۔''

بھلوا میری دلچسپی اور شوق کو دیکھتے ہوئے راضی ہو گیا۔ کہنے لگا۔

''بابو! ایک بار چلہ شروع کیا تو اسے پورا کرنا۔ نہیں تو زندہ نہ بچو گے۔ ناگن تمہیں ڈھونڈ نکالے گی اور ڈس کر ہلاک کر ڈالے گی۔''

میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔''

اس کے بعد بھلوا چلا گیا۔ میں سپیرے بابا کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ سپیرا بھی میرے شوق کو دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

''تم بڑے بہادر لڑکے ہو۔ آج شام کو میں تمہیں وہاں لے چلوں گا جہاں بیٹھ کر تم چلہ شروع کرو گے۔''

میں شام تک سپیرے کے پاس ہی رہا۔ سپیرا تھوڑی دیر کے بعد مجھے اپنے جھونپڑے کے باہر بٹھا کر جنگل میں چلا گیا۔ کہنے لگا۔ میں سانپ پکڑنے جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو اس نے ایک ہاتھ میں سانپ پکڑ رکھا تھا۔ سانپ کو اس نے دم سے پکڑا ہوا تھا اور اسے اٹھا کر چلا آ رہا تھا۔ جھونپڑی میں آتے ہی اس نے سانپ کو پٹاری میں بند کر دیا۔ کہنے لگا۔

''یہ بڑا زہریلا سانپ ہے۔ مجھے جنگل سے اس کی بو آ گئی تھی۔ یہ سانپ کسی کسی سپیرے کے پاس ہوتا ہے۔ جس کے پاس یہ سانپ ہو اس کے اندر بہت طاقت آ جاتی ہے۔''

جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو سپیرا مجھے لے کر وہاں سے کچھ دور جنگل میں ایک ندی کے پاس آ گیا۔ ندی کا پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا۔ چھوٹی سی ندی تھی۔ اس کے اوپر درخت جھکے ہوئے تھے۔ درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ سپیرے نے ندی

کے کنارے ایک درخت کے نیچے مجھے بٹھا دیا اور بولا۔

''یہاں ساری رات بیٹھ کر تم چلہ کرو گے۔ جب درختوں پر بولنے والے پرندے خاموش ہو جائیں تو تم آنکھیں بند کر کے دل میں یہ منتر تھوڑی تھوڑی دیر بعد دہراتے رہنا۔ اے ناگن دیوی! مجھے درشن دے۔ میں صبح کو آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔''

مجھے جنگل میں ندی کے کنارے اکیلا بٹھا کر سپیرا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اوپر درخت کی جانب دیکھا۔ درخت پر پرندے شور مچا رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر ندی کا پانی پیا۔ بڑا صاف اور میٹھا پانی تھا۔ اس کے بعد درخت کے نیچے چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ تھوڑا بہت کھانا میں سپیرے کے جھونپڑے میں ہی کھا کر آیا تھا۔ میں انتظار کرنے لگا کہ کب پرندے خاموش ہوتے ہیں۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد پرندے خاموش ہو گئے اور اس طرح خاموش ہوئے جیسے سارے کے سارے ایکدم بے ہوش ہو گئے ہوں۔ جنگل کی فضا پر ایک ڈراؤنا سناٹا چھا گیا۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ کسی وقت لگتا کہ کوئی دبے پاؤں میرے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ میں چونک کر پیچھے دیکھتا۔ وہاں کوئی نظر نہ آتا۔ کسی وقت لگتا کہ مجھے سانپ کی سیٹی کی آواز آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد آواز خاموش ہو جاتی۔ اب مجھے چلا شروع کرنا تھا چنانچہ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں یہ جملہ دہرایا۔

اے ناگن دیوی! مجھے درشن دے۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل نے کہا۔ لاحول ولا قوۃ یہ تم کیا بک رہے ہو۔ تم مسلمان کی اولاد ہو۔ یہ کفر کیوں بکنے لگے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دل نے کہا اٹھ کر واپس چلے جاؤ لیکن دماغ نے کہا۔ ناگن عورت کو دیکھنے کا یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ جس طرح سے بھی ہو چلہ پورا کر لو۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور وہی جملہ دہرایا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے میری طرف بڑھ رہا ہے۔''

کاکسز بازار اور چٹا گانگ کے جنوب مشرقی جنگلوں کا سلسلہ مشرق میں سندر بن اور جنوب میں اساکان کے پہاڑی سلسلوں کے آگے تھائی لینڈ کی سرحدوں تک پھیلتا چلا

گیا ہے۔ یہ لاکھوں سال پرانے جنگل اتنے گھنے، گنجان اور دشوار گزار ہیں کہ جنگلی درندوں کو بھی گزرنے کے لئے راستہ نہیں دیتے۔ ان جنگلوں میں دن کے وقت بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ یہ جنگل قدرت کی ہیبت اور جلال کے مظہر ہیں۔ ان جنگلوں میں سے اردگرد کے دیہات کے لوگ بھی گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

پرانے تجربہ کار شکاری بھی ان جنگلوں کی طرف نہیں آتے۔ میں زندگی میں صرف ایک بار ہی ان جنگلوں میں غلطی سے نکل آیا تھا اور مجھ پر یہاں کے دہشت ناک ماحول نے خوف سا طاری کر دیا تھا اور میں جن قدموں سے چل کر وہاں آیا تھا انہیں قدموں سے واپس چلا گیا تھا۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں میں کاکسز بازار سے کافی دور ایک جنگل میں ٹھیکیدار سردار بشن سنگھ کے ہاں ٹھہرا تھا۔

مجھے بنگال کے جنگل اور ان جنگلوں کی بارش دیکھنے کی خواہش امرتسر سے کھینچ کر وہاں لے آئی تھی۔ میری زندگی کی بڑی قیمتی خواہش تھی لیکن جو کوئی سنتا وہ مجھے احمق سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ جب سردار بشن سنگھ کو معلوم ہوا کہ میں اتنی دور صرف جنگل اور جنگلوں کی بارشیں دیکھنے آیا ہوں تو انہوں نے کہا کہ۔

"تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ یہ جنگل کوئی کلکتے کے وکٹوریہ گارڈن یا تاج محل نہیں ہیں۔ کہ تم انہیں دیکھنے گھر سے نکل پڑے ہو۔"

مجھے یاد ہے میں نے سرار صاحب سے کہا تھا۔

"یہ جنگل میرے لئے وکٹوریہ گارڈن اور تاج محل سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔"

سردار صاحب کا وہاں لکڑی کی کٹائی کا ٹھیکہ تھا۔ میں روز ان کے کوارٹر سے جنگل کی سیر کو نکل جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ میں جنگل میں زیادہ آگے نہ جاؤں۔ ایک دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ میں جنگل کی سیر کر رہا تھا۔ سیر کرتے کرتے میں جنگل میں ذرا آگے نکل گیا۔ یہاں ایک چھوٹی سی ندی کو دیکھا جو درختوں کے درمیان سے ہو کر بہہ رہی تھی۔

درختوں کی شاخوں نے ندی پر چھت سی ڈال رکھی تھی۔ امرتسر کے کمپنی باغ میں

بھی ایک اتنی ہی چوڑی نہر تھی جس میں ہم خوب چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ موسم گرما تھا۔ آسمان پر بادل تھے۔ میرا جی ندی میں چھلانگ لگانے کو چاہا لیکن یہ سوچ کر ڈر گیا کہ کہیں ندی میں کوئی سانپ نہ تیر رہا ہو۔

بنگال کے ان جنگلوں میں دوسرے مہلک حشرات الارض کے علاوہ سینکڑوں قسم کے سانپ بھی ہوتے ہیں۔ ندی کا پانی اس طرح بہہ رہا تھا کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شفاف سطح پر گرے ہوئے پتے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ پانی بہہ رہا ہے۔ بڑی خاموشی تھی۔ کسی درخت پر کوئی پرندہ تک نہیں بول رہا تھا۔ فضا درختوں اور قسم قسم کی جنگلی بیلوں اور مرطوب زمین کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ جہاں ندی پر درختوں نے چھت ڈال رکھی تھی وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔

بڑا پراسرار ماحول تھا۔ اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ایسے لگا جیسے کوئی جھاڑیوں میں چلا آ رہا ہے۔ میں ڈر گیا کہ ضرور کوئی جنگلی ریچھ وغیرہ ہے۔ میں جلدی سے ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا اور جس طرف سے آہٹ سنائی دی تھی اس طرف دیکھنے لگا۔

یہ جھاڑیاں ندی کے اس کنارے پر تھیں جس طرف میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے جھاڑیوں میں سے دو آدمیوں اور ایک عورت کو دیکھا۔ دونوں آدمی عورت کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اس طرف لا رہے تھے جس طرف ایک درخت کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ میں جلدی سے ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ جھاڑی کی شاخوں میں سے مجھے باہر کا منظر برابر نظر آ رہا تھا۔

دونوں آدمی عورت کو گھسیٹتے ہوئے میرے قریب سے گزرے تو میں نے دیکھا۔ عورت ایک لڑکی تھی جس کی عمر اٹھارہ انیس سال کی ہو گی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اس نے نسواری رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی اور اس کے بال کھلے تھے۔ وہ بے حد خوفزدہ تھی اور بنگالی زبان میں کچھ بولتی جا رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ آدمی لڑکی کو کہیں سے اغواء کر کے لائے ہیں اور اب اسے جنگل میں اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے جا رہے

ہیں۔

میری عمر بھی سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ اس عمر میں ہی مجھے ہیرو بننے کا بڑا شوق تھا اور میں بغیر سوچے سمجھے خطروں کو مول لے لیا کرتا تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میرے اندر کا ہیرو بیدار ہوگیا اور میں نے ان آدمیوں کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ وہ لڑکی کو بری طرح گھسیٹ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کے کندھے سے بندوق لٹک رہی تھی۔ وہ بنگالی زبان میں لڑکی کو غصے میں کچھ کہتے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے اسے گالیاں دے رہے ہوں گے۔ میں تھوڑا فاصلہ ڈال کر جنگل میں ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ درختوں، جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک ٹیلے کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ انہوں نے بدنصیب لڑکی کو زمین پر گرا کر اس کے دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے باندھ دیئے اور اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور شاید گالیاں دیتے ٹیلے کی طرف بڑھے۔ ٹیلے کی ڈھلان کے پاس ایک کوٹھڑی سی تھی۔ انہوں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر لڑکی کو اندر دھکیلا اور دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔

تالا لگانے کے بعد وہ کچھ دیر کوٹھڑی کے باہر کھڑے آپس میں کوئی صلاح مشورہ کرتے رہے پھر واپس جس طرف سے آئے تھے اسی طرف چل پڑے۔ میں انہیں آتا دیکھ کر ایک جگہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی آپس میں بنگلہ زبان میں باتیں کرتے میرے قریب سے گزر گئے۔ جب وہ کافی دور چلے گئے تو میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

ایک خیال یہ بھی آیا کہ مجھے اس بک بک میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ پتہ نہیں یہ لوگ قاتل قسم کے جرائم پیشہ لوگ ہیں اور لڑکی بھی ہوسکتا ہے ان ہی کے طبقے کی طوائف ٹائپ کی عورت ہوگی۔ میں خوامخواہ کی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں لیکن میرے نوجوانی کے گرم خون نے جوش مارا اور دل نے کہا کہ یہ عورت ہوسکتا ہے کسی غریب ماں باپ کی بیٹی ہو اور یہ جرائم پیشہ لوگ اسے اغواء کر کے لائے ہیں اور اسے ضرور شہر میں لے جا کر کسی قحبہ خانے میں فروخت کر دیں گے۔

اب اس لڑکی کی ساری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ میرا انسانی فرض ہے کہ میں نے

اس عورت کو مصیبت میں مبتلا دیکھا ہے تو اس کی ضرور مدد کروں۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ یہ ایک جملہ کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا شروع دن ہی سے میری زندگی کا اصول رہا تھا اور اس نے میری زندگی کے تمام ایڈونچرز میں بڑا نمایاں کام انجام دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ جملہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں کبھی گھر سے بھاگ کر نہ نکلتا اور جتنے خطرناک سفر اور ایڈونچر میں نے اس نوجوانی کی عمر میں کئے ہیں شاید کبھی نہ کرتا اور اس قابل نہ ہوتا کہ آج اپنے آپ کو اپنے سنسنی خیز ایڈونچرز کے سچے واقعات سنا سکتا۔ قدرت نے مجھے کہانیاں سنانے کے لئے پیدا کیا تھا اور وہ مجھ سے وہی کام لے رہی تھی جس کے لئے اس نے مجھے پیدا کیا تھا۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ دونوں آدمی اس علاقے سے نکل گئے ہیں تو میں جھاڑیوں میں سے نکلا اور ٹیلے کے پاس کوٹھڑی کے دروازے پر آ کر رک گیا اور دروازے کی ایک درز میں سے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور لڑکی کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی دبی دبی آواز آ رہی تھی۔ مجھے ڈر بھی تھا کہ کہیں دونوں آدمی واپس نہ آ جائیں۔ ہوسکتا ہے وہ کہیں قریب ہی گئے ہوں۔ میں نے دروازے پر ہاتھ سے آہستہ سے ٹھک ٹھک کر کے اردو میں کہا۔

"تم کون ہو؟"

◆......◆......◆

کوٹھڑی کے اندر سے لڑکی کے رونے کی آواز بند ہوگئی۔ ایک لمحے کے لئے اندر بالکل خاموشی چھا گئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''میں تمہیں یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہ لوگ کون تھے؟''

کوٹھڑی کے اندر سے لڑکی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جو کچھ کہا۔ میں اس کا مفہوم یہاں سلیس اردو میں لکھ رہا ہوں۔

''بھگوان کے لئے مجھے باہر نکالو۔ میں تم کو سب کچھ بتا دوں گی۔''

میں نے کہا۔

''گھبراؤ نہیں۔ تالا لگا ہوا ہے۔ میں تالا توڑ رہا ہوں۔''

میں نے ذرا قریب ہی سے ایک پتھر اٹھایا اور تالے پر زور سے دو تین بار مارا تو تالا ٹوٹ گیا۔ میں نے کنڈی کھول کر دروازہ کھول دیا۔ لڑکی بڑی سہمی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور وہ دروازے کے پاس زمین پر بیٹھی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ کھول دیئے۔ لڑکی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اسے کہا۔

''میرے ساتھ آ جاؤ۔''

لڑکی مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر جلدی سے کوٹھڑی سے باہر نکل آئی۔ اس نے خوفزدہ آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''وہ لوگ کہاں ہیں۔''

میں نے کہا۔

''وہ اس طرف چلے گئے ہیں۔ میں تمہیں دوسری طرف سے ایک جگہ لے جاؤں گا۔ جہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔''

لڑکی میرے ساتھ چل پڑی۔ میں اسے اسی راستہ سے واپس لے آیا جس راستے سے میں اس جنگل میں داخل ہوا تھا۔ یہ دس پندرہ منٹ کا راستہ تھا لیکن ہر لمحہ مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں دونوں ڈاکو کسی طرف سے نکل کر سامنے نہ آ جائیں۔ ان میں سے ایک کے پاس بندوق بھی تھی۔ میں تیز تیز چل رہا تھا۔ لڑکی مجھ سے زیادہ تیز چل رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں چپل تھی۔ جو کلکتہ شہر میں عام طور پر عورتیں پہنتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی کلکتے یا چٹاگانگ کے شہر کی رہنے والی ہے۔

اس کے ماتھے پر کیسری رنگ کی بندیا تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی ہندو ہے۔ میں اسے سردار بشن سنگھ کے کوارٹر میں لے آیا۔ سردار صاحب برآمدے کے باہر کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میرے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر وہ میری طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔ میں نے قریب جا کر سردار صاحب سے کہا۔

''اس لڑکی کو دو آدمی اغوا کر کے لائے تھے۔ انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا۔ میں اسے کوٹھڑی سے نکال کر لے آیا ہوں۔''

سردار بشن سنگھ نے میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر لڑکی کو غور سے دیکھا اور مجھے پنجابی میں کہا۔

''یہ کیا نئی مصیبت پکڑ کر لے آئے ہو۔ تم اپنے ساتھ مجھے بھی ضرور پھنساؤ گے۔''

میں نے کہا۔

''سردار جی! یہ لڑکی مجھے کسی شریف گھرانے کی لگتی ہے۔ میں اسے اس کے گھر پہنچانا چاہتا ہوں۔''

سردار جی نے لڑکی سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔ تم کون ہو؟"

لڑکی نے اسی ٹوٹی پھوٹی بنگلہ نما اردو میں کہا۔ جس کا میں سلیس اردو میں یہاں ترجمہ کرتا ہوں۔

"میرا نام کملاوتی ہے۔ میں کلکتے کے درگا میا کے مندر کے پجاری کی بیٹی ہوں۔ میں صبح صبح مندر کے پیچھے ندی پر اشنان کرنے نکلی تھی کہ دو آدمیوں نے مجھے پکڑ کر میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر مجھے بے بس کر کے ایک گاڑی میں ڈالا اور شہر سے باہر ایک مکان میں لے جا کر بند کر دیا۔ رات کو انہوں نے مجھے مکان سے نکال کر ایک گاڑی میں باندھ کر ڈال دیا اور بندوق میری گردن کے ساتھ لگا کر مجھے راتوں رات ایک جنگل میں لے آئے۔ مجھے جنگل میں انہوں نے دو دن رکھا اور ایک رات کو وہاں سے بھی نکالا اور ایک گاڑی میں ڈال دیا۔

ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ صبح کو پھر اس جنگل میں آ گئی۔ وہاں تین اور آدمی مل گئے۔ مجھے ایک رات جنگل میں انہوں نے باندھ کر رکھا اور دوسرے دن جنگل میں ایک کوٹھڑی میں لا کر بند کر دیا۔ وہاں سے مجھے یہ بابو جی نکال کر یہاں لائے ہیں۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے کلکتے میرے پتا جی کے پاس پہنچا دو۔ پتا جی کا نہ جانے کیا حال ہو رہا ہوگا؟"

کملاوتی کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ سردار جی پر اس کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"سن او کاکا۔ میں اس بک بک میں نہیں آؤں گا۔ تم اسے لے جانا چاہتے ہو تو کلکتے اس کے باپ کے پاس لے جاؤ۔ میرا کسی کو بتانا ہی نہیں کہ یہ میرے ڈیرے پر آئی تھی۔ کل میرا ٹرک مال لے کر کاسز بازار جا رہا ہے۔ وہاں تک اسے لے کر چلے جانا۔ وہاں سے تمہیں چٹا گانگ جانے والی بس مل جائے گی۔ چٹا گانگ سے ٹرین میں بیٹھ کر کلکتے چلے جانا۔"

پھر اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس کوارٹر کے اندر جا کر چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ تمہیں دو وقت کا کھانا مل جائے گا۔ کل صبح تک خبردار کوارٹر سے باہر نہ نکلنا۔"

اس کے بعد ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کاکا تم میرے سامنے والے کوارٹر میں چلے جاؤ۔ تم یہاں کسی سے لڑکی کے بارے میں بات نہیں کرو گے۔ اور لڑکی کے کوارٹر میں بھی نہیں جاؤ گے۔ چلو چھٹی کرو۔ جاؤ میرے کوارٹر میں۔"

میں سردار جی کے کوارٹر کے کمرے میں اور لڑکی سردار جی کے دوسرے کوارٹر میں چلی گئی۔ نہ میں کوارٹر سے باہر نکلا نہ لڑکی کوارٹر سے باہر نکلی۔ دوپہر اور رات کا کھانا میں نے بھی کوارٹر کے اندر ہی کھایا۔ رات کو وہیں سو گیا۔ سردار جی باہر دیر تک بیٹھے پہرہ دیتے رہے۔ پھر وہ میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے۔

"خبردار! اگر تم نے لڑکی کے کوارٹر کا رخ کیا۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بات سردار جی نے مجھے کیوں کہی تھی۔ میرے دماغ میں یہ خیال تک نہیں آیا تھا کہ میں رات کے وقت لڑکی کے کوارٹر میں جاؤں گا۔ رات گزر گئی۔ صبح چائے وغیرہ مجھے اور لڑکی۔ دونوں کو سردار جی کے نوکر نے اپنے اپنے کوارٹر میں ہی دی۔ گیارہ بجے کے قریب سردار جی کا ٹرک آ گیا۔ ایک بجے کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سردار جی نے لڑکی کو کوارٹر میں سے نکالا۔ مجھے اور لڑکی کو ٹرک کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بٹھا دیا اور پنجابی میں کہا۔

"یہ ڈرائیور بنگالی ہے۔ یہ پنجابی نہیں سمجھتا اس لئے میں تمہیں پنجابی میں کہہ رہا ہوں۔ لڑکی کے بارے میں اس سے راستے میں کوئی بات نہ کرنا۔ یہ پوچھے بھی تو اسے جھاڑ کر چپ کرا دینا کہ تم کون ہوتے ہو لڑکی کے بارے میں پوچھنے والے۔" پھر انہوں نے صدری کی جیب میں سے بٹوہ نکالا۔ اسے کھول کر اس میں سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔

"یہ رکھو۔ یہ راستے میں تمہارے کام آئیں گے۔"

اس کے بعد سردار جی آرا مشین کے پاس جا کر لکڑی کی چرائی کا معائنہ کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ٹرک چیری ہوئی لکڑیوں کا مال لے کر چل پڑا۔ کاکسز بازار وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں نے لڑکی کملاوتی کو ساتھ لیا اور بس کے اڈے پر آ گیا۔ یہاں ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ہمیں چٹا گانگ جانے والی بس مل گئی اور ہم چٹا گانگ پہنچ گئے۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے ہم ریلوے سٹیشن پر گئے۔ معلوم ہوا کہ کلکتہ جانے والی گاڑی رات کے گیارہ بجے چلے گی۔ اتنی دیر تک ہم نے وہیں پلیٹ فارم پر ہی بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔

کملاوتی اب مجھ سے تھوڑی کھل گئی تھی۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ میں واقعی اسے اس کے باپ کے پاس لے جا رہا ہوں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں تو بنگال میں کیسے آیا ہوں۔ میں نے اسے یہی کہا کہ بس بنگال دیکھنے کے شوق میں آ گیا تھا۔ کاکسز بازار میں سردار جی ہمارے والد کے ملنے والے تھے۔ میں ان کے پاس آ کر ٹھہرا ہوا تھا۔ کملاوتی تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد چپ ہو جاتی اور یوں پلیٹ فارم پر ادھر ادھر دیکھنے لگتی جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔

درمیانی شکل وصورت کی بھولی بھالی سی لڑکی تھی۔ اس کا لباس میلا ہو گیا ہوا تھا۔ بالوں میں اس نے مجھ سے چھوٹی کنگھی لے کر ایک دو بار اپنے بالوں کو درست کر کے پیچھے جوڑا بنا لیا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی اداس اور خاموش تھیں۔ جس طرح کہ تقریباً ہر دوسری تیسری عورت کی آنکھیں ہوتی تھیں۔ میری نوعمری کے زمانے میں تو بنگالی عورتوں کی آنکھیں ایسی ہی ہوا کرتی تھیں۔ اب وہاں کا ماحول بھی بھارت کے دوسرے بڑے شہروں کی لڑکیوں کی طرح بڑا بدل گیا ہوگا۔

اب تو بھارت میں عورتوں کے لباس بھی فیشن شو ہوتے ہیں اور لڑکیاں نیم عریاں لباس میں بازاروں اور شاپنگ سنٹروں میں عام چلتی پھرتی ہیں۔ آزادی سے پہلے بنگال کا واحد صوبہ ایسا تھا جہاں عورتوں کی اکثریت بڑی خاموش خاموش اور وفا شعار مشہور

ں۔ میں نے انہیں خود ایسا دیکھا ہے۔ بنگال کی عورتوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ
بیل کی طرح اپنے خاوند سے چمٹ جاتی ہیں۔ خاوند چاہے انہیں جتنا بھی مارے پیٹے وہ
سے کبھی الگ نہیں ہوتیں۔ سلہٹ میں مجھے ایک پنجابی ٹیکسی ڈرائیور ملا تھا۔ اس کی عمر
وقت پچاس سال کے اوپر ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بنگال میں کب آیا
کہنے لگا۔

"بیس برس کا تھا کہ کام کی تلاش میں کلکتے سے آیا۔ یہاں ایک بنگالی لڑکی سے
رہو گیا۔ ہم نے شادی کر لی۔ تب سے لے کر آج تک بنگال میں ہی ہوں۔ کئی بار بیوی
ے الگ ہونا چاہا مگر وہ مجھ سے ایسی چمٹی ہوئی تھی کہ الگ ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں اسے
تا تھا۔ وہ مار کھاتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی اور مجھ سے چمٹتی جاتی تھی۔ میں تو کہتا ہوں
جو لوگ بنگال کا جادو کہتے ہیں وہ یہی عورت بنگال کا جادو ہے۔ یہ عورتیں آدمی پر خاص
ر پنجابی پر جادو کر دیتی ہیں۔"

کملاوتی کی اداس اداس آنکھیں بھی مجھ پر اپنا تھوڑا تھوڑا جادو کر رہی تھیں۔ مگر
پر اس کے جادو کا اثر اس لئے زیادہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں پہلے ہی سے ایک جادوگرنی
طلسم کا اسیر تھا۔ چٹا گانگ سے کلکتے تک کا سفر کافی لمبا سفر ہے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے چٹا گانگ سے ٹرین روانہ ہوئی۔ میں نے کملاوتی
زنانہ ڈبے میں بٹھانے کے بجائے مردانہ ڈبے میں ہی اپنے ساتھ بٹھایا۔ میں نے ڈبے
کونے والی سیٹ سنبھال لی تھی۔ کونے میں کملاوتی کو بٹھا دیا اور خود کھڑکی کی طرف ہو کر
گیا۔ گویا میں نے ڈبے کے دوسرے مسافروں اور کملاوتی کے درمیان اپنے آپ کو حائل
لیا تھا۔ عقلمندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔

ٹرین کے چلنے کے کچھ دیر بعد کملاوتی کو نیند آ گئی اور وہ دیوار سے سر ٹیک کر سو
لیکن بار بار اس کا سر نیچے کو ہو جاتا تھا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ بے چاری نہ
نے کب کی جاگی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے لیٹنے کے لئے سیٹ پر جگہ بنا دی اور اسے
دیا۔ ساری رات وہ سوئی رہی۔ دن کے وقت یاد نہیں کون سا سٹیشن آیا تو میں نے اسے

جگا دیا۔ ہم نے ڈبے میں بیٹھے بیٹھے ناشتہ وغیرہ کیا۔ مٹی کے آبخوروں میں چائے پی۔ کملاوتی کھڑکی سے باہر نہیں دیکھتی تھی۔ ڈبے میں بھی وہ دوسرے مسافروں سے منہ چھپا کر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ یہاں وہ لوگ نہیں آئیں گے۔"

کملاوتی کا رنگ زرد سا پڑ گیا۔ کہنے لگی۔

"بھگوان کے لئے ان کا ذکر نہ کرو۔"

وہ ان لوگوں سے سخت ڈری ہوئی تھی۔ خدا جانے ان درندوں نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کیا تھا کہ ان کے ذکر سے کملاوتی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس زمانے میں ریل کے کرائے زیادہ نہیں ہوتے تھے یا یہ سمجھ لیں کہ اس زمانے میں روپے کی بڑی قیمت تھی۔ مجھے یاد ہے میں چھوٹا سا تھا اپنی والدہ کے ساتھ لاہور اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہاں آیا کرتا تھا۔ اس وقت مجھے یاد ہے امرتسر سے لاہور کا ریل گاڑی کا واپسی کرایہ نو آنے ہوتا تھا۔ امرتسر سے بمبئی تک ریل گاڑی کا تھرڈ کلاس کا کرایہ اگر میں بھولا نہیں تو بارہ تیرہ روپے ہوا کرتا تھا۔

یہ ذکر میں اس لئے لے بیٹھا ہوں کہ کلکتہ پہنچنے کے بعد بھی میرے پاس سردار صاحب کے دیئے ہوئے پیسوں میں سے کافی روپے باقی بچ گئے تھے۔ ہماری ٹرین کلکتے کے سیالدہ کے سٹیشن پر رکی تھی۔ میں نے کملاوتی سے پوچھا۔

"تمہارے پتا جی کا مندر کہاں ہے؟"

اس نے کسی علاقے کا نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ پھر کہنے لگی۔

"میں رکشا والے کو بتا دوں گی۔"

میں نے ایک خالی رکشے کو روکا۔ کملاوتی نے بنگالی زبان میں اسے درگا دیوی کے مندر کا ایڈریس بتایا اور ہم رکشے میں سوار ہو گئے۔ کلکتہ شہر کی سڑکوں پر بھی اس زمانے میں ابھی ٹریفک کا سیلاب نہیں آیا تھا۔ سڑکوں پر کاریں ضرور چلتی تھیں مگر ان کا اتنا ہجوم نہیں تھا جو آج کل نظر آتا ہے۔

میں کلکتے کئی بار آیا تھا لیکن کلکتہ اتنا بڑا شہر ہے کہ میں اتنی آوارہ گردی کرنے کے جود اس شہر کا صرف ایک حصہ ہی دیکھ سکا تھا۔ ابھی تین حصے شہر باقی تھا۔ کملاوتی کو لے ر رکشا کلکتے کے ان تیسرے حصوں میں سے گزر رہا تھا جو میرے لئے اجنبی تھے۔ پھر دریا کنارا آ گیا لیکن دریا کافی فاصلے پر تھا اور سڑک اس کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ پھر رکشا سرسبز گھاس والے میدان کے پہلو سے ہوتا ہوا ایک چھوٹی سی بستی میں آ گیا جہاں نے پرانے دو دو تین تین منزلہ ڈھلوان چھتوں والے مکان تھے۔ اس بستی کے باہر ایک درختوں کے اوپر مجھے کیسری رنگ کا تکونا جھنڈا لہراتا دکھائی دیا۔ کملاوتی نے رکشا وہاں ڑ دیا۔ کہنے لگی۔

"وہ میرے پتا جی کا مندر ہے۔"

اور اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کا مکان مندر کے پیچھے ۔ وہ دوڑ کر اپنے مکان کی طرف گئی تو وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ مکان پر تالا پڑا ہوا

معلوم ہوا کہ کملاوتی کا باپ کلکتہ چھوڑ کر بردوان چلا گیا ہے۔ کملاوتی نے آ
بھری آنکھیں پونچھتے ہوئے بتایا کہ بردوان میں اس کی پھوپھو رہتی ہے۔ پتاجی اس
ہاں گئے ہوں گے۔ سوائے اس کے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ وہاں سے واپس سیالدہ سٹ
پر آ گئے اور بردوان جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔

کملاوتی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا
اس کا باپ اس کی پھوپھو کے ہاں ہی ہوگا۔ اسے فکر تھی کہ پتاجی کہیں وہاں سے بھی کسی
طرف نہ نکل گئے ہوں۔ کہنے لگی۔

"وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہیں گے۔ انہیں مجھ سے بڑا پیار ہے۔ میر
غائب ہو جانے سے انہیں بے حد صدمہ ہوا ہوگا۔"

بردوان سٹیشن کے نام سے مجھے نیو تھیٹرز کی فلم دیوداس کا وہ منظر یاد آ گیا جب
کا ہیرو دیوداس (سہگل) اپنی محبوبہ پاروتی (جمنا) سے آخری بار ملاقات کرنے کلکتے
بردوان جاتا ہے۔ وہ ایک بیل گاڑی میں بیٹھا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ بیل گاڑی کے
لالٹین جل رہی ہے۔ بیل گاڑی ایک جنگل میں سے گزر رہی ہے۔ دیوداس گاڑی بان
پوچھتا ہے۔

"کیوں بھائی! بردوان کب آئے گا؟"

گاڑی بان کہتا ہے۔

"بس دو کوس رہ گئے ہیں۔"

دیوداس زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"یہ تیرے دو کوس کب ہوں گے۔"

گاڑی بان پوچھتا ہے۔

"کیا کہا بابو جی۔"

سہگل کہتا ہے۔

"کچھ نہیں بھائی۔ جلدی چلو۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

گاڑی بان گانے لگتا ہے۔

نہ پی کی نگریا آئے ہے
نہ چین کریجوا پائے ہے
رات اندھیری رستہ دور
تھک کر ہوا مسافر چور
دھیرے دھیرے تیرا جیون
دیپک بجھتا جائے ہے
نہ پی کی نگریا آئے ہے

یہ گیت آرزو لکھنوی نے لکھا تھا۔ یہ غالباً 39-1938ء کا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ
وحانی بلندیوں کا زمانہ تھا۔ خاص طور پر نیو تھیٹرز کی فلمیں انسان کے دل میں گداز پیدا
کرتی تھیں۔ انسان ان فلموں سے نیک زندگی بسر کرنے کا سبق سیکھتا تھا۔

یہ فلمیں تصنع اور جنسی ہیجان سے پاک ہوتی تھیں۔ آرزو لکھنوی اور کیدار شرما ان
لموں کے گیت نگار تھے۔ کیدار شرما نے نیو تھیٹرز کی دو ایک ابتدائی فلموں کے گیت لکھے۔
کن آرزو لکھنوی نیو تھیٹرز کے لئے مستقل طور پر گیت لکھتے رہے اور اس وقت نیو تھیٹرز سے
ن کا ساتھ چھوٹا جب نیو تھیٹرز کی فلم کمپنی ہی ختم ہو گئی۔

آرزو صاحب اس کے بعد بمبئی آ گئے جہاں مجھے ان سے ملاقات کا شرف
ل ہوا۔ اس ملاقات کا ذکر میں تفصیل سے اپنے ایک مضمون میں کر چکا ہوں۔

یہ لکھنے کا میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت میں اس بنگالی لڑکی کے بارے میں نہیں بلکہ بردوان کے نام سے دیوداس کی ہیروئن پاروتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کتنی پاکیزہ محبتیں تھیں ان لوگوں کی۔ کتنی روحانی بلندیاں ہوتی تھیں ان کرداروں کے چہروں اور ان کی باتوں میں۔ وہ سارے کا سارا غیر مادی اور روحانیت کا دور تھا۔ ہر شے اپنی اصل حقیقت پر قائم تھی۔

کسی اخلاقی قدر کو زوال نہیں آیا تھا۔ کوئی پھول اپنی حقیقی خوشبو سے محروم نہیں ہوا تھا۔ کسی پھول پر کیمیکلز نہیں چھڑکا جاتا تھا۔ کیمیکلز کی بلا ابھی زمین کی گہرائیوں میں ہی دفن تھی۔

میں اپنے خوبصورت خیالوں سے اس وقت چونکا جب بردوان جانے والی گاڑی آگئی۔ میں بنگالی لڑکی کے ساتھ ٹرین میں سوار ہوگیا۔ بردوان کا سٹیشن آیا تو ہم ٹرین سے اتر کر لڑکی کی پھوپھو کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

میں شوق بھری نگاہوں سے بردوان کی سڑک کے ایک ایک درخت کو دیکھ رہا تھا۔ کیا خبر ان درختوں کے نیچے سے دیوداس فلم کے ہیرو کی بیل گاڑی گزری ہو۔ اب میں اس بنگالی لڑکی سے بے نیاز ہوگیا تھا۔ میں نے دل میں طے کر لیا تھا کہ اسے اس کی پھوپھو کے پاس پہنچا کر میں واپس کلکتے جاؤں گا اور نیو تھیٹرز کے سٹوڈیوز میں کسی طرح سے سہگل صاحب اور مس جمنا دیوی سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ملاقات نہ ہو سکی تو دور ہی سے دیکھ کر اپنے شوق کی تسکین کر لوں گا۔

خوش قسمتی سے بنگالی لڑکی کا پجاری باپ اپنی بہن کے گھر پر مل گیا۔ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے مل کر شدت جذبات سے بے اختیار رو پڑے۔ پجاری میرا شکریہ ادا کر رہا تھا اور میں وہاں سے بھاگ کر سٹیشن پہنچنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ آخر مجھے موقع مل گیا اور میں کوئی بہانہ بنا کر ان سے جدا ہوگیا اور سیدھا بردوان کے ریلوے سٹیشن پر آکر بیٹھ گیا اور کلکتہ کی طرف جانے والی ریل گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ بردوان سے آگے بڑا سٹیشن آسن سول ہے۔

آسن سول صوبہ بنگال کا آخری بڑا شہر ہے۔ اس کے آگے بہار کا صوبہ شروع ہو جاتا ہے۔ آسن سول جنکشن ہے۔ یہاں سے آگے ریلوے لائن دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک ریلوے لائن بنارس کان پور سے ہو کر لکھنؤ جاتی ہے اور دوسری لائن بنارس سے پٹنہ گیا اور گورکھپور سے ہوتی ہوئی لکھنؤ سے جا کر مل جاتی ہے۔

اس طرح بردوان کے سٹیشن پر دو اطراف سے ریل گاڑیاں آتی ہیں اور یہاں ریل گاڑیوں کی آمد و رفت صبح سے رات گئے تک لگی رہتی ہے۔ اس زمانے میں بھی بردوان ایک اہم سٹیشن تھا اور اب تو سنا ہے کہ بہت بڑا شہر بن گیا ہے۔

چنانچہ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور کلکتہ جانے والی ٹرین آگئی۔ اس ٹرین نے مجھے تیسرے پہر کلکتے پہنچایا۔ اب یہ سوال میرے سامنے تھا کہ میں کلکتے میں کس جگہ بسیرا کروں۔ میرے پاس کافی پیسے تھے۔ مگر اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں کسی ہوٹل میں زیادہ دن تک قیام کر سکوں۔ میں خانہ بدوش سیلانی بلکہ آوارہ گرد قسم کا نوجوان تھا اور ہوٹل میں ٹھہرنا ویسے بھی میری طاقت سے باہر تھا۔

کلکتے میں میرے دو ہی ٹھکانے تھے۔ ایک ٹھکانہ زکریا سٹریٹ کے امرتسری کشمیری شال بافوں، پٹ گروں اور شال مرچنٹس میں ہمارے لوہ گڑھ والے پھوپھا کا مکان تھا۔ وہاں یہ مصیبت تھی کہ وہ لوگ مجھے دیکھتے ہی پکڑ کر بٹھا لیتے تھے اور پیچھے امرتسر میں والد صاحب کو تار دے دیتے تھے کہ حمید کو ہم نے پکڑ لیا ہے۔ کسی آدمی کو بھیج کر اسے منگوالیں۔

ایک دو بار میرے ساتھ ایسا ہو چکا تھا چنانچہ وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کلکتے میں میرا دوسرا ٹھکانہ میرے دوست جان محمد کا گھر تھا۔ یہ گھر نہیں تھا بلکہ ڈیڑھ کمرے کا ایک بوسیدہ سا فلیٹ تھا جو لوئر چت پور روڈ پر سراج بلڈنگ کی دوسری منزل پر واقع تھا۔ جان محمد کے انکل کا کلکتے میں سلو لائڈ کا کاروبار تھا اور جان اپنے انکل کی جانب سے وہاں نگران کار مقرر تھا۔

ظاہر ہے میں نے جان محمد کے پاس ہی جانے کا فیصلہ کیا لیکن یہ معلوم نہیں تھا

کہ وہ کلکتے میں ہی ہے یا کاروباری دوروں کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ یہ لوئر چت پور روڈ اس کے فلیٹ پر جا کر معلوم ہوسکتا تھا چنانچہ میں نے ایک چوراہے سے ٹرام پکڑی اور لوئر چت پور روڈ کے سراج بلڈنگ والے چوک میں آ کر اتر گیا۔ سامنے سراج بلڈنگ تھی۔

یہ بڑی پرانی بلڈنگ تھی اور اس کے محرابی دروازے کی ڈیوڑھی میں سے ہو کر اوپر دوسری منزل کو راستہ جاتا تھا۔ محرابی دروازے کے باہر ایک جانب مٹھائی کی دکان تھی اور دوسری طرف پان سگریٹ والے بنگالی کی دکان تھی جہاں ریڈیو پر ہر وقت بنگالی گانے بجتے رہتے تھے۔

پان سگریٹ کی اس دکان پر میں نے پہلی دفعہ رابندر ناتھ ٹیگور کے رابندر سنگیت کے علاوہ مشہور مسلمان بنگالی شاعر نذر الاسلام کا نذر گیتی کا سنگیت سنا تھا۔ کلکتے کے بنگالی مسلمانوں میں نذر الاسلام کے انقلابی گیت بے حد مقبول تھے۔

نذر الاسلام کی نظموں میں اسلام کی عظمت اور جذبہ جہاد کا ذکر نمایاں تھا۔ اس کی نظمیں بڑی پر جوش اور جذبات انگیز تھیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری اگر پرسکون لہروں کے ساتھ بہتی ندی تھی تو قاضی نذر الاسلام کی شاعری طوفانی سمندر کی بپھری ہوئی موجیں تھیں۔ میرے امرتسری اور محلے دار دوست جان محمد کو بنگالی آتی تھی۔ وہ مجھے نذر الاسلام کی نظموں کا ترجمہ کر کے سنایا کرتا تھا۔

سراج بلڈنگ کے باہر پان سگریٹ والی دکان کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند تھی وہ دکان کی فضا میں پھیلی ہوئی پان کے تمباکو اور قوام کی خوشبو تھی۔ میں تمباکو والا پان نہیں کھاتا تھا مگر مجھے اس کی خوشبو بڑی اچھی لگتی تھی۔ میں اکثر اس دکان پر پاسنگ شو یا قینچی کا ایک سگریٹ لے کر صرف وہاں کی خوشبو کے لئے دیر تک کھڑا رہتا اور مجھے لگتا جیسے خوشبوئیں مجھ سے ہمکلام ہیں۔

اس وقت بھی جب میں ٹرام سے اتر کر پان کی دکان کے قریب سے گزرا تو ان خوشبوؤں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے اس وقت یہ معلوم کرنے کی جلدی تھی کہ

جس شخص کے فلیٹ پر مجھے بسیرا کرنا ہے وہ وہاں موجود ہے یا کسی دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ میں بلڈنگ کے اندر سے سیڑھیاں چڑھ کر جان کے فلیٹ پر آیا تو دیکھا کہ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہے اور جان محمد سلولائڈ کی شیٹیں گن رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے کام چھوڑ دیا اور اٹھ کر ملا۔

''تم کب آئے؟''

میں نے کہا۔

''بس ہاوڑہ سٹیشن سے سیدھا تمہارے پاس آ رہا ہوں۔''

''گھر سے بھاگ کر آئے ہونا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

''بھاگ کر ہی آ سکتا تھا ویسے مجھے کون کلکتے آنے دیتا ہے۔''

جان شیٹوں کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

''بیٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ سلولائیڈ کی شیٹیں گنو۔''

اور اس نے پچاس ساٹھ کے قریب شیٹیں نکال کر میرے آگے رکھ دیں۔ میں بھی بیٹھ گیا اور شیٹیں گننے میں لگ گیا۔ جب میں نے ساری شیٹیں گن لیں تو اسے بتا دیا کہ یہ اتنی ہیں۔ جان نے اپنی گنی ہوئی شیٹوں میں انہیں جمع کر کے ایک کاپی پر لکھ لیا اور کاپی ایک طرف رکھ کر بولا۔

''ٹھہرو میں تمہارے لئے چائے منگواتا ہوں۔''

اس نے اپنے بنگالی ملازم کو آواز دے کر بلایا اور کہا کہ بار والے سے دو چائے اور بند مکھن لے آؤ۔ آج اتنی مدت گزر جانے کے بعد وہ چائے اور بند مکھن یاد آتے ہیں تو دل تھام کر رہ جاتا ہوں۔ ایسی سچی اور پاکیزہ لذتیں قیام پاکستان کے بعد کراچی میں نصیب ہوئیں۔ وہ بھی تھوڑی مدت کے لئے اس کے بعد نہ مکس چائے میں وہ خوشبو رہی اور نہ بند مکھن میں وہ لذت دیکھی۔ جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی چیزوں کی اصلیت غائب ہوتی گئی اور ملاوٹ شروع ہوگئی۔

جان محمد مجھ سے عمر میں تین چار سال بڑا تھا۔ وہ سگریٹ کی بجائے بیڑی پ
تھا۔ اس زمانے میں پان کا یکہ مارکہ بیڑی بڑی مشہور تھی۔ جان یہی بیڑی پیتا تھا۔ م
نے بھی سگریٹ چھوڑ کر بیڑی پینی شروع کر دی۔ مگر میرا مزاج بیڑی کے موافق نہیں تھا
خاص طور پر مجھے اس کی بو بہت ناپسند تھی۔ چنانچہ میں نے ایک ہفتے تک تو اسے گوارا کیا
پھر بیڑی چھوڑ دی۔ میں نے جان سے کہا کہ میں ماسٹر کے ایل سہگل، نواب پنچھ ملک ا
جمنا دیوی ہیروئن سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا۔

''ان سے ملنا مشکل ہے۔ تمہیں کوئی سٹوڈیو کے اندر نہیں جانے دے گا۔''

میں نے کہا۔

''میں سٹوڈیو کے اندر نہیں جاؤں گا۔ جب وہ باہر نکلیں گے تو انہیں مل لوں گا۔''

وہ کہنے لگا۔

''وہ کار میں ہوں گے اور بڑی تیزی سے نکل جائیں گے۔ تم انہیں دیکھتے
جاؤ گے۔''

میں نے کہا۔

''ہوسکتا ہے وہ مجھے دیکھ کر کار روک لیں۔''

جان بڑا ہنسا۔ کہنے لگا۔

''کیوں؟ تم ان کے چاچے لگتے ہو کہ تمہارے لئے وہ کار روک لیں گے
ارے ان لوگوں کو چھوڑو۔ یہ فلموں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ عام زندگی میں کچھ نہیں
ہوتے۔ مجھے دیکھ لو۔ میں بھی ان کی فلمیں شوق سے دیکھتا ہوں۔ مگر میرا دل کبھی ان سے
ملنے کو نہیں چاہا حالانکہ سٹوڈیو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔

''یار! تم مجھے اتنا بتا دو کہ نیو تھیٹرز کا سٹوڈیو کہاں ہے۔ باقی میں جانوں اور م
کام۔''

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

''تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔''

میں نے پوچھا۔

''کیسے کیوں نہیں کرتا۔''

جان بولا۔

''خواجہ قمر بٹ تمہارا رشتے دار ہے ناں؟ وہی جن کی امجدیہ ہوٹل کے پاس
میری شالوں کی دکان ہے۔''

میں نے کہا۔

''ہاں۔ کیوں۔''

جان نے کہا۔

''اس کی فلم ایکٹروں سے بڑی واقفیت ہے۔ تم اس کو کہو۔ وہ تمہیں ان سب
ٹروں سے ملا دے گا۔''

خواجہ قمرالدین بٹ کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ہمارا بڑا قریبی رشتے دار تھا۔
میں ایک بڑی اچھی بات تھی کہ وہ کلکتہ میں مقیم ہمارے دوسرے رشتہ داروں سے بہت
ف تھا۔ وہ کھانے پینے والا آدمی تھا۔ خوبصورت گورا چٹا تھا۔ عمر پچاس کے قریب تھی
ن تیس سال کا لگتا تھا۔ بڑا خوش خوراک اور خوش لباس تھا۔ ہمیشہ جاپانی کے لٹھے کی شلوار
ھ پونڈ کی دو گھوڑا بوسکی کی قمیص اور فلیکس پمپ شوز پہنتا تھا۔

ہاتھوں میں قیمتی پتھروں والی سونے چاندی کی انگوٹھیاں اور گلے میں سونے کی
یک زنجیری ہوتی۔ کریون اے کے سگریٹ پیتا تھا جس کا گول ڈبہ ہر وقت اس کے ہاتھ
ہتا تھا۔ شراب کا عادی نہیں تھا لیکن محفل لگ جائے تو خوب پیتا تھا۔ اس میں جو
رے حساب سے سب سے اچھی بات تھی وہ یہ تھی کہ جب بھی میں گھر سے بھاگ کر کلکتے
نا اور وہ مجھے مل جاتا تو ہرگز ہرگز مجھے پکڑ کر بٹھاتا نہیں تھا اور نہ میرے گھر امرتسر کوئی خط
ھتا تھا کہ میں نے برخوردار کو پکڑ کر بٹھا لیا ہے۔ کوئی بھروسے کا آدمی بھیج کر اسے منگوا
۔ بلکہ جب پہلی بار میں گھر سے بھاگ کر کلکتے آیا تو وہ مون لائٹ سینما کے پاس مجھے

مل گیا۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟"

میں نے ڈر کے مارے کہہ دیا۔

"ہاں لالہ جی۔"

وہ بڑا خوش ہوا اور میری پیٹھ ٹھونک کر بولا۔

"شاباش! کشمیریوں کے پتروں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پیسے چوری کر کے تو نہیں لئے تھے؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں۔"

☆......☆......☆

کہنے لگا "بس چوری کبھی نہ کرنا۔ بہنوں کا گلہ توڑ کر چاہے پیسے نکال لینا۔ کہاں ٹھہرے ہو؟"

میں نے اسے جان محمد کا بتایا تو کہنے لگا۔

"کھانا کھایا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔"

بولا "یہاں کیا کر رہے ہو؟ فلم دیکھنے آئے ہو؟ فلم دیکھنی ہے تو چترلیکھا جا کر دیکھو۔ اس میں کیدار شرما ایک نئی گانے والی لڑکی لایا ہے۔ پکے گانے کی استاد ہے۔ میں کہتا ہوں ایسا گلا پھیرتی ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔"

اس نے جیب سے مجھے دس روپے نکال کر دیئے اور کہا۔

"جاؤ' سینما میں جا کر دیکھو۔ چترلیکھا فلم وہیں لگی ہے۔ بارہواں ہفتہ جا رہا ہے۔"

کلکتے میں فلم چترلیکھا جس سینما گھر میں لگی ہوئی تھی میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔ ڈلہوزی سکوئر سے ذرا آگے میرا خیال ہے کہ یہ سینما ہاؤس تھا۔ اس کا ہال زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی تین گیلریاں تھیں جو نصف دائرے کی شکل میں تھیں۔ سنا ہے کہ تھیٹر کے زمانے میں وہاں میڈن تھیٹرز کے کھیل ہوا کرتے تھے۔ جب جان نے مجھے خواجہ قمر بٹ سے ملنے کو کہا تو میں نے سوچا کہ وہ تو بڑا اچھا رشتے دار ہے' وہ مجھے ضرور سہگل اور جمنا سے ملوا دے گا۔ میں خواجہ قمر بٹ کی دکان پر جاتے ہوئے گھبراتا تھا کہ وہ امجدیہ ہوٹل کے پاس زکریا سٹریٹ میں ہے اور وہاں مجھے میرے دوسرے رشتے داروں میں سے کسی نے دیکھ لیا

تو وہ مجھے ضرور پکڑ لیں گے۔ مجھے یاد ہے یہ لوگ مجھے اس طرح ایک دم پکڑ لیتے تھے جس طرح کھیس ڈال کر چوری کا مرغا پکڑا جاتا ہے۔ یہ اپنی طرف سے میرے خیر خواہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ میں اگر اسی طرح گھر سے بھاگتا رہا تو بگڑ جاؤں گا۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ جن کو بگڑنا ہوتا ہے وہ گھر بیٹھے بیٹھے بگڑ جاتے ہیں۔

خواجہ قمر بٹ سے ملنا اب ضروری ہو گیا تھا۔

ایک دن میں شام کے وقت اپنے آپ کو چھپا کر چلتا ہوا امجدیہ ہوٹل کے قریب پہنچا تو اتفاق سے خواجہ صاحب ہوٹل میں بیٹھے چائے کا کپ سامنے رکھے سگریٹ کا کش لگا رہے تھے۔ میں جلدی سے ہوٹل کے اندر چلا گیا اور سلام کر کے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ بڑی محبت سے لگا ہوا زرد رنگ کا بنارسی پان ایک تھالی میں ان کے سامنے پڑا تھا۔ خواجہ صاحب مجھے دیکھ کر خوش ہوئے اور پہلا سوال ہی یہی کیا۔

''گھر سے بھاگ کر آئے ہو نا؟''

میں نے بھی بڑے فخر سے کہا۔

''جی ہاں' لالہ جی!''

''شاباش! کھانا کھا لیا ہے؟''

وہ کھانے کا ضرور پوچھتے تھے۔ میں نے کہا' جی ہاں۔ میں اپنے دوست جان محمد کے ہاں سراج بلڈنگ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ خواجہ قمر الدین نے بڑے سلیقے سے پان کو تھالی میں پڑے پڑے ایک ہی ہاتھ کی انگلیوں سے لپیٹ کر منہ میں ڈالا اور انگلیوں پر لگا ہوا کتھا اپنے بائیں کان کے اوپر گرے ہوئے بالوں سے پونچھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو۔''

میں نے کہا۔ ''جی نہیں' لالہ جی! آپ نے مجھے جو فلم دیکھنے کیلئے پیسے دیئے تھے وہ میرے پاس ہیں۔''

''چترلیکھا دیکھی فلم؟ اب مجھے یاد آ گیا ہے۔ جس عورت نے اس فلم میں پکے گانے گائے ہیں اس کا نام رام دلاری ہے۔ تم جاؤ جاؤ بھگوان بنے والے گانے میں کیسا گلا پھیرتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی میں نے فلم نہیں دیکھی۔ ابھی میں آپ کے پاس اس لیے ہوں کہ مجھے نیو تھیٹرز کے سٹوڈیو میں ماسٹر سہگل اور مس جمنا سے ملا دیں۔ جان کہتا تھا ہ آپ کی ان سب ایکٹروں سے بڑی واقفیت ہے۔''

خواجہ صاحب نے کریون اے کا کش لگایا اور بولے۔

''اوئے وہ لوگ تو میرے بڑے یار ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں کل تمہیں سٹوڈیو چلوں گا۔ تم اس وقت یہاں ہوٹل میں آ جانا۔ یہ لوگ سٹوڈیو میں شام کے بعد ہی تے ہیں۔ تمہیں سب سے ملاؤں گا۔''

میں بڑا خوش خوش سراج بلڈنگ میں واپس آ گیا اور جان کو سب بتا دیا۔ وہ بھی ش ہوا اور کہنے لگا۔

''میں نے کہا تھا نا یہ کام خواجہ صاحب ہی کر سکتے ہیں۔''

اگلے روز میں شام ہوتے ہی امجدیہ ہوٹل پہنچ گیا۔ خواجہ صاحب وعدے کے ابق وہاں اپنے کچھ بے تکلف دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ڑی دیر بعد میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''چلو میرے آوارہ گرد راج کمار!'' اس زمانے میں بلکہ اس زمانے سے ذرا لے یہ میرے بچپن کی بات ہے' ایک فلم پرل ٹاکیز میں لگی تھی جس کا نام تھا ''آوارہ راج ار۔

مجھے اتنا یاد ہے یہ فلم میں نے پرل ٹاکیز میں دیکھی تھی۔ اس میں شاہو معاہوک ہیرو کا کام کیا تھا۔ شاہو معاہوک اس وقت چھوٹا تھا۔

یہ فلم بڑی چلی تھی اور بڑی مشہور ہوئی تھی۔ میں سولہ سترہ سال کا ہو گیا تھا اور قمر ین بٹ کو یہ فلم ابھی تک یاد تھی۔ اس زمانے کی فلمیں بڑی سادہ ہوتی تھیں۔ فلم میں کام نے والی کسی بھی عورت کے جسم کا کوئی بھی حصہ لباس سے باہر نکلا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ سادہ تے تھے اور سیدھی سادھی فلمی کہانیاں ہوتی تھیں۔ کسی میں دیہات کے سکول ماسٹر کی کہانی تی تھی' کسی میں بہن بھائی کی محبت کی کہانی ہوتی تھی اور کسی میں باپ کی بیٹی سے محبت کا

قصہ ہوتا تھا۔ صرف وادیا مووی ٹون کی ''ہنٹر والی'' قسم کی بعض فلمیں ایسی ہوتی تھیں ج
میں عورت ذرا کھل کر ڈانس کرتی تھی۔ یقین کریں اس ڈانس کو دیکھ کر بھی ذہن میں ک
واہیات خیال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

شاید یہ اس زمانے کی فضا کا اثر بھی تھا۔ اس زمانے کی فضا میں روحانیت ر
ہوئی تھی۔ خواجہ قمرالدین بٹ مجھے ساتھ لے کر نیو تھیٹرز کے سٹوڈیوز میں پہنچ گئے۔ گ
کے چوکیدار سے لے کر سٹوڈیو کے ملازموں تک ہر کوئی خواجہ صاحب سے علیک سلیک
تھا۔ آفس میں جا کر معلوم ہوا کہ سہگل اور جمنا دیوی دونوں کسی فلم کی شوٹنگ کرنے آ
کے علاقے میں گئے ہوئے ہیں۔

میں سہگل اور جمنا دیوی سے ملنے کی حسرت دل میں لیے سراج بلڈنگ آ گ
اب میں ان لوگوں کی کلکتے واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ہفتے کے بعد میں نے ایک
اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ نیو تھیٹرز کا فلمی یونٹ شوٹنگ کے بعد آسام سے واپس آ گیا
لیکن جمنا دیوی کچھ روز ابھی دارجلنگ میں قیام کریں گی اور ماسٹر سہگل اپنی فلمی مصروفیا
کے سلسلے میں بمبئی چلے گئے ہیں' جہاں وہ اپنے کالج روڈ والے فلیٹ میں قیام کریں گے

اب میرا دل کلکتے میں نہیں لگتا تھا۔ میں نے اپنے دوست جان سے کہا کہ
سہگل سے ملنے بمبئی جا رہا ہوں۔ اس نے کہا تمہاری مرضی۔ چنانچہ میں ایک روز ٹرین
سوار ہو کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ بمبئی میں میرا ایک ٹھکانہ ہو سکتا تھا۔ یہ ٹھکانہ لاہور والے اش
صاحب کا آٹو سٹور تھا جو لیمنگٹن روڈ پر واقع تھا اور جہاں میں پہلی مرتبہ گھر سے بھاگ ک
تھا تو اشرف صاحب نے مجھ سے ذکر کیے بغیر میرے گھر خط لکھ دیا تھا کہ آپ کا
میرے پاس ٹھہرا ہوا ہے' کسی کو بھیج کر اسے لے جائیں۔

اشرف صاحب نے بڑا نیکی کا کام کیا تھا مگر میرا ایڈونچر برباد ہو گیا تھا۔
والے بمبئی پہنچ کر مجھے واپس امرتسر لے گئے تھے اور مجھے بڑی مار پڑی تھی۔ اس وجہ
میں اشرف صاحب کے آٹو سٹور کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ چپکے
میرے گھر خط لکھ دیں گے اور میں پکڑا جاؤں گا۔ دوسری کونسی جگہ ہو سکتی ہے جہاں م

سکتا تھا۔ ٹرین بمبئی کی طرف اڑی جا رہی تھی اور میں یہی سوچ رہا تھا۔

بمبئی میں کسی کے ہاں ٹھہرنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ بمبئی کی فضا بڑی کاروباری قسم کی
تھی۔ متوسط طبقے کا ہر آدمی اپنی جگہ مجبور تھا اور دو تین دن سے زیادہ کسی کو اپنے ہاں مہمان
رکھنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اس شہر کا کوئی اپنا کلچرل بیک گراؤنڈ نہیں تھا' جس طرح کہ
کلکتے کے پیچھے پورا بنگلہ لٹریچر اور بنگلہ میوزک اور بنگلہ کلچر تھا۔

بمبئی اب تو صوبہ مہاراشٹر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے
اس زمانے میں یعنی 39-1938ء میں یہ شہر گجرات کاٹھیاواڑ کے زیر اثر تھا اور گجراتی عام
بولی جاتی تھی۔ ویسے بمبئی میں اینگلو انڈین' پارسی' مراٹھے' بنگالی' پنجابی اور مدراسی لوگ بھی
مدتوں سے آباد چلے آ رہے تھے۔

اس شہر کو کاسموپولیٹن شہر کہا جاتا تھا کہ وہاں کا کلچر ملا جلا تھا۔ بمبئی کے بارے میں
مشہور ہے کہ یہ شہر جدوجہد کا شہر ہے اور یہاں کاروباری اور خاص طور پر فلمی دنیا میں بطور
اداکار' رائٹر یا پروڈیوسر کے کوئی مقام حاصل کرنے کیلئے بڑی سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے'
فاقے کرنے پڑتے ہیں' فٹ پاتھ پر سونا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ آدمی
اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

اس کا تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔ جب پہلی بار میں فلم کا ہیرو بننے گھر سے بھاگ کر
بمبئی گیا تھا تو اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی ہو گی مجھے وہاں فاقے بھی آ گئے تھے اور
میں کئی راتیں فٹ پاتھ پر بھی سویا تھا۔ پہلے تو مجھے فٹ پاتھ پر سوتے ہوئے سخت شرم آئی
تھی مگر جب مجھ پر نیند نے شدید غلبہ کیا اور میں نے سینکڑوں لوگوں کو صاف ستھرے چمکیلے
فٹ پاتھ پر قطاروں کی صورت میں سوتے ہوئے دیکھا تو میں بھی ایک جگہ فٹ پاتھ پر
لیٹ گیا۔ اس رات ثابت ہو گیا کہ اصل چیز نیند ہوتی ہے بستر نہیں۔ اگر نیند آ رہی ہو تو
آدمی فٹ پاتھ پر بھی سو جاتا ہے۔ اگر نیندیں اڑ چکی ہوں تو پھر ریشمی بچھونے پر بھی آدمی
ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔

میرے بچپن کے استاد مجھے کہا کرتے تھے کہ خدا سے نیند مانگنا' بستر کبھی نہ

مانگنا۔ میں نے اپنے پہلے سفر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ بمبئی بڑا طوطا چشم شہر ہے۔ مجھے یاد ہے
ایک بار ایک بہت بارونق سڑک پر چلتے چلتے مجھے پیاس لگی تو میں نے سوڈا واٹر کی ایک
دکان پر جا کر پانی مانگا تو دکاندار نے کہا۔

''پانی نہیں ہے......سوڈا واٹر ہے۔''

مجھے اس کا یہ جملہ پورے کا پورا ابھی تک یاد ہے۔ اب یہ پتہ نہیں وہاں کیا حال
ہے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں بمبئی میں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا
تھا۔ اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تو آپ کو کھانے پینے کو بھی مل جائے گا اور سونے کیلئے جگہ
بھی مل جائے گی۔ اگر آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو آپ کو فاقہ کرنا ہو گا اور فٹ پاتھ پر
سونا ہو گا۔

بعض شہر غریب پرور ہوتے ہیں جیسا کہ ہمارا لاہور شہر ہے۔ اس زمانے میں
بمبئی غریب پرور نہیں تھا' بڑا سنگدل شہر تھا۔ لیمنگٹن روڈ والے آٹو سٹور کے مالک اشرف
صاحب ایسے نیک دل لوگ بمبئی میں خال خال ہی ملتے تھے۔

کلکتے سے چلی ہوئی ریل گاڑی بمبئی شہر کے مضافات میں داخل ہو چکی تھی اور
مجھے ابھی تک پتہ نہیں تھا کہ میں بمبئی میں کہاں ٹھہروں گا۔ میرے پاس اتنے پیسے ضرور تھے
کہ میں کسی معمولی سے ہوٹل میں تین چار دن تک ٹھہر سکتا تھا' لیکن میں یہ پیسے بمبئی کے
دوسرے اخراجات کیلئے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔

ٹرین بمبئی کے بڑے سٹیشن بوری بندر پہنچ گئی اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ آخر
یہی سوچا کہ ایک دن کسی تھرڈ کلاس ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہوں اس کے بعد کوئی جگہ تلاش
کروں گا۔ سٹیشن پر ہوٹلوں کے ایجنٹ موجود ہوتے تھے۔ دوسرے مسافروں کی طرح
انہوں نے مجھے بھی اکیلا جان کر گھیر لیا۔ کوئی اپنے ہوٹل کی تعریف میں کچھ کہتا کوئی کچھ۔
آخر ایک آدمی نے کہا۔

''رام بھروسے ہوٹل میں چلو بابو۔ پانچ روپے کرایہ ہو گا۔ کھانا پینا بھی بڑا سستا
مل جائے گا۔''

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

رام بھروسے ہوٹل کا نام اور اس کی بوسیدہ عمارت کی شکل صورت آج بھی میری
آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ ہوٹل بمبئی کے کسی گنجان آبادی والے علاقے میں واقع تھا۔
مجھے اس علاقے کا نام نہ اس وقت معلوم تھا نہ آج معلوم ہے۔ دو منزلہ پرانی عمارت تھی
جس کے نیچے ایک دکان نما دفتر میں ایک لالہ جی رجسٹر لیے بیٹھے تھے۔ انہوں نے رجسٹر
میں میرا نام اور میرے شہر کا نام اور ایڈریس لکھا' پانچ روپے لیے اور چابی دے کر کہا۔

''اوپر چڑھ کر بائیں ہاتھ باجو والا مالا ہے۔''

مالا یعنی کمرہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں ایک چارپائی پر گندا سا بستر بچھا
ہوا تھا' کیا کرتا؟ مجبوراً اور بڑی مشکل سے میں نے وہاں ایک رات بسر کی اور دوسرے دن
رام بھروسے کو چھوڑ کر میں اللہ کے بھروسے پر ایک سڑک کے فٹ پاتھ پر چل پڑا۔ ذہن
صرف یہی سوچ رہا تھا کہ کہاں ٹھہرا جا سکتا ہے۔

اچانک مجھے چرنی روڈ والے نیک دل حکیم صاحب کا خیال آ گیا۔ بمبئی میں
یک دفعہ فاقے کی حالت میں' میں حکیم صاحب کا بورڈ دیکھ کر ان کے پاس چلا گیا تھا۔
ہوں نے مجھے کھانا بھی کھلایا تھا اور مجھے اپنے لوہے کے چٹو میں دوائیاں کوٹنے پر ملازم
ی رکھ لیا تھا۔ میں دکان کے باہر بیٹھ کر دوائیاں کوٹتا' ڈیوڑھی والے نلکے کے پاس بیٹھ کر
الی بوتلیں دھو کر صاف کرتا۔ اگر دوائیوں کی بوتلوں اور ڈبوں پر کوئی لیبل اکھڑ گیا تو اسے
وند سے چپکاتا۔ حکیم صاحب نے دکان کے ایک چھوٹے کمرے کو اخبار بینی کی لائبریری
ں تبدیل کر رکھا تھا۔ یہاں ایک بڑا سا بیضوی میز بچھا تھا جس کے گرد لوہے کی پرانی
رسیاں لگی تھیں۔ محلے کے بڑے بوڑھے شام کو یہاں آ کر اخبار وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔
ھی کبھی حکیم صاحب کے مطب میں مسلم لیگ کا کوئی لیڈر بھی آ تھا۔ حکیم صاحب انہیں
ص طور پر لائبریری دکھاتے تھے۔ اس روز لائبریری کی صفائی بھی مجھے کرنی پڑتی تھی۔
ت کو میں اسی لائبریری کے بیضوی میز پر سوتا تھا۔ مجھے ایک میلا سا سرہانہ اور چادر ملی
ئی تھی جسے میں صبح لپیٹ کر لائبریری کی ایک الماری میں رکھ دیتا تھا۔ حکیم صاحب کا

آرڈر تھا کہ چھت کا پنکھا رات کے دس بجے کے بعد بند کر دیا جائے گا۔ بمبئی میں بارشیں
بہت ہوتی ہیں اور وہاں کا موسم گرمیوں میں اکثر خوشگوار رہتا ہے اور رات کو چونکہ سمندر کی
طرف سے ہوا چلتی ہے اس لیے رات کو پنکھے کی اتنی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ مگر میرے
لیے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ بعض اخبار کے کیڑے دیر تک بیٹھے اخبار پڑھتے رہتے
تھے اور میں چادر اور سرہانہ لیے ایک طرف بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہتا تھا کہ کب وہ اخبار
مطالعہ ختم کر کے لائبریری کی جان چھوڑیں اور میں میز پر چادر بچھا کر سوؤں۔ میں دن بھر
کی مشقت کا بڑا تھکا ہوا ہوتا تھا اور کونے میں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تھا۔ میں دس بجے کی
بجائے رات کے نو بجے ہی چھت کا پنکھا بند کر دیتا مگر دو ایک بوڑھے بند پنکھے میں بھی بیٹھے
اخبار پڑھتے رہتے تھے۔ میں دل میں دعائیں مانگتا کہ بجلی چلی جائے مگر یہ انگریزوں
زمانہ تھا اور بجلی سال میں کبھی کبھار ہی جاتی تھی۔

◆ ..... ◆ ..... ◆

گیارہ سوا گیارہ بجے اخبار کے بوڑھے کیڑے عینک اتار کر اسے جیب میں
لئے۔ بڑی آہستہ آہستہ اخبار کو تہہ کر کے ایک طرف رکھتے۔ اخبار کو رکھتے رکھتے بھی وہ
ں کی کوئی نہ کوئی خبر پڑھتے جاتے تھے۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلتے تو میں خدا کا شکر ادا
رتا۔ جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگاتا اور میز پر سرہانہ رکھ کر بس میز پر گر پڑتا۔
ے کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہتا کہ میں کب سویا تھا۔

میں کوئی تین چار سال کے بعد حکیم صاحب کے پاس جا رہا تھا۔

دل میں بار بار ایک ہی دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے حکیم صاحب زندہ
ں۔ حکیم صاحب زندہ تھے مگر پہلے سے زیادہ بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ عینک ناک پر
ہ اور نیچے ڈھلک آئی تھی اور آنکھوں کے حلقے زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ اب خیال آتا
کہ حکیم صاحب شاید کوئی کشتہ وغیرہ کھاتے تھے۔ آدمی بڑے شریف اور خوش اخلاق
۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ انہیں میرا نام بھی یاد تھا۔ کہنے لگے۔

''ارے! تم تو بڑے ہو گئے ہو۔ اب بھی گھر سے بھاگ کر بمبئی ایکٹر بننے آئے
''

میں نے کہا۔ ''نہیں حکیم صاحب میں نے ایکٹر بننے کا خیال دل سے نکال دیا
۔ اب میں ایک ایکٹر سے ملنے آیا ہوں۔''

''اچھا؟'' حکیم صاحب نے عینک کے اوپر سے میری طرف گھور کر پوچھا۔
ن ہے وہ ایکٹر؟ ضرور موتی لعل ہو گا۔''

اس زمانے میں موتی لعل بطور ہیرو سب سے مشہور تھا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں
میں ماسٹر سہگل سے ملنے آیا ہوں۔'' حکیم صاحب بولے۔ ''ارے وہ تو کلکتے میں ر
ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں کلکتے سے ہی آیا ہوں۔ میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ ما
سہگل آج کل بمبئی میں ہے۔''

حکیم صاحب نے افسوس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ارے کیوں اپنی عمر برباد کر رہا ہے۔ یہ وقت تمہارے پڑھنے کا ہے' کوئی
سیکھنے کا ہے۔ کب تک یہ آوارہ گردیاں کرتا رہے گا۔''

میں نے کہا۔ ''حکیم صاحب میں نویں جماعت میں پڑھ رہا ہوں۔ سکول
چھٹیاں تھیں اس لیے سیر کرنے نکل پڑا۔''

حکیم صاحب کہنے لگے۔ ''اب میرے پاس تمہارے لیے کوئی کام وغیرہ تو
ہے۔ دو ملازم پہلے سے کام کر رہے ہیں۔ چار چھ دن رہنا ہے تو یہاں رہ لینا۔ گھر
پکتا ہے ہمارے ساتھ تم بھی کھا لیا کرنا اور ہاں بھائی' رات کو لائبریری میں ہی سونا پڑ
گا۔''

میرے ساتھ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ آج کل تو بڑے سوٹ کیس کو بھی ا
کیس کہتے ہیں۔ ان دنوں اٹیچی کیس بریف کیس سائز کا ہوا کرتا تھا جس میں دنیا جہان
چیزیں آ جاتی تھیں۔ میرے اٹیچی کیس میں دو جوڑے کپڑوں کے' ٹوتھ پیسٹ برش' شیو
کا سامان' میری تھوڑی تھوڑی داڑھی بڑھ آتی جس کی میں فوراً شیو کر دیا کرتا تھا۔ اس
علاوہ ایک چھوٹی قینچی' ایک چھوٹی نوٹ بک اور پنسل' کنگھی اور ایک رات کو لگانے کی
ہوتی تھی جس کا نام مرکولائیزڈ ویکس تھا۔

اس کی رات کی رانی ایسی خوشبو مجھے بڑی پسند تھی۔ ویسے تو میں کوئی کریم ا
وغیرہ نہیں لگاتا تھا مگر یہ کریم تھوڑی سی رات کو ضرور لگا کر سوتا تھا۔ ساری رات مجھے اس
دھیمی دھیمی خوشبو آتی رہتی تھی۔ بس اس سے زیادہ مجھے اس کریم سے اور کچھ نہیں چاہیے

میں نے اپنا اٹیچی کیس لائبریری والے کمرے کی الماری میں رکھ دیا۔ لائبریری
کی حالت پہلے سے زیادہ خستہ ہو گئی تھی۔ لوہے کی کرسیوں کا روغن اتر چکا تھا اور درمیان
میں جو میز بچھی تھی اس کا رنگ بھی اڑنے لگا تھا۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا۔

''میں سہگل صاحب کے فلیٹ پر ان سے ملنے جا رہا ہوں وہ کالج روڈ پر رہتے
ہیں۔''

حکیم صاحب بولے۔ ''ارے تمہیں معلوم ہے کہ کالج روڈ کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اب یاد نہیں رہا۔''

کہنے لگے۔ ''ٹکٹ لے کر لوکل ٹرین پر بیٹھ جانا اور موتنگا سٹیشن پر اتر جانا۔ کالج
روڈ موتنگا سٹیشن کی دوسری طرف ہے۔''

جب میں جانے لگا تو بولے۔

''ارے کیوں در بدری کرنے جا رہے ہو۔ یہ ایکٹر لوگ ہر ایرے غیرے کو نہیں
ملا کرتے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں حکیم صاحب! میں نے سہگل کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ
بڑا سادہ طبیعت والا ہے اور ہر کسی سے مل لیتا ہے۔''

حکیم صاحب عینک کو ناک کے اوپر چڑھاتے ہوئے بولے۔

''اچھا بھائی چلا جا' جا کر دیکھ لے۔ پیسے ہیں ٹکٹ کے تمہارے پاس؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں ہیں۔''

میں چرنی روڈ سے سیدھا ایک لوکل سٹیشن پر آیا۔ ٹکٹ لیا اور موتنگا کی طرف
جانے والی لوکل ٹرین میں بیٹھ گیا۔ لوکل ٹرین بھی بمبئی کی ایک خاص چیز ہوا کرتی تھی۔ یہ
بمبئی شہر کے شاید آس پاس دائرے کی شکل میں چلتی تھی اور بمبئی کے بڑے بڑے اور مشہور
علاقوں سے گزر کر جہاں سے چلتی تھی وہیں واپس آ جاتی تھی۔ لوکل ٹرین کا ایک اپنا کلچر
تھا۔ اس ٹرین میں تھوڑی دور کی سواریاں بیٹھتی تھیں۔ یہ ساری سواریاں شہر کی ہوتی تھیں۔
ان میں کوئی شہر سے باہر کسی دوسرے شہر کو جانے والا مسافر نہیں ہوتا تھا۔ اس میں سیٹیں بھی

تھیں اور آمنے سامنے کے دروازوں کے درمیان لوہے کے راڈ بھی لگے ہوتے تھے جنہیں
پکڑ کر مسافر کھڑے رہتے تھے اور اگلے سٹیشن پر اتر جاتے تھے۔ اس ٹرین میں سامان رکھنے
اور سونے والی کوئی برتھ نہیں ہوتی تھی۔ اس ٹرین میں تقریباً دوسرے تیسرے سٹیشن پر سے
کوئی نہ کوئی دوائیاں، گولیاں اور سردرد کی دوائی بیچنے والا سوار ہو جاتا تھا اور جب تک اگلا
سٹیشن آتا تھا وہ اپنی تقریر بھی کر لیتا تھا اور اپنی دوائی کی تمام خاصیتیں بتا کر دس بارہ آنے
کی گولیاں فروخت کر کے دوسرے تیسرے سٹیشن پر اتر بھی جاتا تھا۔ لوکل ٹرین میں
موسمیاں بیچنے والی مرہٹہ عورتیں بھی آتی تھیں۔ وہ کسی نہ کسی سٹیشن سے ٹرین میں سوار ہو کر
موسمیوں کا ٹوکرا نیچے رکھ کر موسمیاں بیچتی تھیں۔ یہ موسمیاں بمبئی کی خاص سوغات تھی۔ ان
کا رنگ سبز اور چھلکا پتلا ہوتا تھا اور بڑی مشکل سے چھیلی جاتی تھیں۔

یہ بالکل کیسری رنگ کی ہوتی تھیں اور بڑی میٹھی ہوتی تھیں۔ موسمیاں بیچنے والی
مرہٹہ عورتوں کی آنکھیں بھی کیسری رنگ کی ہوتی تھیں اور ماتھے پر اسی رنگ کا تلک لگا ہوا
تھا۔ ناک میں بڑی سی نتھ ہوتی اور تیل میں بسے ہوئے بالوں کو کھینچ کر پیچھے جوڑا کیا ہوا
تھا۔ جوڑے میں چاہے باسی ہی سہی لیکن سفید پھولوں کا ایک آدھ ہار ضرور سجا ہوتا تھا۔ یہ
سانولے اور گہرے سانولے رنگ کی بڑی محنت کش بلکہ جفاکش عورتیں تھیں۔ مجھے ان
مرہٹہ عورتوں کی ساڑھیوں کے رنگ اور جوڑے میں لگے ہوئے سفید پھول بڑے اچھے
لگتے تھے۔ مہاراشٹر کی خواتین کی ساڑھی دور سے پہچانی جاتی ہے۔ ان ساڑیوں کے رنگ
بڑے شوخ ہوتے ہیں۔ سبز، سرخ ساڑھی پر نیلے یا سیاہ رنگ کا بارڈر ہوتا تھا۔ موسمیاں بیچنے
والی مرہٹہ عورتوں کا ساڑھی باندھنے کا بھی اپنا خاص انداز ہوتا تھا۔ ساڑی باندھنے کے
اپنے اس انداز کی وجہ سے مرہٹہ عورت ہزاروں عورتوں میں صاف پہچانی جاتی ہے۔ بعض
موسمیاں بیچنے والی عورتیں سگریٹ بھی پیتی تھیں اور ان کے ٹوکرے میں پیلے ہاتھی یا چار
مینار سگریٹ کی ڈبی بھی نظر آ جاتی تھی۔ پان تو اکثر عورتیں کھاتی تھیں۔ بمبئی میں اس
زمانے میں چار مینار اور پیلا ہاتھی عوام کے مقبول سگریٹ تھے۔ چار مینار کی ڈبی پر حیدر آباد
دکن کی عمارت چار مینار کی تصویر ہوتی تھی۔ پیلا ہاتھی ذرا لائٹ سگریٹ تھا مگر چار مینار بڑا

سگریٹ تھا۔ بالکل ہمارے کے۔ٹو کی طرح۔ فلم ڈائریکٹر اے آر کاردار کے دیرینہ
تھی ایم صادق صاحب کو بمبئی میں، میں نے یہی سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔ بڑے کم گو اور
ئستہ مزاج فلم ڈائریکٹر تھے۔ ایک بار میں گھر سے بھاگ کر ایکٹر بننے کے شوق میں ان
ے پاس بھی چلا گیا تھا۔ بمبئی میں ان کا فلیٹ میرین ڈرائیو کی ایک بلڈنگ میں دوسری یا
ری منزل پر تھا۔ مجھے انہوں نے کھانا کھلایا تھا اور دوسرے دن اپنے ساتھ کاردار سٹوڈیو
بھی لے گئے تھے۔ پھر انہوں نے سمجھایا کہ مجھے ابھی تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے اس
ے بعد بمبئی آ کر ان سے ملوں۔ مجھے یاد ہے انہوں نے مجھے انیس روپے بمبئی سے امرتسر
ی ریل کے کرایہ وغیرہ کیلئے دیئے تھے اور میں بوری بندر کے سٹیشن سے رات کے نو بجے
ین میں بیٹھ کر امرتسر چلا آیا تھا۔

بمبئی کی لوکل ٹرینیں بجلی کے ذریعے چلتی تھیں اور ان کی سپیڈ بڑی تیز ہوتی تھی۔
پارٹمنٹ کی ہر کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ اگر ٹرین میں
گ لگ جائے تو لوگ باہر نہ نکل سکیں۔

لوکل ٹرین ریلوے لائن کے آس پاس گرے پڑے ردی کاغذوں کو اڑاتی بڑی
یز رفتاری سے شہر کی اونچی اونچی بلڈنگوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ جب ٹرین ماٹونگا
ے سٹیشن پر رکی تو میں اتر گیا۔ سیڑھیوں والا ریلوے پل عبور کر کے سٹیشن کی دوسری طرف آ
یا۔ ایک آدمی سے کالج روڈ کا پوچھا۔ اس نے کوٹھیوں کے درمیان سے گزرتی چھوٹی
ڑک کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس سڑک پر چل پڑا۔ کچھ دور جا کر ایک آدمی سے پوچھا
کہ یہاں سہگل صاحب کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کر
ے کہا۔

”اس بلڈنگ میں سہگل ٹھہرتا ہے۔ جا کر معلوم کر لو۔“

میں نے جا کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ سہگل شوٹنگ کیلئے کشمیر گیا ہوا ہے، ایک مہینے
عد آئے گا۔ میں نے کہا ایسے سہگل کی ایسی کی تیسی۔ ایرانی ہوٹل میں چل کے چائے کا
ایک کوپ پیو، چار مینار کا سگریٹ لگاؤ، پکڑو پنجاب میل اور چلو امرتسر کے کمپنی باغ میں۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ کالج روڈ سے نکل کر ایک ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کا ایک کپ پیا
چار مینار کا سگریٹ لگایا اور لوکل ٹرین پکڑ کر سیدھا حکیم صاحب کے ہاں آ گیا۔ حکیم
صاحب نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

"ارے مل آئے سہگل سے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں مل آیا ہوں۔ اب واپس پنجاب جا رہا ہوں۔"

حکیم صاحب مجھے حسب عادت نصیحتیں کرنے لگے کہ اب گھر جا کر ساری توجہ
سکول کی پڑھائی کی طرف دینا' یہ عمر پھر ہاتھ نہ آئے گی' وغیرہ وغیرہ۔ میں نے پیسوں کا
جائزہ لیا۔ میرے پاس پندرہ سولہ روپے ہی باقی رہ گئے تھے۔ بمبئی سے امرتسر تک ٹرین
میں تھرڈ کلاس کا کرایہ کچھ بڑھ گیا تھا۔ پہلے چودہ پندرہ روپے ہوتا تھا اب انیس روپے کے
قریب ہو گیا تھا۔ میرے پاس کرایہ پورا نہیں تھا۔ حکیم صاحب سے کچھ روپے لینا میری
طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ پہلے سوچا کہ بغیر ٹکٹ کے گاڑی میں بیٹھ جاتا ہوں' جو ہو گا دیکھا
جائے گا۔ پھر خیال آیا کہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ بمبئی سے امرتسر تک بڑا
لمبا سفر ہے۔ راستے میں کسی بھی جگہ ٹی ٹی ٹکٹ چیک کرنے آ سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ
بمبئی سے دلی کا ٹکٹ لے لیتا ہوں اور دلی سے امرتسر بغیر ٹکٹ کے بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ
میں نے ایسا ہی کیا۔ بوری بندر سے رات کے نو بجے پنجاب میل چلتی تھی۔ یہ بمبئی سے
پشاور تک جاتی تھی۔ میں نے دلی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور پنجاب میل میں بیٹھ گیا۔
ٹرین چلی تو شکر ادا کیا کہ بمبئی کی فلمی دنیا کی بک بک سے نکل رہا ہوں۔ دلی پہنچ کر اس
بات کا بڑا افسوس ہوا کہ راستے میں کسی جگہ کوئی ٹی ٹی ٹکٹ چیک کرنے نہیں آیا تھا۔ اب
آگے مجھے بغیر ٹکٹ سفر کرنا تھا۔ اس کام میں میں بڑا ماہر تھا اور مجھے یہ پسند بھی بہت تھا۔
ایک پلیٹ فارم پر لاہور جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ پنجاب میل کے چھوٹنے کے آدھ
گھنٹہ بعد چلتی تھی۔ میں ٹکٹ کے بغیر ہی اس کے تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ
گیا۔ میں دروازے کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ اگر ٹی ٹی کسی سٹیشن پر اندر آ جائے تو
میں آنکھ بچا کر دروازے میں سے باہر نکل جاؤں۔ ٹرین ساری رات چلتی رہی۔ صبح ایک

سٹیشن پر رکی تو ایک ٹی ٹی ہمارے ڈبے میں آ گیا۔ پتہ نہیں کون سا سٹیشن تھا جیسے ہی ٹی ٹی
میرے قریب سے ہو کر آگے گیا میں بڑے آرام سے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ پلیٹ فارم پر
اترتے ہی ٹرین کے آخری ڈبے کی طرف چل پڑا۔ میں تیز تیز چل رہا تھا کیونکہ وہ کوئی
چھوٹا سٹیشن تھا اور ٹرین نے وہاں زیادہ دیر نہیں رکنا تھا۔ تھرڈ کلاس کا ایک ڈبہ نظر آیا میں
اس میں سوار ہو گیا اور دروازے میں کھڑا رہا اور پیچھے دیکھتا رہا کہ ٹی ٹی نیچے اترتا ہے یا
نہیں۔ پنجاب شروع ہو گیا تھا۔ مجھے بڑا حوصلہ تھا کہ اب امرتسر زیادہ دور نہیں ہے۔ ٹرین
تھوڑی دیر کے بعد ہی چل پڑی۔ میں پھر بھی دروازے میں کھڑا پیچھے دیکھتا رہا۔ جب
ٹرین سٹیشن سے نکل گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب ٹی ٹی نیچے نہیں اترے گا۔ بعض ٹی ٹی یہ
کرتے تھے کہ چلتی ٹرین میں ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں سوار ہو جاتے تھے میں دیر
تک دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ ٹرین نے بھی کافی سپیڈ پکڑ لی تھی۔ میں دروازے کے
قریب ہی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اگلا سٹیشن لدھیانہ تھا۔ یہ کافی بڑا جنکشن تھا۔ جیسے ہی ٹرین
رکی میں جلدی سے پلیٹ فارم پر اتر گیا اور چل پھر کر ٹرین کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دور
سے اس ڈبے میں نگاہ ڈالی جس ڈبے میں ٹی ٹی داخل ہوا تھا۔ وہ دروازے میں سے باہر
نکل کر چل رہا تھا۔ میں ایک طرف ہو گیا کیونکہ کبھی کبھی ٹی ٹی پلیٹ فارم پر چلتے پھرتے بھی
کسی مسافر کا ٹکٹ چیک کر لیا کرتے تھے۔ مگر ایسا وہ اس وقت کرتے تھے جب انہیں کسی
مسافر پر شک ہو جائے کہ یہ بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہے۔

ٹی ٹی پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف چلا گیا' شاید اسے لدھیانے سے کسی دوسری
ٹرین میں واپس دلی جانا تھا۔ لدھیانہ بڑا سٹیشن تھا۔ یہاں ٹرین زیادہ دیر رکتی تھی۔ میں
کتابوں کے سٹال پر رسالے وغیرہ دیکھنے لگا لیکن ٹی ٹی کو میں نے اپنی نگاہ میں رکھا ہوا تھا۔
وہ پلیٹ فارم کے گیٹ پر دوسرے ٹکٹ چیکر سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔
جب تک انجن نے سیٹی نہیں بجائی میں کتابوں' رسالوں کے سٹال پر ہی کھڑا رہا۔ تھرڈ کلاس
کے ایک ڈبے کو میں نے تاڑ لیا تھا' جب ٹرین کھسکنے لگی تو میں بھی ڈبے کے ساتھ ساتھ چلنے
لگا۔ لیکن ٹی ٹی کو برابر دیکھ رہا تھا کہ کہیں یہ دوڑ کر ٹرین میں سوار تو نہیں ہوتا مگر وہ گیٹ پر

ہی بیٹھا رہا۔ میں دوڑ کر ڈبے میں چڑھ گیا۔

ٹرین کا اگلا سٹاپ جالندھر تھا۔ جالندھر سے بھی ایک ٹی ٹی ٹرین میں سوار ہو
گیا۔ وہ انٹر کلاس کے ڈبے میں چڑھا تھا' میرا ڈبہ تھرڈ کلاس کا تھا اور اس سے دو تین ڈبے
چھوڑ کر تھا۔ امرتسر تک میری ٹی ٹی سے ہی آنکھ مچولی ہوتی رہی اور ٹی ٹی کے ساتھ ساتھ
میں بھی ڈبے بدلتا رہا۔ جب مانانوالہ سٹیشن گزر گیا اور ٹرین امرتسر کی حدود میں داخل ہو گئی
میں دلیر ہو گیا۔ اب میں کسی بھی جگہ ٹرین سے اتر کر پیدل بھی امرتسر جا سکتا تھا۔ ٹرین بے
رفتاری سے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ پھر چالیس کھوہ بھی گزر گئے اور ایک طرف امر
کے باغات اور دوسری طرف شریف پورے کی آبادی شروع ہو گئی۔ یہاں کبھی کبھی آؤٹر
سگنل ڈاؤن نہیں ہوتا تھا تو ٹرین شریف پورے کے پاس رک جاتی تھی۔ میں دعا مانگ رہا
کہ ٹرین آؤٹر سگنل پر رک جائے اور میں یہیں اتر کر شریف پورے کے ریلوے پھاٹک
سے ہوتا ہوا اپنے محلے میں چلا جاؤں۔

◆......◆......◆

ہمارا محلہ شریف پورے کے قریب ہی تھا مگر ٹرین وہاں نہ رکی۔ سیدھی پلیٹ
فارم پر جا کر رکی۔ میں ڈبے کے دوسرے دروازے میں سے ریلوے لائن پر اتر گیا اور
دوسری جانب کی ریلوے لائن پار کر کے دوسرے پلیٹ فارم پر چڑھ کر ریلوے یارڈ کی
طرف جلدی جلدی چلنے لگا۔ ریلوے یارڈ میں سے گزر کر سامنے والی دیوار کے ساتھ ساتھ
رنگو برج کی طرف رخ کر لیا میرے ساتھ جو چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا یہ اس بات کی علامت
تھی کہ میں ٹرین سے اترا ہوں۔ یہ اٹیچی کیس مجھے پھنسا سکتا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ میں
لٹکانے کی بجائے اپنے سینے کے ساتھ لگایا اور یوں بے نیازی سے سیٹی بجاتا چلنے لگا جیسے
میں یونہی سیر کرتا ہوا ریلوے یارڈ میں آ گیا ہوں۔

میری قسمت اچھی تھی کہ کسی نے مجھ سے ٹکٹ کا نہ پوچھا۔ وہاں ایک جگہ آنے
جانے والے لوگوں نے یا ریلوے کے آدمیوں نے دیوار توڑ کر ایک شگاف ڈال رکھا تھا۔
میں جلدی سے اس میں سے گزر کر باہر گول باغ والی سڑک پر نکل آیا۔ سڑک پر آنے کے
بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا اور گول باغ میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے سکندر گیٹ میں
سے گزر کر ہال بازار میں آ گیا۔ اب میں اپنے محلے میں تھا۔ گھر پہنچ کر والد صاحب نے
جو طبیعت صاف کی اس کا میں کافی حد تک عادی ہو چکا تھا۔ والدہ اور بہنیں تو مجھے دیکھ کر
بہت خوش ہوئیں مگر والد صاحب نے کوچوان والا سانٹا پکڑ لیا اور میرے گرد ہو گئے۔

میں سر بازوؤں میں دے کر بڑے آرام سے مار کھاتا رہا۔ میرا جسم والد صاحب
کے سانٹے پر لگ گیا تھا مجھ پر اس کا زیادہ اثر نہیں ہوتا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میں

کمپنی باغ میں پھر رہا تھا مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ ایک ایک درخت مجھ سے میرا حال پوچھ رہا تھا۔ کسی ایک درخت نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ ان آوارہ گردیوں میں اپنی قیمتی عمر کیوں برباد کر رہے ہو۔ یہ عمر تمہارے پڑھنے کی ہے' تعلیم حاصل کرنے کی ہے۔ سب درخت جانتے تھے کہ جو تعلیم حاصل کرنے کیلئے قدرت نے مجھے پیدا کیا ہے وہ تعلیم مجھے درخت دے رہے تھے۔ کمپنی باغ میرا سکول تھا' میرا کالج تھا' میری یونیورسٹی تھی۔ ہر درخت میرے لیے استاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ کمپنی باغ کے یہ درخت' ان درختوں کے درمیان سکون سے بہنے والی نہر اور نہر کے کنارے ناشپاتی اور آلوچے کے باغ مجھے وہ تعلیم دے رہے تھے جو مجھے دنیا کی کوئی یونیورسٹی' کوئی کالج' کوئی سکول' کوئی استاد نہیں دے سکتا تھا۔ یہ میرے وہ استاد تھے' وہ پروفیسر تھے جن سے لیکچر سنائی نہیں دیتے تھے' جن کی کتابیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ لیکن ہر کتاب کا مفہوم ہر درخت کی شاخ پر' ہر شاخ کے پھول پھول پر روشن نظر آتا تھا۔ یہ سنا سنایا علم نہیں تھا۔ یہ وہ علم تھا جو سامنے نظر آتا تھا۔ علم کی باتیں سننا کچھ اور ہوتا ہے' علم کو اپنے سامنے دیکھنا کچھ اور بات ہے۔ کمپنی باغ میری یونیورسٹی تھی اور میں اس اوپن یونیورسٹی کے باغ میں بیٹھا ایک ایک پتے سے' ایک ایک پھول سے' پھولوں پر چمکتے شبنم کے موتیوں سے علم حاصل کر رہا تھا۔ جس طالب علم کو ایسی یونیورسٹی مل جائے اسے کسی دوسرے سکول میں داخل ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

لیکن گھر والوں نے پکڑ کر مجھے ایک بار پھر سکول میں داخل کرا دیا۔ میرا ایک سال پھر ضائع ہو گیا تھا۔ اس دفعہ مجھے امرتسر کے گورنمنٹ ہائی سکول میں نویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔ یہ سکول ہمارے محلے میں ہی تھا اور ماسٹر عبدالقیوم صاحب اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ دراز قد' بھرا بھرا جسم' گورا چٹا رنگ' سیاہ داڑھی ان کے چہرے پر بڑی سجتی تھی۔ شلوار قمیض اور اچکن کے ساتھ سر پر نسواری جناح کیپ پہنتے تھے۔ چہرے پر ہر وقت ایک معصوم سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ بڑی دلکش اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا خوبصورت چہرہ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے' وہ مجھے بڑے اچھے لگتے تھے

اسی وجہ سے مجھے ان کا نام بھی یاد رہ گیا ہے۔ وہ کلاس میں داخل ہوتے تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی اور لڑکے مؤدب ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ بھی لڑکوں سے بڑی شفقت کا سلوک کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی بید وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کبھی انہیں کسی لڑکے کو سزا دیتے نہیں دیکھا تھا۔ سوچتا ہوں یہ لوگ' یہ چہرے کہاں چلے گئے' کہاں غائب ہو گئے۔ کیا وہ پھر کبھی نظر نہیں آئیں گے؟ کیا اس حیات ارضی سے آگے' خیابان عقبیٰ میں' خیال و خواب کا کوئی بہار آفریں چمن ایسا ہے کہ جہاں ہم ان مسکراتے ہوئے نورانی چہروں کو پھر سے دیکھ سکیں گے؟

کچھ سمجھ میں آتا ہے بہت کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

گھر میں اگر میرا کوئی ہمدم و ہم خیال تھا تو وہ میرا چھوٹا بھائی مقصود تھا۔ جس کا میں آرٹسٹ بھائی کے نام سے اکثر ذکر کیا کرتا ہوں۔ مگر وہ خود والد صاحب کے زیر عتاب رہتا تھا کیونکہ اسے مصوری کا شوق تھا اور بقول والد صاحب کے وہ کوئی مفید ہنر سیکھنے یا کوئی نوکری کرنے کی بجائے رنگ روغن سے بیکار قسم کی تصویریں اور سینریاں بناتا رہتا تھا۔ مگر وہ اکھڑ اور غصیلے مزاج کا تھا اور گالیاں بہت دیتا تھا۔ گھر میں سوائے میرے وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ ڈرائنگ بورڈ پر بڑا سا گتہ یا ڈرائنگ کاغذ لگا کر وہ پنسل سے کوئی سکیچ یا واٹر کلر میں کوئی سینری بناتا رہتا تھا۔ میری طرح اور خاندان کے دوسرے کشمیری لڑکوں کی طرح آرٹسٹ بھائی کو کھانے پینے اور عمدہ کپڑے پہننے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ گھر میں جس وقت جو کچھ ملتا کھا لیتا تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ میں یاد کرتا ہوں تو مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے اسے گھر میں یا باہر کبھی کھانا کھاتے دیکھا ہو۔ مجھے بالکل نہیں پتہ کہ وہ چمچ سے چاول کھاتا تھا یا ہاتھ سے کھاتا تھا۔ لباس میں وہ صرف سفید کرتہ اور تنگ موری کا پاجامہ پہنتا تھا۔ ہمیشہ باٹا کے سفید فلیٹ شو یعنی ربڑ کے بوٹ پہنتا تھا۔ ان بوٹوں کو وہ ہر تیسرے چوتھے روز سفید رنگ گھول کر لگاتا۔ صحن میں گملوں کے پاس اس کے پالش کیے ہوئے گیلے بوٹ اور تسمے دھوپ میں پڑے ہوتے تھے۔ بے حد تیز اور نازک مزاج تھا۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔ تصویر بنا رہا ہوتا تو سوائے

میرے گھر کا کوئی آدمی اس کے پیچھے کھڑے ہو کر اسے تصویر بناتے دیکھتا تھا تو انہیں کا
وغیرہ تو دے نہیں سکتا تھا۔ بس برش تھالی میں رکھ کر اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ گھر والوں کے علاوہ
اگر کوئی اسے تصویر بناتے دیکھتا تو اُسے کوئی لحاظ کئے بغیر جھڑک دیتا تھا کہ تم کیا دیکھ رہے
ہو اوئے؟

آرٹسٹ بھائی کو مجھ سے بڑی محبت تھی قیام پاکستان کے بعد جب وہ کوہ مری
کے سیروز سینما میں بطور پینٹر ملازم ہو گیا تھا تو مجھے بڑے پیارے بھرے خط لکھا کرتا تھا۔
میرے افسانوں کی منظر نگاری کا وہ عاشق تھا۔ خود بھی اندر سے بڑا رومانیت پسند تھا' بے حد
صفائی پسند تھا۔ کوہ مری کی برفباری میں بھی وہ ہر روز نہاتا' گھر میں دھلی ہوئی یا دھوبی کی
دھلی ہوئی سفید قمیض' سفید کرتا اور بے داغ سفید ربڑ کے شوز پہن کر کام شروع کرتا تھا۔ اس
نے ساری زندگی پتلون نہیں پہنی تھی اور دھوتی نہیں باندھی تھی۔ مجھ سے زیادہ گورا' چٹا
چکلا اور دراز قد تھا۔ ڈھولک بڑی اچھی بجا لیتا تھا۔ گانا اسے نہیں آتا تھا لیکن گھر میں کبھی
کسی تقریب کے موقع پر ڈھولکی گھٹنے کے نیچے دبا کر بجاتے ہوئے گردن ایک طرف ڈالے
کسی کسی وقت کوئی پنجابی لوک گیت یا سہگل کا کوئی گانا گانے لگتا تھا۔ اس کا ماتھا بڑا روشن
اور فراخ تھا۔ سگریٹ ہمیشہ کیپسٹن کے پیتا تھا۔ میں لڑکپن میں بڑا اچھا گایا کرتا تھا اور
آرٹسٹ بھائی میرے ساتھ بڑی اچھی اور گھمک دار ڈھولک بجاتا۔ میرے ساتھ وہ کبھی کبھی
مذاق کی بات پر کھل کر ہنس بھی لیتا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ اکھڑ مزاج ہونے کے باوجود
وہ بڑا شرمیلا تھا۔ خاندان میں بھی وہ کسی لڑکی سے کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ تنہائی پسند تھا
سوائے میرے محلے میں اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی۔ ہم دونوں اکٹھے کبھی کبھی صبح کی سیر
کرنے کمپنی باغ یا چالیس کنوؤں پر جایا کرتے تھے۔ سیر سے واپسی پر ایک آدھ پھول
ضرور اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور پھول والا ہاتھ جہانگیر بادشاہ کی طرح اس کے منہ کے
قریب ہوتا تھا اور بڑے نپے تلے قدموں سے میرے ساتھ چل رہا ہوتا تھا۔ مصوری اس
نے محض اپنے شوق کی وجہ سے سیکھی تھی اور یہ عطیہ اسے قدرت کی طرف سے ملا تھا۔ لیکن
کچھ عرصہ وہ ہال بازار میں ایک دکان پر جس کا نام سلور سٹوڈیو تھا پینٹنگ سیکھنے پر ملازم بھی

ہو گیا تھا۔ بعد میں اس نے امرتسر کے مشہور پینٹر اور خطاط سردار پینٹر کی باقاعدہ شاگردی
اختیار کر لی تھی۔ سردار پینٹر نے پاکستان بن جانے کے بعد میو ہسپتال کے چوک میں اپنی
پینٹری کی دکان کھول لی تھی۔ مقصود یعنی آرٹسٹ بھائی وہاں بھی اس کے پاس جایا کرتا تھا۔
سردار پینٹر نے اپنی دکان کے باہر بورڈ پر لکھوا رکھا تھا۔

"بال سے باریک اور ہاتھی سے موٹا لکھنے والے امرتسر کے مشہور سردار پینٹر کی
یہی دکان ہے۔"

سردار پینٹر انگریزی اور اردو کی بڑی اعلیٰ اور معیاری لیٹرنگ کرتا تھا۔ امرتسر میں
وہ جس زمانے میں پرل ٹاکیز کا ہیڈ پینٹر تھا' آرٹسٹ بھائی اس زمانے میں بھی اس کا
شاگرد تھا۔ آرٹسٹ بھائی کے کوہ مری سے میرے نام لکھے ہوئے خط آج بھی میرے پاس
محفوظ ہیں۔ بڑے رومانٹک اور ادبی خطوط ہیں۔ میری طرح وہ بھی قدرت کے مناظر'
جنگلوں' بارشوں' گالزوردی کے سیب کے درخت اور میکسم گورکی کی آپ بیتی کا عاشق تھا۔
اپنے خطوں میں اس نے بڑے رومانوی انداز میں جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلوں اور
بارشوں کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ وہ سوائے کوئٹہ کے اور کبھی کسی شہر نہیں گیا تھا۔ عجیب بات ہے
کہ ہماری آپس میں محبت بھی بہت تھی اور ہماری لڑائیاں بھی بہت ہوتی تھیں۔ ان لڑائیوں
میں ہم ایک دوسرے کو گالی وغیرہ نہیں دیتے تھے۔ لڑتے وقت بالکل کوئی بات نہیں کرتے
تھے۔ بس ایک دوسرے کو پہاڑی بکروں کی طرح ٹکریں مارتے رہتے تھے اور لہولہان ہو
جاتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ بمشکل ایک ڈیڑھ سال لاہور میں ہمارے ساتھ رہا۔
پھر وہ کوہ مری جا کر سیروز سینما میں بطور ہیڈ پینٹر ملازم ہو گیا اور پھر کوہ مری کا ہی ہو کر رہ
گیا۔ بیس پچیس برس تک کوہ مری میں رہا۔ سردیوں میں وہ راولپنڈی والے سیروز سینما میں
آ جاتا اور گرمیاں شروع ہوتے ہی کوہ مری چلا جاتا۔ اس نے سوائے میرے سب سے ناطہ
توڑ لیا تھا۔ گھر والوں میں سے کوئی اس سے ملنے جاتا بھی تو نہیں ملتا تھا۔ موت سے ایک دو
برس پہلے اس نے مجھ سے بھی رشتہ توڑ لیا تھا۔ کوہ مری اور راولپنڈی میں بھی وہ کسی سے نہیں

ملتا تھا۔ سینما کے گیٹ کیپر حنیف خان کے سوائے اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ گھر والوں ک
اگر اسے کوئی خاص پیغام پہنچانا ہوتا تھا تو حنیف خان کے ذریعے پہنچایا جاتا تھا۔ وہ کسی
ٹیلی فون بھی نہیں سنتا تھا۔ حنیف خان سنتا تھا اور بتا دیتا تھا کہ ''استاد جی' کوہ نور ٹیکسٹائل
کے ڈیزائن پرسوں بھجوانے ہیں۔''

ان تھک محنتی تھا۔ جمبو جہاز سائز کے سینما کے بورڈوں پر مچان پر چڑھ کر سا
سارا دن اور کبھی کبھار رات رات بھر رنگ بھرتا رہتا تھا' ہاتھ بڑا صاف تھا۔ اس کے بو
مری اور راولپنڈی میں بڑے مشہور ہوتے تھے۔ شادی اس نے نہیں کی تھی۔ کسی لڑکی
کبھی عشق بھی نہیں کیا تھا۔ دن کے وقت کوہ مری کی مال روڈ پر کبھی نہیں نکلتا تھا۔ رات
بارہ بجے کے بعد جب کوہ مری کی سڑکیں سنسان ہو جاتی تھیں تو لوگ بتاتے ہیں کہ مقد
صاحب کو اکثر مال روڈ پر یا گرجا گھر والی سڑک پر سگریٹ سلگائے ٹہلتے دیکھا گیا۔

عجب مانوس اجنبی تھا

میں جب بھی بمبئی' کلکتہ' رنگون یا کولمبو کی آوارہ گردیوں سے واپس امرتسر آ
مجھے لے کر کمپنی باغ میں آ جاتا ہم کسی گراؤنڈ میں بیٹھ جاتے اور وہ مجھ سے جنوب مشر
بارشوں' جنگلوں اور بارشوں میں بھیگتے خاموش ریلوے سٹیشنوں اور سمندروں کی باتیں
کرتا مگر اس نے خود ان علاقوں کی آوارہ گردی کرنے کے شوق کا کبھی اظہار نہیں کیا
مجھ میں تو کئی عیب ہیں' خود غرضی بھی کرتا ہوں' جھوٹ بھی بول لیتا ہوں مگر مقصود میں
بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ کسی سے ڈرتا بھی نہیں تھا۔ بات منہ پر
تھا۔ اپنے کام کا ماہر تھا۔ بے حد قناعت پسند تھا۔ روپے پیسے سے اسے کبھی کوئی دلچسپی
رہی تھی۔ جو کوئی ضرورت مند آ کر جتنے پیسے مانگتا اس کو جیب سے نکال کر دے دیتا
بٹوہ اس نے کبھی نہیں رکھا تھا۔ نوٹ کاغذوں کی طرح اس کی جیب میں ٹھونسے
ہوتے تھے۔ ایک نوٹ باہر نکالتا تھا تو دو نیچے گر پڑتے تھے۔ تین وقت کا کھانا ہوٹل
کھاتا تھا' جو تھوڑا بہت لین دین کا حساب ہوتا تھا وہ تنخواہ ملنے پر اس کا شاگرد حنیف
خود ہی کرتا تھا۔ مقصود اسے چھ سات سو روپے دے دیتا تھا اور وہ ہوٹل اور سگریٹ د

حساب چکا کر باقی پیسے آرٹسٹ بھائی کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔ اپنی ساری زندگی اس نے
سفید پاجامے کرتے اور سفید باٹا کے بوٹ میں گزار دی۔ سردیوں میں ایک گرم کوٹ پہن
لیا کرتا تھا۔ کوہ مری کی سردیوں میں بھی کبھی کوئی کمبل یا دھسہ وغیرہ نہیں لیتا تھا۔ ساری
زندگی اس نے سر پر ٹوپی پہنی نہ گلوبند وغیرہ لپیٹا۔ برفباری میں بھی اس کا سر بغیر کسی گرم
ٹوپی وغیرہ کے ہوتا تھا۔ یہ بھائی میرا پہلا اور شاید آخری دوست تھا۔ اس کا ذکر شروع ہو
جائے تو جی چاہتا ہے کہ اس کا ذکر کرتا رہوں۔ آپ اگر بور ہو گئے ہوں تو مجھے معاف کر
دیجیے گا۔

گورنمنٹ ہائی سکول میں نویں جماعت پاس کی اور دسویں جماعت میں پہنچ
گیا۔ بڑی مشکل سے دسویں جماعت میں دو تین مہینے پڑھا تھا کہ پاؤں کے چکر نے پھر
نا شروع کر دیا۔ اس دفعہ بنگال کے ترناری اور رجنی گندھا کے سفید پھولوں اور دھرم تلہ
اور لوئر چیت پور روڈ کی پان سگریٹ کی دکانوں سے طلوع ہوتی زردے اور قوام کی
خوشبوؤں اور وکٹوریہ میموریل کی جھیل میں کھلے ہوئے بارش میں بھیگتے کنول کے پھولوں اور
اداس آنکھوں والی دیوداسیوں نے ایک بار پھر مجھے اپنی طرف کھینچا۔ میں نے ایک روز
بڑی بہن سے کچھ پیسے لیے اور ہاوڑہ میل میں بیٹھ کر کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا۔

کلکتے کے ریل کے سفر کا اپنا ایک کلچر تھا' اس کی اپنی خوشبوئیں تھیں۔ یہ کلچر اور
خوشبوئیں پنجاب سے نکلتے ہی اور سہارن پور کے آتے ہی شروع ہو جاتی تھیں۔ سہارن
پور کے گنے بڑے مشہور تھے۔ بہت بڑا شہر تھا' ٹرین سٹیشن بھی بہت بڑا تھا۔ کئی پلیٹ فارم
تھے۔ سہارن پور کے بعض علماء ہر سال امرتسر میں ہمارے محلے کی مسجد جان محمد میں معراج
شریف کے مبارک موقع پر وعظ کرنے آیا کرتے تھے۔ ان کا وعظ سننے کیلئے شہر کے کونے
کونے سے لوگ مسجد میں آیا کرتے اور مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ سہارن
پور کے بعد مراد آباد کا شہر آتا ہے جہاں کے پیتل کے برتن اور جگر مراد آبادی بہت مشہور
تھے۔ اس کے بعد اہم شہر بریلی آتا ہے۔ بریلی کے بعد شاہجہان پور اور پھر ہندوستان میں
اسلامی تہذیب و ثقافت کا علمبردار لکھنو شہر آتا ہے۔ لکھنو کا سٹیشن بہت ہی خوبصورت اور

صاف ستھرا تھا۔لکھنو کے بعد بنارس کا شہر آتا ہے۔ یہاں دریائے گنگا کے کنارے
عالمگیری مسجد کے مینار دور سے نظر آجاتے تھے۔اس کے بعد ٹرین صوبہ بہار میں داخل ہو
جاتی تھی اور بہار کا مشہور تاریخی شہر گیا آتا ہے جہاں ایک درخت کے نیچے ایک روایت
کے مطابق مہاتما گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔اس زمانے میں یہ ایک چھوٹا سٹیشن تھا اور
اس کے صرف دو پلیٹ فارم تھے' ایک ٹرین کی ایک طرف دوسرا دوسری طرف۔ اس کے
بعد اسنبول کے سٹیشن سے بنگال شروع ہو جاتا تھا۔اس طویل سفر کے دوران زبان بدل
جاتی تھی' لباس اور کلچر تبدیل ہو جاتا تھا۔

اس بار میں کسی فلم کمپنی کی ایکٹریس یا ایکٹر سے ملنے نہیں جا رہا تھا۔صرف
بنگال کی بارشیں' شام کے وقت دریائے ہگلی کی طرف سے آتی ٹھنڈی ہوا اور موتیے کے
سفید گجرے اور اداس آنکھوں والی ویوداسیوں کا طلسم مجھے کھینچ کر لئے جا رہا تھا۔

◆......◆......◆

شاید یہ بنگال کا جادو تھا جو مجھے بار بار کھینچ کر کلکتے کی طرف لے جاتا تھا۔ میں
[ٹو]نے پر یقین نہیں رکھتا اور یہ میرے ایمان کے خلاف بھی ہے لیکن میں نے جوگیوں
[س]ادھوؤں کو حیرت انگیز شعبدہ بازیاں کرتے ضرور دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ دو ایک ایسی
[رو]حوں کو بھی دیکھا تھا جو اپنے گناہوں کی پاداش میں مادی دنیا میں ہی بھٹکتی پھر رہی
[تھی]ں۔ان میں ایسی بدروحیں بھی تھیں جن پر ان کی مادی فطرت ابھی تک غالب تھی اور جو
[انس]انوں کو تنگ کرتی تھیں اور ایسی بدروحیں بھی تھیں جو انسانوں کی مدد کرتی تھیں اور یوں
[دنی]ا میں کیے گئے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ان میں سے ایک
[ترش]نا کی بدروح بھی تھی جو مجھے اپنے مرے ہوئے دادا کے ساتھ گنج باسودہ جاتے ہوئے
[ٹری]ن میں ملی تھی۔ اس نے دو ایک بار مشکل وقت میں میری مدد کی تھی۔ ترشنا کی بدروح
[عورت] کی شکل میں میرے سامنے آتی تھی۔ وہ خوبصورت' سنجیدہ اور خاموش چہرے والی ہندو
[دوشیز]ہ کی بدروح تھی۔شروع میں جب مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ بھٹکی ہوئی بدروح ہے تو مجھے
[ا]س سے محبت بھی ہو گئی تھی۔لیکن جب اس کی اصلیت ظاہر ہوئی تو محبت کی بجائے مجھے
[ا]س سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔اس نے آخری بار مجھ سے جدا ہوتے وقت کہا تھا۔

''اگر تمہیں کبھی میری مدد کی ضرورت محسوس ہو تو تمہارے شہر امرتسر میں ایک
[کالی ما]تا مندر ہے۔اس کے پیچھے ایک شمشان گھاٹ ہے جہاں ہندو اپنے مردے جلاتے
[ہیں۔]تم رات کے وقت جب ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہو گھاٹ کے چبوترے پر جا کر
[بیٹھ ج]انا۔میرا تصور کر کے مجھے تین بار آہستہ سے آواز دینا' میں تمہارے پاس آ جاؤں

گی۔"

لیکن جب میں امرتسر میں تھا تو خواہش کے باوجود میں نے کبھی شمشان گھاٹ کا رخ نہیں کیا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ خوامخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔

جیسا کہ پہلے آپ کو بتا چکا ہوں۔ اس بار میں کلکتے کی فلم ایکٹریس یا فلم ایک... سے ملنے نہیں جا رہا تھا بلکہ بنگال کی موسلا دھار بارشیں، وہاں کے جنگل، باغ اور موسیقی... گجروں اور اداس آنکھوں والی دیوداسیوں کی کشش مجھے لیے جا رہی تھی۔ آپ اسی کشش کو بنگال کا جادو بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں انڈیا کے تمام صوبوں میں پھرا ہوں۔ ہر صوبے کے لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ عجیب بات ہے کہ صوبہ بنگال کے مرد شروع ہی سے انقلا... اور دہشت گرد مشہور ہیں جبکہ ان کی عورتیں عام طور پر کم گو، خدمت گزار، فرمانبردار اور ہر... کی مصیبت اور زیادتی کو برداشت کرنے والی ہوتی ہیں۔ ان کی چال میں بھی بھارت کے دوسرے صوبوں خاص طور پر تامل ناڈو کی عورتوں کی طرح تیزی اور طراری نہیں ہوتی۔ بنگال کی عورتیں بڑی اچھی بہنیں، بڑی اچھی بیویاں اور بڑی اچھی مائیں مشہور ہیں۔ اس لیے وہاں ساس بہو کے جھگڑے بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ دردمندی، ایثار اور اندر ہی اندر غم کھاتے رہنے کا جذبہ ان کے میوزک میں بھی ہے۔ ان کی موسیقی کی بنیاد ہی درد بھرے سروں پر ہے۔ یہاں تک کہ ان کے خوشیوں کے گیتوں میں بھی درد و سوز کی ایک لہر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بنگال کے مزاج کی یہی آب و ہوا تھی جس نے لڑکپن ہی میں مجھ پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور میں بار بار کلکتے کی طرف دوڑتا تھا۔

اس بار بھی میں کلکتے پہنچ کر سیدھا اپنے امرتسری دوست جان محمد کے فلیٹ پر آ گیا۔ وہ کلکتے میں ہی تھا، یہ میں نے امرتسر میں معلوم کر لیا تھا۔ مجھے دیکھ کر جان نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہ کیا۔ وہ میری آوارہ گردیوں سے بخوبی آشنا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم بڑے صحیح وقت پر آئے ہو۔ میٹرو سینما میں اسی ہفتے نیو تھیٹرز کی فلم "مکتی" لگی ہے۔ آج اس کا چھ بجے والا شو دیکھیں گے۔"

"مکتی" فلم ابھی امرتسر میں نہیں لگی تھی مگر اس کے گانے میں نے سنے تھے۔ مسلم

...تسر کے زمانے میں ہمارے محلے کے ہال بازار میں گراموفون ریکارڈوں کی ایک دکان ...ا کرتی تھی۔ لمبی دکان تھی۔ دکان میں ٹھنڈا ٹھنڈا اندھیرا سا رہتا تھا۔ میں ایم اے او ہائی ...ول جاتے ہوئے اس دکان کے قریب سے گزرتا تو اندر گراموفون پر کوئی نہ کوئی ریکارڈ لگا ...تا۔ کبھی سہگل کی، کبھی کملا جھریا کی، کبھی کالو قوال، کبھی بھائی چھیلا پٹیالے والا اور کبھی ...ن دیوی، اوما دیوی اور پنکج ملک کے گانے کی آواز آتی۔ اگر کوئی میری پسند کا گانا ہوتا تو ...ں دکان کے باہر رک جاتا اور سارا گانا سن کر سکول جاتا۔ جس زمانے میں، میں تیسری یا ...ی مرتبہ کلکتے بھاگ کر گیا، اس دکان میں مکتی فلم کے ریکارڈ اکثر بجا کرتے تھے۔ اس فلم کا ... گانا مجھے بہت پسند تھا۔ یہ گانا پنکج ملک نے گایا تھا۔ اور بڑا ہو کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ گانا ...نوی صاحب نے لکھا تھا۔ اس گانے کا مکھڑا تھا۔

کون دیس ہے جانا بابو
کون دیس ہے جانا
کھڑے کھڑے کیا سوچ رہا ہے
ہوا کہاں سے آنا بابو
کون دیس ہے جانا

بعد میں جب میری ایڈونچرس آوارہ گردیوں کا زمانہ شروع ہوا تو ایک بار میں ...ئی کے بال کینٹر گارڈن میں اپنے دوست ظہور الحسن ڈار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہمارے ...ھ ہی اسی زمانے کا ایک مشہور فلمی شاعر بھی بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ تھوڑی ...ی دیر بعد وہ بالوں کو اس طرح سر ہلا کر جھٹک دیتا تھا جیسے اس کے بالوں میں ...ٹیاں چڑھ گئی ہوں۔ اس فلمی شاعر نے بتایا کہ آرزو لکھنوی صاحب کلکتہ چھوڑ کر بمبئی آ ...یں اور آج کل سہراب مودی صاحب کی فلم "پتھروں کا سوداگر" کے گانے لکھ رہے ...۔ عمر میں ان دونوں سے چھوٹا تھا۔ آرزو صاحب کا نام سن کر میں ان سے ملنے کو ...تاب ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"ابھی ان سے چل کر ملتے ہیں۔"

چنانچہ ہم اسی وقت آرزو لکھنوی صاحب سے ملنے چل پڑے تھے اور ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ کافی بوڑھے ہو رہے تھے۔ بمبئی کے گنجان محلے کے ایک درمیانے درجے کے فلیٹ میں فرش پر تیلیوں کی چٹائی بچھائے بیٹھے تھے۔ اردگرد بید کی آرام کرسیاں بھی لگی تھیں۔ آرزو صاحب ایک پیالی چمچ سے دلیا کھا رہے تھے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے آرزو صاحب سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا۔ سچویشن پر گیت لکھنے کی بات چلی تو انہوں نے ایک خاص سچویشن کا ذکر کرتے ہوئے ''ڈاکٹر'' فلم کیلئے لکھا ہوا اپنا ایک گیت بھی سنایا۔ جو فلم کی ہیروئن اپنے کم سن بھائی کے ساتھ مل کر ایک باغ میں گاتی ہے۔

یہ تتلی یہ تتلی یہ رنگیلی تتلی

آرزو صاحب نے اسی گیت میں تتلی کو اڑتے ہوئے پھول سے تشبیہہ دی تھی جو مجھے اس زمانے میں بھی بے حد اچھی لگی تھی۔

جب آرزو صاحب کلکتے میں تھے تو میں کوشش کے باوجود ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکا تھا اور اس دفعہ تو میں کلکتے صرف اس کی بارشوں اور موتیے کے گجروں والی دیوداسیوں سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے آیا تھا۔ اب میں واپس وہاں آتا ہوں جہاں سے میں نے یہ بات شروع کی تھی۔ جان کی زبانی جب مجھے معلوم ہوا کہ ''مکتی'' فلم میٹرو یا شاید پیراڈائز سینما میں چل رہی ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے جان سے کہا۔

''بس یہ ٹھیک ہے۔ ہم آج ہی چھ بجے والا شو دیکھیں گے۔''

''مکتی'' فلم ڈائریکٹر پی سی بروا نے بنائی تھی۔ اس میں جمنا ہیروئن تھی اور پنکج ملک کے علاوہ پی سی بروا یعنی فلم کے ڈائریکٹر نے بھی بطور ہیرو کام کیا تھا۔ چھوٹے قد کا دبلا پتلا فلسفی ٹائپ کا آدمی تھا۔ آنکھوں میں ہر وقت کسی نظر نہ آنے والے کو دیکھنے کی تلاش کا تجسس رہتا تھا۔ پوری کہانی مجھے یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ فلم کا ہیرو اپنی محبت میں ناکام ہونے کے بعد شہر چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل جاتا ہے' وہاں ایک ہاتھی سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ عجیب خواب کے ماحول ایسی فلم تھی۔ ویسے تو بچپن کا گزرا ہوا سارا زمانہ

ہی خواب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ فلم ایسی تھی جیسے میں نے خواب کے اندر کوئی خواب دیکھا ہو۔ ہم دونوں دوست خوب تیار ہو کر فلم دیکھنے چل دیے۔ سینما ہاؤس کے باہر کافی رش تھا۔ ٹکٹوں کی بلیک بھی ہو رہی تھی۔ سینما ہاؤس کا ایک گیٹ کیپر جان محمد کا واقف تھا۔ اس نے ہمیں سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ لا کر دے دیے اور ہم سینما ہاؤس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہال کی بتیاں روشن تھیں۔ ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں اور سگریٹ بیچنے والے کرسیوں کی قطاروں کے درمیان پھنس کر چلتے ہوئے سودا بیچ رہے تھے۔ ہال میں ائر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈی خوشبو کے ساتھ ساتھ سگریٹ' بیڑی اور پان کے قواموں کی مختلف خوشبوئیں اس زمانے کے سینما ہالوں کا لازمی جزو تھے۔ جس طرح ہسپتالوں میں ڈیٹول اور مختلف دوائیوں کی خوشبوئیں پھیلی رہتی ہیں اور یہی خوشبوئیں ہسپتال کی پہچان ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس زمانے کے سینما ہالوں میں پان' سگریٹ کی خوشبوئیں پھیلی ہوتی تھیں اور یہی سینما ہالوں کی پہچان ہوتی تھیں۔ یہی سینما ہالوں کی اصل روح ہوتی تھی۔ جب سے سینما ہالوں میں سگریٹ پینا منع کر دیا گیا ہے۔ سینما گھروں کی اصل روح غائب ہو گئی ہے۔ عصر حاضر نے انسان کے ساتھ بھی کیا ہے کہ اس کی روح غائب کر دی ہے۔ یہاں مجھے علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ میں یہ شعر آپ کو بھی سنانا چاہتا ہوں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

عشق کی تیغ جگردار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

رات کے نو بج رہے تھے جب ہم فلم دیکھ کر واپس آئے۔ سراج بلڈنگ کے نیچے ایک ہوٹل تھا۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا۔ جان پوچھنے لگا۔

''اس دفعہ تم کس مار پر کلکتے آئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''صرف بنگال کی سیر کرنے۔''

جان ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

''یار لگتا ہے تم پر بھی بنگال کے جادو کا اثر ہو گیا ہے۔''

جان رات کو تخت پوش پر سوتا تھا۔ تخت پوش کے قریب ہی ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا ایک صوفہ پڑا تھا میں اس پر سوتا تھا۔ سونے سے پہلے جان نے تخت پوش کا طبلہ بجاتے ہوئے مجھے مکتی فلم کا گانا کون دیس ہے جانا بابو سنایا۔ اس کے بعد ہم سو گئے۔ مجھے بچپن ہی سے صبح صبح اٹھنے کی عادت تھی' میں بلاناغہ کمپنی باغ اور کبھی چالیس کھوہ سیر کرنے جاتا تھا۔ میں صبح صبح اٹھ کر نیچے لوئر چت پور روڈ پر آ گیا۔ ابھی ٹرامیں چلنی شروع نہیں ہوئی تھیں' سڑک خالی پڑی تھی۔ سیر کرتے کرتے میں زکریا سٹریٹ سے بھی آگے نکل آیا۔ یہ بنگالی ہندوؤں کا محلہ تھا۔ رہائشی فلیٹوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی اور کسی کسی فلیٹ میں سے کسی مرد یا عورت کے ہارمونیم پر بنگلہ بھجن گانے کی آواز آ رہی تھی۔

میں مون لائٹ سینما کے عقب سے ہوتے ہوئے ایک بازار میں آ گیا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لکشمی دیوی کے دو مندر تھے۔ ان مندروں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ جھنڈیاں لگی تھیں۔ مندروں کے دروازے پر گیندے اور موتیے کے پھولوں کے ہار لٹک رہے تھے۔ عورتیں مرد لکشمی دیوی کی پوجا کیلئے مندروں کی طرف جا رہی تھیں۔ میں ڈلہوزی سکوائر کا چکر لگا کر سراج بلڈنگ میں واپس آ گیا۔ جان سلولائڈ کی شیٹوں کو ترتیب سے ایک طرف لگا رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر بولا۔

''چلو ناشتہ کر آتے ہیں۔''

ہم نیچے ہوٹل میں آ کر ناشتہ کرنے لگے۔ جان نے بتایا کہ کلکتے میں یہ لکشمی پوجا کے دن ہیں اور اسی تہوار پر لکشمی دیوی کے مندروں میں چار دن تک بڑی رونق رہتی ہے۔ ہندو دیو مالا میں لکشمی دیوی دولت کی دیوی ہے۔ ہندو لوگ دولت کے حصول کیلئے لکشمی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ جان کہنے لگا۔

''کولوٹولہ سٹریٹ میں لکشمی دیوی کا بڑا مندر ہے۔''

''اسی مندر میں کسی زمانے میں اچھوت لڑکیوں کو لکشمی دیوی کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ بعض کٹر توہم پرست ہندو سیٹھ کاروبار میں لاکھوں کے منافع کی خاطر منت مانتے

تھے کہ اگر مجھے کاروبار میں منافع ہوا تو میں ایک اچھوت کنیا کو دیوی جی کی بھینٹ چڑھاؤں گا۔ کئی لوگ کسی یتیم اور لاوارث اچھوت لڑکی کو اپنے جال میں پھنسا کر مندر لے آتے تھے اور بڑے پجاری کی مدد سے اسے لکشمی دیوی پر قربان کرنے کے بعد دیوی کی مورتی کے آگے ہاتھ باندھ کر پکارتے کہ اے دیوی! میں نے تیری خوشی کی خاطر ایک اچھوت لڑکی تمہارے بھینٹ چڑھا دی ہے اب مجھے دولت سے مالا مال کر دے۔ بعد میں انگریزوں نے اس رسم کو سختی سے کچل دیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اب بھی چوری چھپے کبھی کبھی دیوی کی خوشنودی کی خاطر یا دولت حاصل کرنے کیلئے کسی بے سہارا اچھوت لڑکی کو دیوی کے بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو بڑا ظلم ہے کیا اچھوت اس کے خلاف احتجاج نہیں کرتے؟''

جان بولا۔ ''کرتے ہیں لیکن معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور پھر بھینٹ چڑھانے والے پیچھے ذرا بھی ثبوت نہیں چھوڑتے۔ یہی کہا جاتا ہے کہ لڑکی گم ہو گئی ہے یا اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے' اچھوتوں کو کون پوچھتا ہے۔ ایک دو اخباروں میں خبر چھپتی ہے اور پھر لوگ بھول جاتے ہیں۔''

میں نے جان سے پوچھا۔

''کیا تم نے کبھی کسی لڑکی کو دیوی کے بھینٹ چڑھتے دیکھا ہے؟''

جان نے کہا۔ ''کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ کولوٹولا والے اس مہا لکشمی کے مندر میں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اور جس رات کسی لڑکی کو قربان کیا جاتا ہے اس رات تو کسی غیر مسلم کو بھی دیوی کے پوجا پاٹھ والے کمرے کی جانب جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ مندر کے پجاری سے مل کر کیا جاتا ہے۔'' میں نے جان سے کہا۔

''جان! میں یہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ تمہاری مندروں سے بڑی کاروباری دوستی ہے۔ تم ایک مدت سے یہاں رہ رہے ہو۔ اس کا کھوج لگاؤ کہ کب کوئی لڑکی دیوی کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔''

جان کہنے لگا۔ ''ارے برسوں بعد کبھی ایسا ہوتا ہے۔ میرا ایک ہندو دوست ہے

وہ اپنے محلے کے مندر کے پجاری کا بیٹا ہے‘ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ یہ لکشمی پوجا کے تہوار کے دن ہیں‘ ہوسکتا ہے‘ کہیں کسی اچھوت لڑکی کو دیوی کے بھینٹ چڑھایا جا رہا ہو۔ اس قسم کی وارداتیں اس تہوار کے موقع پر ہی ہوتی ہیں۔ میں آج ہی پجاری کے بیٹے سے بات کرتا ہوں۔“

میں نے محض اپنے تجسس کی تسکین کی خاطر جان سے کہہ دیا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کی وارداتیں انتہائی خفیہ طریقے سے ہوتی ہیں اور جہاں ہوتی ہیں وہاں کسی باہر کے آدمی کا جانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ جان رات کو اپنے ہندو دوست سے ملنے چلا گیا۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔ ”کمال ہے یار! تم نے ایسے موقع پر بات کی ہے کہ اس تہوار پر واقعی ایک لڑکی کی قربانی دی جارہی ہے۔“

میں نے جلدی سے پوچھا۔

”کہاں؟ کب؟ کیا یہ قربانی بڑے مندر میں دی جارہی ہے؟“

جان بولا۔ ”بتاتا ہوں‘ بتاتا ہوں۔ ذرا مجھے ایک بیڑی تو سلگا لینے دو۔“

❖ ...... ❖ ...... ❖

جان نے جیب سے پان بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی سلگائی اور بولا۔ ”یہ جو میرا بنگالی لڑکا دوست ہے اس کا نام ست پال ہے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا یہ اپنے محلے کے لکشمی مندر کے پجاری کا بیٹا ہے اور باپ کے ساتھ مندر میں ہی پوجا پاٹھ کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ جب میں نے اس سے بات کی تو وہ حیران سا ہو کر میرا منہ دیکھنے لگا۔ بولا‘ تمہیں یہ خیال کیسے آ گیا؟ میں نے اسے تمہارا بتایا کہ میرا دوست امرتسر سے آیا ہے اس کو قربانی کی رسم دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ ست پال بولا۔ ”عجیب بات ہے کہ تم نے ایسے وقت میں بھینٹ پوجا کا پوچھا ہے جب واقعی ایک لڑکی کو لکشمی ماتا کی بھینٹ چڑھانے کیلئے جنگل میں پہنچا دیا گیا ہے۔“

میں نے جان سے پوچھا۔ ”اسے جنگل میں کس لیے پہنچایا گیا ہے؟“ تب جان نے بتایا کہ چونکہ اس قسم کی قربانی دینا ملک کے قانون کے خلاف ہے اور انگریز نے اس کی سزا پھانسی رکھی ہے اس لیے جب بھی کوئی دولت مند سیٹھ بھاری رشوت دے کر لکشمی مندر کے کسی پجاری کو اس کام پر راضی کر لیتا ہے تو یہ مذموم رسم بڑے خفیہ طریقے سے ادا کی جاتی ہے۔ جان نے کہا۔

”ست پال نے بتایا ہے کہ اس بار یہ قربانی یہاں سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ایک جنگل میں واقع لکشمی دیوی کے ایک گمنام سے مندر میں دی جائے گی سیٹھ کے آدمیوں نے ایک اچھوت لڑکی کو اغوا کر کے جنگل والے مندر میں پجاری کے پاس پہنچا دیا ہے جس نے اسے مندر کے قریب ہی ایک ٹیلے کے غار میں چھپا دیا ہے۔ چار دن تک

وہاں اس لڑکی کی کڑی نگرانی میں آؤ بھگت ہوگی۔ اسے اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے کھلائے جائیں گے۔ صبح شام اسے اشنان کرایا جائے گا اور پانچویں روز آدھی رات کو اسے لکشمی دیوی کے اس استھان کے آگے زبردستی لٹا کر ذبح کر دیا جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم مجھے اس جنگل والے مندر تک پہنچا سکتے ہو؟"

جان نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا جو موت کے منہ میں جانے کی تیاری کر رہے ہو۔ ست پال نے مجھے کہا ہے کہ اپنے دوست کو ہرگز ہرگز وہاں مت جانے دینا۔ اگر مندر کے آدمیوں میں سے کسی نے اسے دیکھ لیا تو وہ کسی صورت میں بھی تمہارے دوست کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بھلا وہ لوگ یہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ قتل کی اس واردات کا کوئی عینی گواہ بنے۔ اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

مگر میں اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ انسانی قربانی کا یہ خوفناک منظر اگر دیکھ سکا تو ضرور دیکھ کر رہوں گا۔ میں نے جان کو صاف صاف بتا دیا کہ میں جنگل والے مندر میں کسی جگہ چھپ کر انسانی قربانی کا یہ منظر ضرور دیکھوں گا چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

"تم بے شک میرے ساتھ نہ جانا' مجھے یہ بتا دو کہ یہ جنگل کہاں پر ہے اور لکشمی کا مندر اس جنگل میں کس جگہ پر واقع ہے۔"

جان کو یہ سب کچھ مجھے نہیں بتانا چاہیے تھا لیکن اس نے بے وقوفی سے کام لیتے ہوئے مجھے بتا دیا۔ کہنے لگا۔

"کلکتے سے ہزاری باغ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کندرگام کا ایک ریلوے سٹیشن آتا ہے۔ یہ کلکتے سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ کندرگام اتر کر تمہیں شمال کی طرف جانا ہوگا' آگے ایک بڑی ندی آ جائے گی۔ اسی ندی کے پار ایک گھنا جنگل شروع ہوتا ہے جو سندر بن کی ایک شاخ ہے۔ اسی جنگل میں رام ناتھ نام کا ایک تالاب ہے۔

یہ تالاب رام لچھمن کے زمانے کا بتایا جاتا ہے۔ جس لکشمی مندر میں اچھوت لڑکی

کو قربان کیا جا رہا ہے وہ اس تالاب کے ساتھ ہی ہے۔ مگر بہت چوکس اور ہوشیار ہو کر وہاں جانا ہوگا۔ تم سے ذرا سی بھی بھول چوک ہوئی تو زندہ واپس نہ آ سکو گے۔ میں تو تمہیں اب بھی یہی کہوں گا کہ اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں پوری احتیاط سے کام لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ تم نے کہا تھا کہ قربان کی جانے والی اچھوت لڑکی کو اغوا کر کے وہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ لڑکی وہاں کس جگہ پر چھپا کر رکھی گئی ہوگی؟"

جان بولا۔ "یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اس کا کھوج تمہیں وہاں پہنچ کر خود ہی لگانا ہوگا۔"

میں چپ ہو گیا۔ جان نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

"امرتسریوں والی اندھا دھند دلیری کا کام نہ کرو۔ کہیں مارے نہ جانا۔"

میں نے کہا۔ "میں تو اسے ایک ایڈونچر سمجھ کر کر رہا ہوں باقی اللہ مالک ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ ہزاری باغ جانے والی ٹرین کلکتے سے کس وقت روانہ ہوتی ہے۔"

جان بولا۔ "ہزاری باغ کا شہر بنارس جبل پور روٹ پر ہے۔ اس طرف گاڑیاں جاتی ہی رہتی ہیں۔ ویسے ایک گاڑی صبح چھ بج کر پندرہ منٹ پر جاتی ہے۔ یہ گاڑی تمہارے لیے ٹھیک رہے گی تم دن کے وقت ہی کندرگام پہنچ جاؤ گے۔"

گھر سے میں تھوڑے بہت پیسے لے کر اپنی آوارہ گردیوں کے ایڈونچر پر نکلتا تھا کبھی میں یہ پیسے والد صاحب کی صدری کی جیب سے اڑا لیا کرتا تھا اور کبھی اپنی بڑی بہنوں کے آگے مختلف بہانے بنا کر حاصل کر لیتا تھا۔ اس بار بھی میرے پاس پچاس پچپن کے قریب روپے تھے۔ اس زمانے میں یہ رقم کافی ہوتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ صرف بارہ تیرہ روپے تو امرتسر سے کلکتے کا کرایہ ہی تھا۔ میں نے یہ پیسے جان کے پاس رکھوا دیے تھے۔ عجیب بات ہے میں نے کلکتے کی طرف کبھی بغیر ٹکٹ کے ریل میں سفر نہیں کیا تھا۔ میں نے جان سے پندرہ بیس روپے لے کر رکھ لیے اور

دوسرے دن صبح صبح رکشے پر بیٹھ کر کلکتے کے ہاوڑہ سٹیشن کی طرف چل پڑا۔

یہ قیام پاکستان سے چھ سات سال پہلے کا زمانہ تھا۔ برصغیر کی آبادی ابھی اتنی نہیں بڑھی تھی۔ ریلوے سٹیشنوں پر ٹرین کے آنے جانے کے وقت مسافروں کا رش ضرور ہوتا تھا مگر آج کے زمانے والا حال نہیں تھا۔ بڑا نارمل سا رش ہوتا تھا۔ ٹرین کے جانے کے بعد پلیٹ فارم خالی خالی سے ہو جاتے تھے۔ انگریزی حکومت کے قاعدے اصول بڑے سخت تھے۔

ٹرینیں عام طور پر وقت پر چلتی تھیں۔ جس ٹرین میں بیٹھ کر مجھے کندر گام جانا تھا وہ بھی ٹھیک ٹائم پر روانہ ہوئی۔ کوئلے کے انجن والی گاڑیاں چلتی تھیں۔ انجنوں میں سے خوب دھواں اور بھاپ نکلتی تھی۔ کلکتے سے پشاور تک چلنے والی ہاوڑہ ایکسپریس کی رفتار تو بڑی تیز ہوتی تھی۔ جہاں سے شور مچاتی دھواں اڑاتی گزرتی تھی وہاں کی زمین ہل جاتی تھی۔ جس ٹرین پر میں سوار ہوا تھا وہ ہاوڑہ ایکسپریس نہیں تھی اور صرف دلی تک جا رہی تھی۔

میرا سفر ڈیڑھ سو میل کا تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ مون سون کا سیزن گزر چکا تھا۔ پھر بھی ہفتہ دس دن میں ایک بار موسلا دھار بارشیں ہو جاتی تھیں۔ جن اصحاب نے بنگال کا سفر کیا ہے انہیں معلوم ہو گا کہ بنگال کا سارا علاقہ ندی نالوں' تالابوں اور چھوٹے بڑے جنگلات سے بھرا پڑا ہے۔

مغربی بنگال کا سندر بن کا جنگل تو شیروں' ہاتھیوں اور دوسرے درندوں اور دشوار گزار جنگلوں کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ان علاقوں میں تقریباً سارا سال بارشیں ہوتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے بڑے بڑے جنگل بن گئے ہیں۔ سبزے کو جب اور کہیں جگہ نہیں ملتی تو مکانوں کی دیوار پر چڑھ جاتا ہے۔ کلکتے میں برسات کے موسم میں بہت حبس ہو جاتا ہے لیکن شام کو دریائے ہگلی کی طرف سے خوشگوار ہوا ضرور چلتی ہے۔

دیہات میں ڈھلوان چھتوں والے جھونپڑا نما بوسیدہ مکان ہوتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے دیہات کی دونوں جانب تالاب ضرور ہوتا تھا جس میں مچھلیاں پالی جاتی

ہیں۔ یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا تھا کہ ٹرین ریلوے ٹریک پر سے گزر رہی ہے اور نیچے ...وں میں کالے کالے ننگے بنگالی لڑکے ٹرین کے متوازی بھاگتے جا رہے ہیں۔ جنگلوں ...تو دیار' سال اور مہاگنی کے دیو قامت درختوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ دیہات میں جگہ جگہ ...ل' املی اور نیم کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں تاڑ کے درخت اپنی ...زیوں کے ساتھ سب سے الگ کھڑے ہوتے ہیں۔

تاڑ کے درختوں کے جھنڈ نہیں ہوتے۔ یہ ستون کی طرح بالکل سیدھے اور ...نچے ہوتے ہیں۔ ان کے تنے پر کوئی شاخ نہیں ہوتی۔ اوپر جا کر لمبوترے پتوں کی ...زی سی بنی ہوتی ہے۔ ناریل کے بعض درخت جھکے ہوئے اور ٹیڑھے بھی ہوتے ہیں مگر ...کے درخت بالکل سیدھے اوپر تک گئے ہوتے ہیں۔

ناریل کے درختوں پر تو ناریل لگتے ہیں لیکن تاڑ کے درختوں پر کوئی پھل نہیں ...۔ جنگلی اور دیہاتی لوگ درخت کے اوپر چڑھ کر اس کی ایک موٹی شاخ کو کاٹ کر اس ...آگے مٹی کا ایک کٹورا باندھ دیتے ہیں۔ کٹی ہوئی شاخ میں سے ساری رات سفید رنگ ...یٹھی تاڑی قطرہ قطرہ ٹپکتی رہتی ہے۔ صبح تک کٹورا کافی بھر جاتا ہے۔ صبح اسے اتار لیا ...ہے اور لوگ اسے بڑے شوق سے پیتے ہیں۔ یہ جگر کیلئے بڑی مفید ہوتی ہے۔ اس ...تک اس تاڑی میں ذرا سا بھی نشہ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تاڑی ہمیشہ سورج ...سے پہلے درخت سے اتار کر پینی چاہیے۔

سورج نکلنے کے بعد دھوپ اور گرمی کی وجہ سے اس میں نشہ پیدا ہونا شروع ہو ...ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے شہروں کے غریب مزدوروں کے محلوں میں جو تاڑی بطور ...ب بکتی ہے وہ تاڑ کے درخت کی چھال سے کشید کی جاتی ہے اور نہایت گھٹیا قسم کی ...ب ہوتی ہے۔ ان شہروں میں تاڑی خانوں کے آگے سڑک کے کنارے ہاتھ سے رکشا ...نے والے' فیکٹریوں اور زیر تعمیر عمارتوں پر کام کرنے والے مزدور لوگ اور ان کی عورتیں ...نے سامنے بیٹھ جاتی ہیں۔ مٹی کے آبخوروں میں سے شراب پیتے ہیں۔ پاس ہی زمین پر ...پر نمک یا بھنے ہوئے چنے رکھے ہوتے ہیں۔ تاڑی پیتے جاتے ہیں اور ایک دوسرے

سے اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتے جاتے ہیں۔ قریب سے گزرتے ہوئے لگتا ہے کہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔

ایک جنگل میں سے گزرتے ہوئے مجھے صبح صبح تاڑ کے درخت سے اتری ہوئی تازہ تاڑی پینے کا اتفاق ہوا تھا۔ بالکل دہی کی میٹھی لسی کی طرح کا ذائقہ تھا اور اس میں کوئی نشہ نہیں تھا۔ معذرت چاہتا ہوں۔ جنگلوں' بارشوں اور درختوں کا ذکر آتا ہے تو میں اپنے اصل موضوع سے بھٹک جاتا ہوں۔

اصل میں یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ دو ڈھائی گھنٹوں میں میرا سفر کٹ گیا اور گاڑی کندرگام کے چھوٹے سے دیہاتی ٹائپ کے سٹیشن پر تھوڑی دیر کیلئے رکی تو میں ٹرین سے اتر گیا۔ آسمان پر کہیں کہیں سفید اور بھورے رنگ کے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔ کسی وقت بادل کا کوئی ٹکڑا سورج کے سامنے آ جاتا تھا تو ہر طرف چھاؤں ہو جاتی تھی۔ سٹیشن کے باہر چائے کا ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔

کچھ دیہاتی ٹائپ کے دبلے پتلے سانولے سے آدمی لکڑی کے بنچ پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نے بھی چائے کا ایک گلاس لیا اور ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ میرا اصل مقصد ان لوگوں سے رام ناتھ تالاب والے لکشمی مندر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ یہ دیہاتی بنگلہ زبان بول رہے تھے۔ میں بنگلہ زبان بار بار کلکتے آنے کی وجہ سے تھوڑی بہت سمجھ تو لیتا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔ یہاں بنگلہ کے علاوہ ٹوٹی پھوٹی اردو بھی عام بولی جاتی تھی۔

میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے بنگالی سے پوچھا کہ ادھر جنگل میں رام ناتھ تالاب کو کون سا راستہ جاتا ہے حالانکہ مجھے جان نے بتا دیا تھا کہ سٹیشن سے آگے ایک ندی پار کرو گے تو سامنے جنگل میں کافی آگے جا کر ہے۔ لیکن میں ان دیہاتیوں سے لکشمی مندر کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بنگالی بوڑھے نے اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی عجیب قسم کی اردو زبان میں کہا۔ اس کی اصل

زبان یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے درمیان جو مکالمے ہوئے میں انہیں سیدھی سادی اردو میں ہی لکھوں گا۔

''بابو! تم کہاں سے آئے ہو؟''

میں نے اسے بتایا کہ میرا نام سانیال ہے میں پنجاب سے اس علاقے کی سیر و سیاحت کرنے آیا ہوں۔ بنگالی کہنے لگا۔

''تمہارے پاس کوئی بندوق وغیرہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔''

وہ بولا۔ ''تو پھر رام ناتھ تالاب والے جنگل کا رخ نہ کرنا ورنہ کوئی شیر تمہیں کھا جائے گا۔''

دو بنگالی وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے وہ بھی میری طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر آپس میں بنگلہ زبان میں دو تین جملے کہے اور پھر ہنسنے لگے۔ میں نے اپنے ساتھ والے بنگالی بوڑھے سے کہا۔

''سنا ہے اس جنگل میں لکشمی دیوی جی کا کوئی پرانا تاریخی مندر بھی ہے جو رام ن جی کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔''

بوڑھا بنگالی بولا۔

''وہ مندر تو ویران ہو چکا' اس خطرناک جنگل میں پوجا پاٹھ کرنے کون آئے ''

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''سنا ہے اس مندر میں کبھی اچھوت کنیاؤں کی بلی (قربانی) دی جاتی تھی۔''

بوڑھے بنگالی نے بیڑی پیتے ہوئے کہا۔

''یہ پرانے زمانے کی بات ہے۔ اب کہیں بھی ایسا نہیں ہوتا' انگریز کا راج بڑا سخت ہے۔''

دوسرے بوڑھے نے مجھ سے پوچھا۔

''تم ادھر کیا کرنے جا رہے ہو؟ اس طرف تو شکاری بھی آتے ہوئے ڈرتے
ہیں اور تمہارے پاس تو کوئی بندوق بھی نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں جنگل میں زیادہ آگے نہیں جاؤں گا۔ بس دور سے لکشمی دیوی
کے پرانے مندر کے درشن کر کے واپس آ جاؤں گا۔''

پہلا بنگالی بوڑھا بولا۔

''میری مانو تو کنڈر گام کی سیر کر کے واپس چلے جاؤ۔ یہ جنگل دور ہی سے اچھے
لگتے ہیں۔''

مگر میں واپس جانے کیلئے نہیں آیا تھا۔ اس چھوٹے سے ہوٹل میں، میں نے
تھوڑے سے چاول بھاجی کے ساتھ کھائے اور ندی کے پل پر سے گزر کر دوسرے کنارے
پر آ گیا۔ یہاں تین چار جھونپڑیوں کی دکانیں بنی ہوئی تھیں جن میں آٹا، چاول، دال وغیرہ
رکھا ہوا تھا۔ ایک دکان پر تھال میں میٹھے چنوں کا ڈھیر لگا تھا۔

میں نے بڑی عقلمندی کی جو وہاں سے میٹھے چنے خرید کر اپنی جیکٹ کی دونوں
جیبیں بھر لیں۔ اس کے بعد میں جنگل میں داخل ہو گیا۔ یہ جنگل بھی علاقے کے دوسرے
جنگلوں کی طرح تھا۔ بے سروپا گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہر قسم کے درخت
کھڑے تھے۔ ان میں بانس کے جھنڈ بھی تھے۔

بانس کے جھنڈوں میں سے گزرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک تو بانس کی شاخوں
اور تنوں پر بڑے سخت لمبے لمبے کانٹے اگے ہوتے ہیں جو صرف کلہاڑی ہی سے کاٹے جا
سکتے ہیں۔ دوسرے زمین میں سے بانس کی باریک باریک سوئیوں ایسی کونپلیں باہر نکلی ہوتی
ہیں جو ربڑ کے جوتوں کے تلے میں بھی گھس کر پاؤں لہولہان کر دیتی ہیں۔ بانس کے
کانٹوں بھرے جھنڈ میں سے شیر بھی گزرنے سے گریز کرتا ہے کیونکہ شیر کے دوسرے اعضا
جتنے طاقتور ہوتے ہیں اس کے پیٹ کی کھال اتنی ہی نازک ہوتی ہے۔

ندی میں سے ایک نالہ نکل کر جنگل میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ دس بارہ فٹ چوڑا
نالہ تھا۔ جس کے کناروں پر بھنگ کی طرح کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ مجھے

امرتسر والی چھوٹی نہر کا نالہ یاد آ گیا۔ اس کے ایک کنارے پر بھنگ کی جھاڑیاں ہی
جھاڑیاں تھیں۔ ہمارے محلے کا ایک آدمی جو بھنگ کا رسیا تھا ان جھاڑیوں کے پتے توڑ کر
تھیلے میں ڈال کر لے جایا کرتا تھا۔ وہ ان پتوں کو آگ پر بھونتا۔ پھر ان کو گھوٹ کر اس میں
بادام کی گریاں اور چاروں مغز ڈال کر پھر گھوٹتا۔ آخر میں دودھ ڈال کر اس مشروب کو
کپڑے سے چھان کر پیالے میں بھر کر ایک طرف رکھ دیتا۔ اس کے بعد وہ حقہ تازہ کرتا،
چلم میں تمباکو بھرتا۔ تمباکو کے نیچے گڑ کی ایک ڈلی بھی رکھتا تھا۔ جب حقہ تیار ہو جاتا تو بھنگ
سے بھرا ہوا پیالہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پنجابی کا یہ شعر پڑھتا جو مجھے آج بھی یاد ہے۔

پیو بھنگاں تے سووو باگیں
پچھلے جیون اپنی بھاگیں

اس کا مطلب ہے کہ بھنگیں پیو اور باغ میں جا کر سو جاؤ، اگلے پچھلوں کی فکر
مت کرو وہ جانیں اور ان کے بھاگ جانیں۔ بڑا دلچسپ کردار تھا۔ گورنمنٹ ہائی سکول کے
باہر گنگنیاں بیچا کرتا تھا۔ حقہ اس نے اپنی چھابڑی کے پاس ہی رکھا ہوتا تھا۔ میں اپنے ہم
جولیوں کے ساتھ نہر پر نہانے جاتا تھا تو بھنگ کے پتے توڑ کر زور سے ہاتھ پر انہیں ملتا اور
سونگھتا۔ ان میں سے بڑی تیز بو آیا کرتی تھی، یہ کچی بھنگ کی بو تھی۔

◈......◈......◈

قیام پاکستان کے وقت لوہاری دروازے کے باہر انارکلی کی نکڑ میں مکتبہ جدید کے ساتھ ایک سرنگ نما دکان ہوتی تھی جہاں بھنگ کے رسیا اندر بنچ پر بیٹھ کر بھنگ پیا کرتے تھے۔ اس دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھنگ کی جھاڑیوں کی خوشبو آیا کرتی تھی اور مجھے امرتسر والی نہر یاد آ جاتی تھی۔ دکان کے اندر ہر وقت بھنگ گھٹتی رہتی تھی۔ دو پیسے یا شاید ایک آنے کا بھنگ کا گلاس ملتا تھا۔ ایک بار میں نے بھی اس دکان میں بیٹھ کر بھنگ کا ایک گلاس پیا تھا اس کے بعد میری یہ حالت ہوگئی کہ کسی بات پر ہنستا تھا تو ہنستا ہی چلا جاتا تھا۔ کھانا کھانے بیٹھا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ سارا دن میرے دماغ کی یہی ذلت آمیز حالت رہی۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ کیلئے بھنگ سے توبہ کر لی۔ اسی بھنگ کی جھاڑیوں کی قسم کی جھاڑیاں اس نالے کے کنارے پر بھی اگی ہوئی تھیں جو کندرگام سے آگے ندی سے نکل کر جنگل میں چلا گیا تھا۔ میں نے ایک پتے کو توڑ کر ہتھیلی پر زور سے ملا اور اسے سونگھا یہ کوئی اور ہی جھاڑی تھی۔ اس میں سے بھنگ کی تیز بو نہیں آ رہی تھی۔ میں نالے کے ساتھ ساتھ جنگل میں چلتا گیا۔ دل کو یہ فکر بھی دامن گیر تھا کہ کسی طرف سے شیر یا کوئی دوسرا درندہ اچانک نکل کر سامنے نہ آ جائے۔ اصل میں وہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ نفع نقصان کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ دل و دماغ پر ہیرو بننے کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔ ہر وقت یہی ایک دھن سوار رہتی ہے کہ کوئی ایسا کام کیا جائے کہ لوگ حیران رہ جائیں۔ میرے ذہن میں بھی یہی ہیرو بننے کا جذبہ غالب تھا جو مجھے کلکتے سے کھینچ کر اس جنگل میں لے آیا تھا۔ اس عمر میں انسان پر جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ عقل منہ سر لپیٹ کر ایک طرف خاموش بیٹھی

سگریٹ پی رہی ہوتی ہے۔ پھر جیسے جیسے انسان بڑا ہوتا جاتا ہے یہ جذبات ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں اور عقل غالب آنا شروع ہو جاتی ہے پھر خالی عقل ہی عقل رہ جاتی ہے اور جذبات تقریباً غائب ہو جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ آخری عمر میں یہ محترمہ عقل صاحبہ بھی رخصت ہو جاتی ہے اور انسان پر وہی بچپن کے جذبات غالب آ جاتے ہیں۔ چنانچہ بوڑھوں کی اکثر حرکتیں بالکل بچوں جیسی ہوتی ہیں۔ یہ انسانی زندگی کا چکر ہے جو نامعلوم صدیوں سے چل رہا ہے اور انسان کو اس سے فرار ممکن نہیں۔ فرار ہونے کی ضرورت بھی نہیں' یہ جیسا ہے بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ندی سے نکلا ہوا نالہ آگے جا کر جنگل میں رام ناتھ کے تالاب کے قریب سے گزرتا ہے۔

میرے لیے یہی ایک شارٹ کٹ یعنی سیدھا اور آسان راستہ تھا۔ نالے کے کنارے کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ ادھر سے یا تو دیہاتی لوگ بالکل نہیں گزرتے یا کبھی کبھار ہی گزرتے ہیں۔ نالے کے دائیں بائیں جنگل ہی جنگل تھا جہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جہاں جنگل زیادہ گھنا ہو جاتا تھا وہاں چھاؤں بڑی گہری ہو جاتی تھی۔ جہاں درخت ذرا دور دور ہو جاتے تھے وہاں دن کی روشنی نظر آنے لگتی تھی۔ کسی کسی وقت کسی درخت پر سے پرندے کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ جس کے بعد جنگل کا سناٹا اور زیادہ ڈراؤنا ہو جاتا تھا۔ مجھے جنگل سے ڈر بھی لگ رہا تھا اور لڑکپن کے منہ زور جذبات مجھے آگے ہی آگے لیے بھی جا رہے تھے۔ ویسے بھی میں انڈیا کے جنگلوں کا عادی ہو گیا تھا۔ صرف سانپ اور شیر' چیتے سے ڈر لگتا تھا۔ زیادہ خوف محسوس ہوتا تو میں سیٹی بجانے لگتا یا نیو تھیٹرز کا کوئی گانا گانے لگتا۔ چلتے چلتے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دائیں بائیں اور پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتا تھا۔ ایک جگہ ایک بہت بڑا درخت آندھی کی وجہ سے جڑوں کے کھوکھلا ہو جانے کی وجہ سے نالے کے اوپر گرا ہوا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اس کی گنجان شاخوں کے بیچ میں سے گزر کر دوسری طرف نکلا۔

میں کافی دیر سے نالے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ابھی تک نہ تو جنگل کا گھناپن ختم ہوا تھا اور نہ رام ناتھ کا تالاب دکھائی دیا تھا۔ نالے کے دوسرے کنارے پر میں نے

ایک کالے سانپ کو دیکھا جو اپنا پھن کھولے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی اور جلدی جلدی وہاں سے گزر گیا۔ ایک جگہ مجھے جنگل میں زور سے ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز سنائی دی' پھر یہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔ خدا خدا کر کے جنگل کا گھنا پن کم ہونا شروع ہوا۔ درخت ذرا پرے پرے ہٹ گئے۔ کچھ فاصلے پر میری دائیں جانب ایک جگہ نیم کے بہت سارے درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ نیم کے درخت کو میں دور ہی سے پہچان لیتا ہوں۔ جنگلوں اور امرتسر کے کمپنی باغ اور چالیس کنوؤں کے آس پاس پھرنے پھرانے کی وجہ سے مجھے بعض درختوں کی بڑی پہچان ہو گئی تھی۔ یہاں آ کر نالہ ایک طرف کو مڑ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ رام ناتھ کا تالاب نیم کے درختوں کے جھنڈ میں ہی ہو گا۔

میں نالے کو چھوڑ کر نیم کے جھنڈ کی طرف بڑھا۔ ان درختوں کی گہری سبز ٹھنڈی چھاؤں میں ایک تالاب نظر آیا جس کی ساکن سطح کو گلے سڑے پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تالاب پر کوئی نہانے یا کپڑے دھونے نہیں آتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تالاب کے اردگرد جنگل ہی جنگل تھا کوئی گاؤں وغیرہ نہیں تھا۔ شاید رات کو یا دن کے وقت بھی شیر ہاتھی یہاں پانی پینے آتے ہوں گے۔ یہی رام ناتھ تالاب ہو سکتا تھا۔

لکشمی دیوی کے قدیم مندر کے کھنڈر یہاں قریب ہی ہونے چاہیے تھے۔

اب میں محتاط ہو گیا۔ جنگلی جانوروں نے تو مجھے کچھ نہیں کہا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ کسی شیر یا ہاتھی نے مجھے نالے کے کنارے جاتے جنگل میں سے دیکھ بھی لیا ہو اور منہ پھیر کر دوسری طرف چلا گیا ہو۔ شیر ہاتھی کی یہ خصلت ہے کہ جب تک وہ غیض وغضب کی حالت میں نہ ہوں یا شیر آدم خور نہ بن چکا ہو' یہ جانور انسانوں کو کچھ نہیں کہتے۔ اکثر حالتوں میں کسی انسان کو اپنے راستے میں دیکھ کر راستہ بدل لیتے ہیں۔ سید رفیق حسین نے تو اپنی کتاب ''آئینہ حیرت'' میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ وسطی ہند کے جنگلوں میں چلتے پھرتے آدمی بمبئی' کلکتے کی سڑکوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔

خطرہ مجھے پجاری اور اس کے آدمیوں سے تھا جو ایک اچھوت لڑکی کو لکشمی دیوی

پر قربان کرنے کیلئے اغوا کر کے لائے ہوئے تھے۔ یہ قتل تھا اور اس قتل کے جرم میں ان لوگوں کو پھانسی کی سزا مل سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے لڑکی کو خفیہ طریقے سے قتل کرنے کے تمام ضروری اقدامات کیے ہوئے تھے۔ کلکتے کے ست پال نے بھی جان کو بتایا تھا کہ اگر ان لوگوں کو پتہ چل جائے کہ کسی نے انہیں یہ واردات کرتے دیکھ لیا ہے تو وہ اسے بھی زندہ نہیں چھوڑتے۔ میں نے یہ کیا کہ نالے سے دور ہو کر جھاڑیوں کی اوٹ میں چلنے لگا۔ آخر مجھے لکشمی دیوی کے قدیم مندر کا کھنڈر نظر آ گیا۔ یہ مندر زمین سے دو تین فٹ اونچے چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ مندر کے اردگرد کوئی انسان چلتا پھرتا دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ پجاری کے آدمیوں نے وہاں ناکہ بندی کر رکھی ہو گی چنانچہ میں وہیں سے ہٹ گیا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد میں ان درختوں کی طرف ہو گیا جو مندر کے پیچھے دور تک چلے گئے تھے۔ مندر کے عقب میں جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اٹھا رہا تھا۔ جذبات کے غلبے سے بچی ہوئی جتنی بھی عقل میرے پاس تھی میں برابر اس سے کام لے رہا تھا۔ مندر سے ڈیڑھ دو سو گز دور ہو کر میں اس کے متوازی ہو کر چل رہا تھا۔ یہاں جھاڑیاں چھ چھ فٹ اونچی تھیں اور مجھے چلتے ہوئے اچھی آڑ مل رہی تھی۔ ایک جگہ نشیب میں مجھے ایک اور تالاب نظر آیا۔ یہ تالاب رام ناتھ کے تالاب سے چھوٹا تھا اور اس پر ایک جانب سیڑھیاں تالاب میں اترتی تھیں۔ سیڑھیوں کے اوپر درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ میں ابھی تالاب کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں وہیں ایک درخت کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔

آواز تالاب کی طرف سے آئی تھی۔ تالاب نشیب میں چالیس پچاس قدموں کے فاصلے پر ہو گا۔ میری نظریں تالاب پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنے میں درختوں میں سے تین آدمی نمودار ہوئے۔ ان کے کندھوں سے بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ ایک جوان لڑکی ان کے ساتھ تھی۔ لڑکی کے گلے میں رسی بندھی ہوئی تھی۔ ایک آدمی نے رسی کو پکڑ رکھا تھا۔ لڑکی سسک کر تالاب کی طرف چل رہی تھی اور ان آدمیوں کو بار بار ہاتھ جوڑ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ مسلح آدمی لڑکی کو آگے دھکیل رہے تھے اور آپس میں ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہے

تھے۔ تالاب کی سیڑھیوں کے پاس آ کر انہوں نے لڑکی کو زبردستی سیڑھیوں میں بٹھا دیا اور
رسی کو ڈھیلی چھوڑتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے۔ کچھ فاصلے پر جا کر وہ جھاڑیوں کے پاس جا کر
بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہ لڑکی ہے جسے لکشمی دیوی پر قربان کرنے کیلئے اس جنگل والے
مندر میں اغوا کر کے لایا گیا ہے اور یہ لوگ لڑکی کو اشنان کرانے لائے ہیں۔ لڑکی کچھ دیر
سیڑھیوں میں سر جھکائے بیٹھی رہی پھر اس نے سر اٹھا کر اوپر درختوں کی طرف دیکھا۔ پھر
سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ اپنی ساڑھی اتارنے لگی۔

تالاب کا پانی آخری سیڑھی تک آیا ہوا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پر بیٹھ کر نہانے لگی۔
جس طرح یہ بے یار و مددگار اچھوت لڑکی ان آدمیوں کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی اس منظر
نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ ظاہر ہے وہ ان لوگوں سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی
ہوگی اسے تو علم ہو گیا ہوگا کہ یہاں اسے لکشمی دیوی کی بھینٹ چڑھانے کیلئے لایا گیا ہے
اور اس کی زندگی کے بس دو ایک دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔ یہ ایک غریب بے سہارا لڑکی کا
قتل تھا' یہ ظلم تھا۔ میرے اندر کا ہیرو جاگ اٹھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ
ہو جائے میں اس لڑکی کو لکشمی دیوی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا اور اسے ہر حالت میں
یہاں سے بھگا کر لے جاؤں گا۔ کہاں میں دیوی کی انسانی قربانی کا ایڈونچر دیکھنے آیا تھا
اور کہاں میں نے دیوی پر قربان کی جانے والی لڑکی کو بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے یہ
سوچا ہی نہیں تھا کہ میں اس لڑکی کو یہاں سے کیسے بھگا کر لے جاؤں گا۔ میں نے زندگی
میں یہ تجربہ کر کے دیکھا ہے کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں بالکل نہیں
سوچنا چاہیے۔ بس اندھا دھند کر دینے چاہئیں۔ زیادہ سوچ بچار کرنے سے وہ کچھ کا کچھ
بن جاتا ہے۔ میں نے بھی ذرا سا بھی نہیں سوچا تھا اور بس اللہ توکل لڑکی کو ان قاتلوں سے
بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لڑکی تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی با دل نخواستہ اشنان کر رہی تھی۔
شاید وہ رو بھی رہی تھی کیونکہ وہ بار بار ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھ لیتی تھی۔ اس کی گردن
میں رسی بندھی ہوئی تھی جس کا سرا جھاڑیوں کے پاس بیٹھے تین مسلح آدمیوں میں سے ایک
آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ نہانے کے بعد لڑکی نے ساڑھی جسم کے گرد لپیٹی۔ تینوں آدمی بھی

اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس آدمی کے ہاتھ میں رسی تھی اس نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچنا شروع
کر دیا۔

لڑکی اس طرح دائیں بائیں سر ہلاتی چلی جا رہی تھی جیسے وہ کسی جادو کے زیر اثر
موت کے منہ کی طرف بڑھ رہی ہو۔ حاتم طائی کی ایک کہانی میں کوہ ندا کا ذکر آتا ہے۔ یہ
ایک پہاڑ ہے جس کے غار میں ایک جن رہتا ہے۔ وہ ہر ماہ ایک آدمی کو کھاتا ہے۔ گاؤں
کے لوگ وقت مقررہ پر ایک آدمی کو لے کر کوہ ندا کے غار کے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ غار میں سے جن کی آواز آتی ہے تو جس آدمی کو جن کی بھینٹ چڑھانا ہوتا ہے وہ
اپنے آپ غار کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ مسلم امرتسر کے سینما گھر امرت ٹاکیز میں
میں نے بچپن میں حاتم طائی کی فلم دیکھی تھی۔ اس فلم میں ایک پہاڑ دکھایا گیا تھا۔ یہ کوہ ندا
تھا۔ اس کے غار کے باہر گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ ایک آدمی جس کے گلے میں پھولوں
کے ہار ڈالے گئے تھے وہ سب سے آگے غار کی طرف منہ کر کے بالکل ساکت کھڑا تھا۔
اتنے میں کوہ ندا کے غار میں سے جن کی آواز آتی ہے۔ آواز کو سنتے ہی وہ آدمی جس کو جن
کے آگے اس کی ضیافت کیلئے پیش کیا جاتا تھا' اپنے آپ غار کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ وہ
اسی طرح اپنا سر دائیں بائیں ہلا رہا تھا جس طرح یہ مظلوم لڑکی سر ہلا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر
مجھے حاتم طائی فلم کا کوہ ندا والا سین یاد آ گیا تھا۔ چونکہ میں نے لڑکی کو بچانے کا فیصلہ کر لیا
تھا اس لیے ضروری تھا کہ میں ان قاتلوں کا پیچھا کر کے معلوم کروں کہ لڑکی کو انہوں نے
کہاں رکھا ہوا ہے۔ تینوں مسلح آدمی لڑکی کو آگے لگا کر درختوں میں ایک طرف چل پڑے۔
میں تیزی کے ساتھ نشیب میں اترا اور درختوں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ان لوگوں کے پیچھے لگ
گیا۔ ایک طرح سے میں بھی موت کے منہ میں جا رہا تھا لیکن موت کے منہ میں جائے بغیر
میں اس لڑکی کو موت کے منہ سے نہیں نکال سکتا تھا۔ لیکن ان لوگوں کو نظروں سے اوجھل
نہیں ہونے دیتا تھا۔ دن کا وقت تھا' درخت زیادہ گنجان بھی نہیں تھے۔ جھاڑیاں بہت تھیں
ایک آدمی نے لڑکی کو بازو سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔ میں اپنے
دائیں بائیں سے بھی ہوشیار تھا کہ کہیں ان قاتلوں کا کوئی جاسوس مجھے دیکھ کر مجھے بھی نہ پکڑ

لے۔ چلتے چلتے یہ لوگ ایک ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ چھوٹا سا ٹیلہ تھا۔ اس کے دامن میں ایک کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کا ایک پٹ کھلا تھا۔ انہوں نے لڑکی کو کوٹھڑی کے اندر دھکیل کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ ایک پگڈنڈی پیچھے کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ اس طرف چلے گئے۔ لڑکی کو کوٹھڑی میں دھکیلنے سے پہلے انہوں نے اس کی گردن میں سے رسی کھول دی تھی۔

میں بڑا حیران تھا کہ انہوں نے کوٹھڑی کے باہر پہرہ دینے کیلئے اپنا کوئی آدمی کیوں نہیں چھوڑا تھا۔ پھر خیال آیا کہ شاید انہیں پورا یقین ہے کہ اس دور افتادہ خطرناک جنگل میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کون آئے گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس پگڈنڈی پر ایک آدمی آتا نظر آیا جو کوٹھڑی کے باہر آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس بندوق تھی۔ اب وہ مظلوم لڑکی مسلح پہرے میں تھی۔ میں آگے جا کر کوٹھڑی کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ لڑکی کو وہاں سے نکالنے کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں۔ لیکن دن کی روشنی میں کوٹھڑی کے آس پاس جانا میرے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں اور آدمی بھی ہو سکتے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ کوٹھڑی کے پیچھے ان لوگوں کا ڈیرہ ہو۔ اگر ان میں سے کسی کی مجھ پر نظر پڑ گئی تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ بڑی آسانی سے مجھے قتل کر کے لاش جنگل میں پھینک سکتے تھے۔ وہاں کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے رات کے اندھیرے میں اس طرف آنا چاہیے۔ یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ لڑکی کو بچانے کیلئے میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہا۔ زیادہ سے زیادہ ایک دن کے بعد وہ اس لڑکی کو دیوی کی مورتی کے آگے قتل کرنے والے تھے۔

میں خاموشی سے واپس ہو گیا۔

جس طرف سے آیا تھا اسی طرف اپنے آپ کو جھاڑیوں اور درختوں میں چھپاتا چل دیا۔ مجھے کسی ایسی محفوظ جگہ کی تلاش تھی جہاں میں دن کا باقی حصہ گزار سکوں۔ آخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ یہ جگہ ندی سے نکل کر جنگل میں داخل ہونے والے نالے کے قریب ایک بھورے رنگ کی چٹان کا ایک قدرتی غار تھا۔ اسے میں غار نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ وہ اپنے

دہانے سے صرف بیس پچیس فٹ ہی چٹان کے اندر گیا ہوا تھا۔ اس کا دہانہ قدرتی جھاڑیوں اور گھاس پتوں میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے یہ ڈر ضرور لگا کہ کہیں یہ کسی جنگلی درندہ از قسم شیر وغیرہ کی کچھار نہ ہو جہاں رات کو آ کر وہ آرام نہ کرتا ہو۔ غار کے اندر گلے سڑے پتوں اور دلدل کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔ میں نے زمین کو پاؤں سے دبا کر دیکھا مگر زمین دلدلی نہیں تھی بلکہ خشک تھی اور وہاں چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ غار کے منہ کے آگے آئی ہوئی جھاڑیوں اور اونچی اونچی جنگلی گھاس کی وجہ سے غار میں دن کے وقت بھی ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہی نالہ بہہ رہا تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی میں غار سے نکل کر بڑے محتاط انداز میں چلتا ہوا نالے پر گیا۔ کنارے پر بیٹھ کر پانی پیا اور اسی طرح دبے پاؤں چلتا غار میں واپس آ گیا۔ میری جیکٹ کی دونوں جیبیں میٹھے چنوں سے بھری ہوئی تھیں جو میں نے کندر گام کے سٹیشن کے باہر ایک دکان سے خریدے تھے۔ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں خاموشی سے چنے کھانے لگا۔

◈......◈......◈

بہت جلد مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میں غار میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ وہاں مچھر بہت زیادہ تھے اور حبس بھی بہت تھا۔ ہوا اتنی ہی آ رہی تھی کہ جو زندہ رہنے کیلئے کافی ہو۔ پھر فضا میں دلدل' سیلن اور گلے سڑے پتوں کی ناگوار بو بھی تھی۔ مچھروں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں ادھر ادھر ہاتھ چلانے لگا۔ لیکن وہ جنگل کے آدم خور مچھر تھے۔ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے لیکن وہ میری نوعمری کا زمانہ تھا۔ بدن میں تازہ گرم خون گردش کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھ پر ہیرو بننے کی دھن سوار تھی۔ میں تو اس وقت اپنے آپ کو جنگل کی اس زمانے کی مشہور فلم ٹارزن کا ہیرو سمجھ رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھ سے وہاں زیادہ دیر نہ بیٹھا گیا اور میں غار سے نکل کر باہر جھاڑیوں کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

یہاں اندر کے مقابلے میں فضا قابل برداشت تھی۔ خطرہ صرف اتنا ہی تھا کہ کہیں مجھ پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ لیکن میں نے اس کیلئے اپنے آپ کو جھاڑیوں اور اونچی گھاس کی آڑ میں اچھی طرح سے چھپایا ہوا تھا۔ جب آدمی وقت گزارنے کیلئے کسی جگہ خاص طور پر کسی سنسان جنگل میں بیٹھ جائے تو وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے وقت ایک جگہ آ کر رک گیا ہے اور بالکل نہیں گزر رہا۔ مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا تھا۔ میں آسمان کی طرف دیکھتا جو درختوں کی شاخوں میں سے نظر آ رہا تھا۔ درختوں کے اوپر آسمان روشن تھا۔ درختوں کے نیچے تو گہری اور گھنی چھاؤں تھی لیکن درختوں کے اوپر شاید دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں صرف درختوں کی گنجان شاخوں میں سے نظر آنے والے آسمان کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ شام ہوئی ہے یا نہیں لیکن جتنا بھی آسمان مجھے نظر آ رہا تھا وہ

دھوپ میں روشن تھا۔ میں وہیں بیٹھے بیٹھے چنے کھاتا رہا۔ خدا جانے یہ کس قسم کا آسیبی جنگل تھا کہ کسی پرندے تک کے بولنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سارے جنگل پر ایک دہشت سی طاری ہے۔ کسی جنگلی جانور کے بولنے کی بھی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میرے اوپر درختوں کی چلمن میں سے آسمان ابھی تک روشن روشن نظر آ رہا تھا۔

چنے کھانے سے جب میری بھوک ختم ہو گئی تو میں آہستہ سے اٹھا۔ جھاڑیوں میں سے بڑے غور سے چاروں طرف خاص طور پر نالے کی طرف نظر دوڑائی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ آس پاس کوئی آدمی نہیں ہے تو میں نالے کے کنارے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جلدی جلدی پانی پیا' منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور جلدی سے اٹھ کر اسی طرح واپس جھاڑیوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ مجھے فضا میں بیڑی کے تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔ میرا دوست جان بھی کلکتے میں بیڑی پیتا تھا۔ میں اس کے تمباکو کی بو سے بڑی اچھی طرح سے واقف تھا۔ میں جلدی سے غار میں جا کر اس کے دہانے کے قریب اونچی گھاس کی اوٹ میں چھپ گیا۔ چند لمحوں کے بعد دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ آواز دور سے آ رہی تھی اور آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں اونچی گھاس کو ذرا سا ایک طرف ہٹا کر دیکھنے لگا۔ آواز نالے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں دو آدمی نمودار ہوئے۔ دونوں کے کندھوں سے بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ وہ بیڑیاں پی رہے تھے اور بنگلہ زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے آ رہے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ لیکن میں بڑی اچھی اور محفوظ آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ وہ میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تو میں انہیں نظر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ دونوں آدمی لکشمی مندر والے پجاری کے آدمی ہی ہو سکتے تھے۔ ان کا لباس یعنی دھوتی کرتا شہر کے آدمیوں والا لباس تھا۔ وہ جنگل میں رہنے والے دیہاتی نہیں تھے۔ جو تین آدمی اچھوت لڑکی کو تالاب پر اشنان کروانے لائے تھے ان کا بھی یہی لباس تھا۔ یہ شہر کے بڑے مندر کے سنگ دل پجاری کے ساتھی تھے اور شہر سے لڑکی کو اغوا

کر کے اسے یہاں دیوی کی مورتی کے آگے قربان کرنے کیلئے لائے تھے۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے میرے سامنے سے گزر گئے' جب ان کی آوازیں آنا بند ہوگئیں تو میں آہستہ سے اٹھ کر غار کے اندر سے نکلا اور وہیں قریب ہی جھاڑیوں کے پاس بیٹھ گیا کیونکہ اندر مچھروں نے مجھ پر دوبارہ حملہ کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وقت اس آسیبی جنگل میں آ کر شاید رک گیا ہے۔ لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ درختوں کی چلمن سے اوپر آسمان کی سفید روشنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ پھر درختوں پر رات کے وقت بسیرا کرنے والے پرندوں نے بھی آنا شروع کر دیا اور جنگل ان کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ یہ بڑا عجیب قسم کا شور تھا جس میں اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے یہ جنگل پرندوں کا بہت بڑا پنجرہ ہے اور میں اس پنجرے میں جانوروں کے ساتھ بند کر دیا گیا ہوں۔

جیسے جیسے آسمان کی روشنی ماند پڑتی گئی پرندوں کا شور بھی کم ہوتا گیا۔ سورج غروب ہوتا وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن سورج غروب ہو چکا تھا اور آسمان پر اب کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شام ہو گئی تھی' درختوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں وہیں جھاڑیوں میں ہی بیٹھا تھا۔ کسی کسی وقت اٹھ کر ہاتھ پاؤں ہلا لیتا تھا اور پھر وہیں بیٹھ جاتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جب رات کا اندھیرا گہرا ہو جائے تب اس کوٹھڑی کی طرف جاؤں' جہاں اچھوت لڑکی قید تھی۔ جب چاروں طرف رات کا اندھیرا ہو گیا اور پرندوں کی آوازیں بھی رک گئیں تو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی گزر گئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت جاؤں جب وہ لوگ لڑکی کو کھانا وغیرہ کھلا چکے ہوں۔ کیونکہ ست پال نے بتایا تھا کہ لکشمی دیوی پر قربان کرنے سے پہلے لڑکی کو خوب اچھے اچھے کھانے اور حلوہ پوری کھلائی جاتی ہے تاکہ اس کے جسم میں زیادہ سے زیادہ خون پیدا ہو اور یہ خون اسے ذبح کر کے لکشمی کے چرنوں میں بہایا جائے۔

بڑی خوفناک اور درندہ صفت دیومالا ہے ہندو قوم کی۔ ہماری نسل کے لوگ تو ہندو قوم کی اس بھیانک دیومالا کے تمام پہلوؤں سے واقف تھے لیکن پاکستان کی نئی نسل

اپنے وطن کے دشمن کی دیومالا کے اس اصلی روپ سے ناواقف ہے۔ ہماری نئی نسل ڈش پر صرف ان کی عورتوں کے دیومالائی بھارت ناٹیم اور کتھک رقص ہی دیکھتی ہے وہ ہندو دیومالا کے بھیانک روپ سے بالکل ناآشنا ہے۔ میں اپنی نئی نسل کو اپنے دشمن کا اصلی روپ دکھانا چاہتا ہوں جسے میں نے سارے ہندوستان میں اپنی آوارہ گردیوں کے زمانے میں بڑے قریب سے دیکھا ہے۔

رات پڑ جانے کے بعد جب کافی وقت گزر گیا اور جنگل کی خاموشی کافی گہری ہو گئی تو میں جھاڑیوں میں سے نکل کر نالے کے ساتھ ساتھ اس ٹیلے کی طرف چلنے لگا جس کے نشیب میں کوٹھڑی تھی۔ جنگل کا راستہ مجھے اندھیرے میں بھی یاد تھا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ ہر کسی مکان کا کمرہ بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دیے جائیں' ساری بتیاں گل کر دی جائیں تو کمرے میں اتنا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا اور آدمی میز کرسیوں سے ٹکرانے لگتا ہے۔ لیکن جنگل کے اندھیرے میں ایسی بات نہیں ہوتی۔ جنگل میں کتنی ہی تاریک رات کیوں نہ چھا جائے پھر بھی درختوں اور جھاڑیوں وغیرہ کے دھندلے دھندلے سائے نظر آتے رہتے ہیں۔ کچھ میں بھی جنگل کی راتوں کے اندھیرے کا عادی ہو گیا تھا۔ مجھے اندھیری رات میں بھی جنگل میں وہ درخت نظر آ رہے تھے جن کے قریب سے ہو کر مجھے ٹیلے کی طرف جانا تھا۔ جہاں مجھے نالے سے الگ ہونا تھا' وہاں میں اس سے الگ ہو گیا اور کچھ فاصلے پر جو ٹیلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا اس طرف چلنے لگا۔ یہاں میں محتاط ہو گیا تھا۔ میں دبا دبا کر قدم اٹھا رہا تھا تاکہ چلتے وقت آہٹ پیدا نہ ہو۔

اوس پڑنے کی وجہ سے گھاس گیلی اور بے آواز ہو گئی تھی۔ میں ٹیلے سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا اور اوپر کا لمبا چکر کاٹ کر ٹیلے کے قریب آ کر ایک جگہ درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر ٹیلے کے نشیب میں بنی ہوئی کوٹھڑی دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ میں بڑے غور سے اس کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے باہر وہ مسلح شخص نہیں بیٹھا تھا جسے میں نے دن کے وقت پہرے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ شاید وہ اپنی ڈیوٹی دے کر چلا گیا تھا اور اب اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی آنے والا

تھا۔ ایک اعتبار سے جائے واردات خالی پڑی تھی۔ پھر بھی میں پوری تسلی کرنا چاہتا تھا کہ آس پاس تو کوئی مسلح آدمی گشت نہیں کر رہا۔ میں نے سرمئی اندھیرے میں ٹیلے کے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ مجھے وہاں کوئی آدمی چلتا پھرتا نظر نہ آیا مگر میں ابھی تک مطمئن نہیں ہو تھا۔ میں نے فضا کو سونگھا' فضا میں بیڑی کے تمباکو کی کوئی بو نہیں تھی۔ یہ لوگ بیڑیاں بہت پیتے تھے۔ اگر وہاں ان میں سے کوئی ہوتا تو فضا میں بیڑی کی بو ضرور پھیلی ہوتی۔ میں نے کان لگا کر جنگل کی خاموشی کو سننے کی کوشش کی۔ کسی طرف سے کسی قسم کی کوئی آہٹ یا آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں اٹھا اور جھک کر آہستہ آہستہ کوٹھڑی کے عقب کی طرف بڑھنے لگا۔ میں بالکل سلوموشن میں چل رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ کوٹھڑی کے پیچھے ضرور کوئی کھڑکی ہو گی میں اسے توڑ کر لڑکی کو نکال لے جانے کی کوشش کروں گا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ ایسا فلموں میں ہی ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اول تو میرے پاس کھڑکی توڑنے کیلئے کوئی اوزار نہیں تھا۔ دوسرے اگر میں نے کھڑکی توڑنے کی کوشش کی تو اس کی آواز پیدا ہو گی اور یہ آواز قاتل پجاریوں کو ہوشیار کر دے گی لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں' یہ میری جوانی کے گرم خون اور ایک مظلوم لڑکی کی بے اختیار مدد کرنے کا جذبہ تھا جس نے مجھے بہت حد تک دلیر اور کسی حد تک بے وقوف بنا رکھا تھا۔ یہ میری بے وقوفی ہی تھی کہ میں بغیر سوچے سمجھے موت کے منہ میں چلا جا رہا تھا لیکن یقین کریں کہ اگر آپ بے وقوفی میں بھی کسی مظلوم انسان کی مدد کرنے چل پڑتے ہیں تو خدا اس طرح آپ کی مدد کرتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

بشرطیکہ آپ کی نیت نیک ہو اور بے وقوف آدمی عام طور پر بدنیت نہیں ہوتے۔ میں بے طرح اگی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس اور پودوں میں سے پھونک پھونک کر قدم رکھتا کوٹھڑی سے بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ جنگل کی تاریک رات ساکت اور خاموش تھی۔ کوئی پتا بھی نہیں ہل رہا تھا۔ ابھی تک نہ کسی نے مجھے دیکھا تھا' نہ میں نے کسی کو دیکھا تھا۔ کوٹھڑی کے بند دروازے کے آگے کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ میں جھک کر چلتا کوٹھڑی کے پیچھے آ گیا۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے اندھیرے میں بڑے غور سے

دیکھا۔ مجھے کوٹھڑی کی پچھلی دیوار میں کوئی کھڑکی وغیرہ دکھائی نہ دی۔ دیوار کے ساتھ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میں ہمت کر کے گھٹنوں کے بل چلتا جھاڑیوں کے پاس چلا گیا۔ دیوار پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ کان لگایا۔ کوٹھڑی میں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں اسی طرح گھٹنوں کے بل دیوار کے ساتھ چلتا کونے میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سر ذرا سا آگے نکال کر دیکھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ مجھ سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھا۔ باہر کوئی پہرے دار وغیرہ نہیں تھا۔ میں دیوار سے لگ کر بلی کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا دروازے کے پاس آ گیا۔

دروازہ بڑی مضبوط لکڑی کا تھا۔ میں کھڑے ہو کر دروازے کے ساتھ لگ گیا۔ ایک بار پھر تاریکی میں سامنے اور اردگرد کے درختوں کی طرف دیکھا۔ رات سنسان تھی۔ کوئی پہرے دار وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے تالے کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ یہ دیسی تالا تھا اور زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس زمانے کے دیسی تالوں کی چابی گھما کر کھولا جاتا تھا اس کے کنڈے کے درمیان کافی جگہ تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر نیچے کو جھٹکا دیا۔ مگر تالا اپنی جگہ پر قائم رہا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس کے کنڈے کے درمیان درخت کی کوئی مضبوط شاخ ڈال کر اسے اوپر سے نیچے دو چار جھٹکے دوں تو تالا کھل سکتا ہے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ گھٹنوں کے بل چل کر کوٹھڑی کے پیچھے جو درخت تھے ان کے پاس جا کر درخت کی کوئی گری پڑی ٹہنی تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے ایک ٹہنی مل گئی۔ یہ مضبوط ڈنڈے کی طرح کی تھی۔ میں اسے لے کر دروازے کے پاس واپس آ گیا۔ ٹہنی کا ڈنڈا تالے کے کنڈے کے اندر سے گزر گیا۔ میں نے اس کے اگلے سرے کو دروازے کے ساتھ ٹکایا اور دونوں ہاتھوں سے اسے اوپر سے نیچے کی طرف زور سے جھٹکا دیا۔ تالا اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ مجھے یہ خیال بھی رکھنا پڑ رہا تھا کہ جھٹکا لگنے سے آواز پیدا نہ ہو۔ میں نے دو تین بار کوشش کی' مگر تالا نہ کھلا۔ کم بخت بڑا مضبوط تالا تھا۔ مجھے کسی کے رونے کی دبی دبی آواز سنائی دی۔

میں دروازے کی درز تلاش کرنے لگا۔ رونے کی آواز کوٹھڑی کے اندر سے آ

رہی تھی۔ دروازے میں کوئی نہ کوئی جھری وغیرہ ضرور ہوگی مگر اندھیرے میں وہ مجھے نظر نہیں
آ رہی تھی۔ میں نے دروازے کے ساتھ کان لگا کر سنا۔ رونے کی آواز اندر سے آ رہی تھی
اور یہ مظلوم لڑکی کی آواز تھی جو دبی دبی آواز میں رو رہی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ظالم
لوگ اسے دیوی کی بھینٹ چڑھانے والے ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مجھے کسی پہرے
دار کے آ جانے کا بھی دھڑکا لگا تھا۔ میں نے تالا توڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک بار
میں نے زور سے جھٹکا دیا تو تالا کھل گیا۔ میں نے اسے دروازے کے کنڈے میں سے
نکال کر ایک طرف زمین پر رکھ دیا اور دروازے کو آہستہ سے کھولا۔ دروازہ کم بخت
چرچرایا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ کوٹھڑی میں لڑکی کے رونے کی
آواز آنی بند ہو گئی۔ اس نے سہمی ہوئی خشک آواز میں کہا۔

"مجھ پر دیا کرو (رحم کرو)' میری بھینٹ نہ دو۔"

میں جلدی سے کوٹھڑی میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ کوٹھڑی میں گھپ
اندھیرا تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"میں تمہیں یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔ جلدی سے میرے ساتھ باہر آ جاؤ۔
جلدی کرو؟"

کوٹھڑی میں خاموشی چھا گئی۔ نہ مجھے لڑکی نظر آ رہی تھی نہ لڑکی کو میں دکھائی دے
رہا تھا۔ ہم دونوں اندھیرے کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لڑکی نے ڈرے ہوئے
لہجے میں کہا۔

"نہیں' میں نہیں جاؤں گی۔ مجھ پر دیا کرو' مجھے دیوی کی بھینٹ نہ چڑھاؤ۔"

میں دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر جس طرف سے لڑکی کی آواز آئی تھی اس طرف
بڑھا۔ میرا ایک ہاتھ لڑکی کے کندھے اور ایک اس کے منہ پر جا کر لگا۔ اس کی آنکھیں اور
رخسار گیلے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کہا۔

"میں تمہارے بھائی کی طرح ہوں۔ جلدی سے میرے ساتھ یہاں سے بھاگ
چلو۔ نہیں تو وہ لوگ تمہیں دن نکلتے ہی مار ڈالیں گے۔"

لڑکی کو میں نے دل سے بھائی کہا تھا۔ اس پر اس کا اثر ہو گیا۔ وہ سہمی ہوئی آواز
بولی۔

"باہر پجاری لوگ تو نہیں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"باہر اس وقت کوئی نہیں۔ وقت ضائع نہ کرو۔ اگر کوئی آ گیا تو تمہارے ساتھ
بھی قتل ہو جاؤں گا۔"

میں نے لڑکی کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ لڑکی اندھیرے میں دروازے کی طرف بڑھی۔
وازے کے پاس آ کر میں نے دروازے کو ٹٹول کر دیکھا۔ پھر آہستہ سے اس کا ایک
کھول دیا۔ ایک بار پھر دروازہ چرچرایا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ
یا۔ لڑکی بھی ڈر کر میرے ساتھ لگ گئی۔

دوسرے لمحے ہم دروازے سے باہر نکل گئے تھے اور لڑکی میرے ساتھ رات کی
یکی میں جھاڑیوں اور درختوں میں بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ میرا رخ نالے کی طرف تھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں لڑکی کو موت کے منہ سے نکال کر لے آیا ہوں۔
لڑکی دبلی پتلی تھی۔ میرے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ نالے کے قریب پہنچ کر جہاں درخت جھاڑیاں گنجان ہو گئیں ہم بھاگنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگے۔ میں نے اندھیرے میں ہی دیکھ لیا تھا کہ ہم رام ناتھ کے تالاب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے نکل گئے ہیں۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ لکشمی دیوی کے پجاری جو بندوقیں لے کر پھر رہے تھے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ شاید رات کو انہوں نے زیادہ تاڑی پی لی تھی اور کہیں بے ہوش پڑے تھے۔ بہرحال میں نے ہیرو کا کردار ادا کر دیا تھا اور لڑکی کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر لے آیا تھا۔

میں صحیح سمت کو جا رہا تھا۔ آخر ہم اس جگہ آ گئے جہاں نالہ ندی میں سے نکل کر جنگل میں داخل ہوتا تھا۔ ہم نے ندی کا پل پار کیا تو سامنے کندرگام ریلوے سٹیشن کی بتیاں نظر آنے لگیں۔ ان روشنیوں کو دیکھ کر میرا حوصلہ بلند ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں مہذب دنیا میں آ گیا ہوں اور اب ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

سٹیشن کی ایک جانب کندرگام کی آبادی میں بھی کہیں کہیں روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں پولیس کی چوکی بھی ہو گی اور پولیس ہماری ضرور حفاظت کرے گی۔ کیونکہ کسی انسان کو کسی دیوی کی بھینٹ چڑھانا قتل کے جرم کے برابر تھا۔

میں لڑکی کو لے کر سیدھا کندرگام کے سٹیشن پر آ گیا۔ سٹیشن کی گھڑی رات کا ڈیڑھ بجا رہی تھی۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ بکنگ آفس کی کھڑکی بند تھی۔ صرف ایک

کمرے میں ایک بابو رجسٹر سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کلکتہ جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"صبح جائے گی۔"

ہم خالی پلیٹ فارم پر آ کر ایک بند سٹال کے پاس جہاں تھوڑا اندھیرا تھا بیٹھ گئے۔ لڑکی سانولے رنگ کی تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی سولہ سترہ سال کی ہو گی۔ ناک میں سرخ نگ والا کوکا تھا۔ وہ ابھی تک ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ لوگ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ "رانی۔"

اس کے باوجود کہ ہم خطرے سے بہت حد تک دور ہو گئے تھے میں اس علاقے سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی بہت وقت تھا۔ لڑکی رانی بند سٹال کی لکڑی کی دیوار سے ٹیک لگا کر سمٹ کر بیٹھی تھی۔

میری نگاہیں بار بار خالی پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ڈر اس بات کا تھا کہ اگر پجاری قاتلوں کو لڑکی کے فرار کا علم ہو گیا تو وہ اس کی تلاش میں ریلوے سٹیشن پر ضرور آئیں گے۔ پہلے میں نے سوچا کہ لڑکی کو پولیس چوکی لے جاتا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ پولیس کی مصیبت خوانخواہ گلے نہ پڑ جائے۔ وہیں بیٹھا رہا۔ مگر میں سکون سے نہیں بیٹھا ہوا تھا مجھے بے چینی لگی ہوئی تھی۔

کلکتے کی طرف جانے والی ٹرین صبح کے وقت آتی تھی۔ کم از کم ریلوے کے بابو نے مجھے یہی بتایا تھا اور صبح تک مندر کے قاتل پجاریوں کو لڑکی کے فرار کا علم ہو جانا یقینی تھا اور ان کا لڑکی کی تلاش میں سٹیشن پر آنا بھی یقینی تھا۔

طرح طرح کے وسوسے میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے رات بڑی آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ لڑکی کو ساتھ لے کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کسی اگلے سٹیشن پر بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرتا ہوں۔ اس سٹیشن پر بیٹھنا خطرناک ہے۔ پھر

خیال آیا کہ رات کا وقت ہے۔ راستے میں جنگل پڑتا ہے۔

راستہ میرا دیکھا ہوا بھی نہیں ہے۔ کہیں اس طرف سے ان لوگوں میں سے کوئی نکل نہ آئے۔ ان ہی خیالات میں گم میں لڑکی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ پلیٹ فارم کا جائزہ میں لے رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر جہاں سٹیشن کے آفس کا دروازہ تھا' اس کے اندر سے دو آدمی باہر نکلے۔ ان میں سے ایک شاید قلی تھا۔ اس نے کوئی بکسا سر پر اٹھا رکھا تھا۔

دوسرا اسٹیشن ماسٹر یا اس کے دفتر کا کوئی کلرک وغیرہ تھا۔ قلی نے بکس پلیٹ فارم پر آگے جا کر رکھ دیا۔ دوسرا آدمی واپس دفتر میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور آدمی نمودار ہوا۔ ایک جگہ پلیٹ فارم پر ریلوے کی پٹڑی کا ایک ٹکڑا لٹک رہا تھا۔ اس کے پاس آ کر اس نے لوہے کی موٹی سلاخ سے اسے بجانا شروع کر دیا۔ یہ گھنٹی اس بات کا اعلان تھا کہ ٹرین آنے والی ہے۔

میں نے تھوڑا سکھ کا سانس لیا۔ لیکن ابھی رات کا وقت تھا۔ کلکتے جانے والی ٹرین کو صبح جانا تھا۔ میں نے رانی سے کہا کہ میں اس آدمی سے جا کر پتہ کرتا ہوں کہ اس وقت کون سی گاڑی آ رہی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ گاڑی کلکتے سے آ رہی ہو۔ لڑکی نے سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف منہ کیا اور بولی۔

"دیر نہ لگانا۔"

میں نے کہا۔ "میں ایک منٹ میں واپس آ جاؤں گا۔"

گھنٹی بجانے والا آدمی چلا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر جو آدمی بکس لایا تھا وہ بکس کے اوپر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"کلکتہ ایکسپریس آ رہی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ کلکتہ جانے والی گاڑی ہے؟"

اس نے کہا۔ "ہاں بابو' یہ کلکتے جانے والی گاڑی ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو سنا تھا کہ صبح کو آتی ہے۔"

وہ بولا۔ "تم نے غلط سنا ہے۔ کلکتہ ایکسپریس اسی وقت آتی ہے۔ آج یہ رائٹ

ئم پر آ رہی ہے۔"

میں جلدی جلدی چلتا لڑکی رانی کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ گاڑی آ رہی ہے۔ ں خاموشی سے اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے ٹکٹ تو لیے ہیں۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"میں ٹکٹ لے آؤں۔ تم یہیں رہنا۔"

اور تیز تیز قدموں سے چلتا باہر بکنگ آفس کے پاس آ گیا۔ بکنگ آفس کی کھڑکی کھلی تھی۔ اندر بتی جل رہی تھی۔ میں نے کلکتے تک کے تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ لیے اور اپس آ کر ایک ٹکٹ رانی کو دے دیا۔ "اسے سنبھال کر رکھنا۔"

وہ ڈری ہوئی آواز میں بولی۔ "پجاری لوگ تو نہیں ہیں؟"

میں نے اسے تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی تک سب خیر خیریت ہے۔ پلیٹ فارم ابھی تک خالی پڑا تھا۔ وہاں سوائے ہم لوگوں کے اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد زور سے ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز آئی۔ میں نے خوش ہو کر لڑکی سے کہا۔

"گاڑی آ گئی ہے۔ ابھی بیٹھی رہو۔"

تھوڑی دیر بعد کلکتہ ایکسپریس آ کر پلیٹ فارم پر رک گئی۔ ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں رانی کو لے کر تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ اکثر مسافر جن میں عورتیں بھی تھیں' سو رہے تھے۔ میں کھڑکی میں سے برابر باہر پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹرین بمشکل دو تین منٹ رکی ہوگی۔ گارڈ نے سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی۔ جب ٹرین کافی آگے نکل گئی اور اس کی رفتار بھی تیز ہوگئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا کہ ٹرین کلکتے کے سٹیشن میں داخل ہوگئی۔ میں لڑکی کو لے کر سٹیشن سے باہر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے۔ میں تمہیں تمہارے ماتا پتا کے پاس پہنچانا چاہتا ہوں۔"

لڑکی نے مجھے کسی محلے کا نام بتایا جو میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"رکشے والے کو یہ پتہ بتا دینا۔"

باہر آ کر ہم نے ایک موٹر رکشا لے لیا۔ لڑکی نے بنگلہ زبان میں رکشے والے کو اپنے علاقے کا پتہ بتایا۔ رکشا چل پڑا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ جب ہمارا رکشا شہر کے ایک دوردراز غریبانہ سے گنجان آباد محلے میں داخل ہوگیا۔ لڑکی نے رکشے والے کو اپنی زبان میں ایک طرف چلنے کو کہا۔ ایک جگہ بوسیدہ سی جھونپڑیاں ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک جھونپڑے میں لڑکی کے ماں باپ رہتے تھے۔ لڑکی دوڑ کر اپنی جھونپڑی میں گھس گئی۔ اندر سے لڑکی کے اونچی اونچی رونے کی آواز آنے لگی۔

میں رکشے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بیمار سا آدمی باہر نکلا اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور بنگلہ زبان میں جھک جھک کر میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ لڑکی بھی جھونپڑی کے دروازے میں ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتی آن کھڑی ہوئی۔ میں نے کہا۔

''رانی کو اب کچھ روز باہر نہ نکلنے دینا۔'' یہ کہہ کر میں رکشے میں بیٹھ گیا اور اسے چت پور روڈ کی طرف چلنے کو کہا۔ سراج بلڈنگ میں آ کر جب میں نے جان کو اپنا سارا ایڈونچر سنایا تو وہ حیرت کی تصویر بنا میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

''اس بار تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ مگر آئندہ ایسی حماقت کبھی نہ کرنا۔ تم یہاں کے پجاری لوگوں کو نہیں جانتے۔ لکشمی دیوی کی بھینٹ کا معاملہ ان کے دھرم کا معاملہ ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ خود بھی سلامت واپس آ گئے۔ یہاں کرسوٹولہ سٹریٹ میں لکشمی دیوی کا مندر ہے۔ خدا کیلئے اس مندر کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''یار ان باتوں کو چھوڑو اور مجھے ناشتہ کراؤ۔ کل سے بیٹھے چنے کھا رہا ہوں۔''

جان ایک پرانے رجسٹر پر کچھ حساب کتاب لکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''میں نے تو ناشتہ کر لیا ہے۔ تم نیچے جا کر ناشتہ کر آؤ۔''

سراج بلڈنگ کی دکانوں میں ایک چھوٹا سا بنگلہ ریستوران تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر ناشتہ کیا اور پان والے کی دکان پر آ گیا۔ میں کبھی کبھی یونہی شوقیہ سگریٹ پی لیا کرتا

تھا۔ اس وقت میرا سگریٹ پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں نے قینچی کا ایک سگریٹ لیا اور وہیں کھڑے ہو کر سگریٹ پینے لگا۔

پان والے کی دکان پر ریڈیو لگا ہوا تھا اور بنگلہ گیت گائے جا رہے تھے۔ سڑک پر سے ٹرام گزر گئی۔ میں اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ پان سگریٹ والے نے دکان میں اگر بتیاں سلگا رکھی تھیں۔ میں وہیں ایک طرف کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔ میرے قریب ہی ایک کالے رنگ کا دبلا پتلا بنگالی بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر بیڑی پی رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر میری نگاہ اس پر پڑی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ سگریٹ ختم کر کے میں نے اسے سڑک پر پھینکا اور واپس جانے کیلئے مڑا تو میں نے دیکھا کہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا بنگالی مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔

اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے بھی اسے غور سے دیکھا تو اسے پہچان لیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب میں اچھوت لڑکی رانی کو اس کے ماتا پتا کے حوالے کر کے واپس جانے لگا تھا تو یہ بنگالی جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میں نے اسے محض ایک اتفاق خیال کیا اور اس کا خیال دل سے نکال دیا اور اپنے دوست جان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

جان اس وقت سلولائیڈ کے چھوٹے چوکور ٹکڑے جوڑ جوڑ کر ایک ڈبے میں رکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''یار مجھے بے حد نیند آ رہی ہے۔ ساری رات کا جاگا ہوا ہوں۔ میں تو سونے لگا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''سو جاؤ' سو جاؤ۔''

میں دیوار کے ساتھ جو پرانی چارپائی بچھی رہتی تھی اس پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ شام ہو رہی تھی جب جان نے مجھے جگایا۔ کہنے لگا۔

''اٹھو یار! باقی رات کو سونا۔''

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرے لیے اتنی گہری نیند سونا کس قدر ضروری تھا۔ میں بالکل تازہ دم تھا۔ جان نے کہا۔

''میں زکریا سٹریٹ چچا کے پاس جا رہا ہوں۔ انہیں پچھلے پندرہ دنوں کا حساب لکھوانا ہے۔ مجھے وہاں دس بج جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس بھوت بنگلے میں اکیلا بیٹھ کر کیا کروں گا۔''

وہ بولا۔ ''پیراڈائز ٹاکیز میں مار دھاڑ کی انگریزی فلم لگی ہے' وہ دیکھنے چلے جاؤ۔ وقت بھی گزر جائے گا اور تمہاری تفریح بھی ہو جائے گی۔''

مجھے اس کی یہ تجویز پسند آئی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

اس وقت پہلے شو کا ٹائم ہو رہا تھا۔ میں پیراڈائز سینما کی طرف اور جان زکریا سٹریٹ کی طرف چل دیا۔ سینما ہاؤس ٹرام کار کی روٹ میں تھا اور ہماری بلڈنگ سے دور تھا۔ میں سراج بلڈنگ سے نکل کر سامنے والے ٹرام کار کے سٹاپ پر کھڑا ہو گیا۔ دو تین اور لوگ بھی کھڑے تھے۔

اتنے میں ایک ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی والی عورت بھی آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس عورت نے اپنے بالوں کے جوڑے میں رجنی گندھا کے پھول لگا رکھے تھے۔ اس کا رنگ عام بنگالی عورتوں کی طرح سانولا نہیں تھا بلکہ کھلتا ہوا گورا رنگ تھا۔ میں نے اسے ایک عام نظر سے دیکھا اور جیسے اسے بھول گیا۔ اتنے میں ٹن ٹن کی آواز پیدا کرتی ٹرام آ کر ہمارے قریب رک گئی۔ میں بھی اس میں سوار ہو گیا۔

نیلی ساڑھی والی عورت بھی سوار ہو گئی۔ میرے ساتھ والی سیٹ خالی دیکھ کر وہ میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی مجھے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو آئی۔ اس زمانے میں یہ پرفیوم بڑا پاپولر تھی اور اس کی نیلے رنگ کی شیشی ہوا کرتی تھی۔ اس عورت نے بھی یہی پرفیوم لگا رکھی تھی۔ اس کا جسم کسی وقت چلتی ٹرام کے ہلکے ہلکے ہچکولوں میں میرے ساتھ لگ جاتا تھا۔ پہلی بار ٹرام کے موڑ کاٹتے ہوئے اس کا جسم میرے ساتھ لگا تو

وہ ذرا پیچھے ہٹ گئی اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سوری۔''

پیراڈائز سینما کے سٹاپ پر ٹرام رکی تو میں جلدی سے نیچے اتر گیا کیونکہ ٹرام زیادہ دیر نہیں رکا کرتی تھی۔ لوگ چلتی ٹرام کار میں بھی چڑھ جایا کرتے تھے۔ پیراڈائز سینما میں کافی رش تھا۔

میں عام طور پر سیکنڈ کلاس میں بیٹھتا تھا کیونکہ سیکنڈ کلاس سینما کی سکرین یعنی پردہ سیمیں سے نہ تو زیادہ دور ہوتی تھی اور نہ اتنا قریب ہوتی تھی کہ سر اٹھا کر فلم دیکھنی پڑے۔ سیکنڈ کلاس کی بکنگ پر بھی قطار لگی تھی۔ میں نے قطار میں کھڑے ہو کر ٹکٹ خریدا اور سینما ہال میں آ کر درمیان والی کرسیوں کی قطار میں بیٹھ گیا۔

ہال تقریباً خالی پڑا تھا۔ اس سینما ہاؤس کا ہال بہت بڑا تھا۔ یہ بھی کسی زمانے میں تھیٹر ہوا کرتا تھا اور یہاں آغا حشر کاشمیری کے سٹیج ڈرامے ہوا کرتے تھے۔ اتنے بڑے ہال میں لوگ آنا شروع ہو گئے۔ بعض مرد اپنے بال بچوں کو لے کر آئے ہوئے تھے۔ شو ٹھیک ساڑھے چھ بجے شام شروع ہو جاتا تھا۔

پہلی گھنٹی بج چکی تھی۔ تیسری گھنٹی بجنے کے بعد ہال کی بتیاں گل کر دی جاتی تھیں اور سکرین پر کمرشل یا آنے والی فلموں کی سلائیڈیں آنا شروع ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد آنے والی فلموں کے نمونے دکھائے جاتے تھے اور پھر فلم شروع ہو جاتی تھی۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اچھوت لڑکی رانی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خدا نے اس کی زندگی لکھی ہوئی تھی اور بچ گئی ورنہ اس کا ان ظالموں کی قید سے بچ کر نکل آنا ناممکن تھا۔ تیسری گھنٹی بجی اور سینما ہال کی بتیاں ایک ایک کر کے گل ہو گئیں۔ ہال میں اندھیرا ہو گیا اور سکرین پر سلائیڈیں دکھائی جانے لگیں۔

مجھے ان میں سے دو سلائیڈیں یاد رہ گئی ہیں۔ ایک سلائیڈ اس زمانے کے مشہور ملٹ ساز ادارے جے پی منگا رام کے بسکٹوں کی سلائیڈ تھی اور دوسری لپٹن چائے کی سلائیڈ تھی۔ سلائیڈیں انگریزی اور بنگلہ زبان میں تھیں۔ اتنے میں کوئی میرے ساتھ والی خالی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور سلائیڈ پر لکھی ہوئی انگریزی پڑھتا

رہا۔ اچانک مجھے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو آئی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ سکرین پر سلائیڈوں کی چمک کی وجہ سے ہال میں ہلکی چاندنی کی طرح کی روشنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔

دھیمی چاندنی کے اس غبار میں، میں نے اپنی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کو پہچان لیا۔ یہ وہی رجنی گندھا کے جوڑے والی عورت تھی جو ٹرام میں میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ عجیب اتفاق ہے۔ یہ عورت ٹرام کار میں بھی میرے ساتھ بیٹھی تھی اور سینما ہاؤس میں وہی میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچا اور اپنی نظریں پردہ سیمیں یعنی سکرین کی طرف کر لیا۔ سکرین پر اب آنے والی فلموں کے نمونے دکھائے جا رہے تھے۔

◆......◆......◆

مجھے یاد ہے ان نمونوں میں ڈائریکٹر محبوب کی مشہور زمانہ فلم ''روٹی'' کا بھی نمونہ تھا جس کی ہیروئن اختری بائی فیض آبادی تھی۔ نمونوں کے بعد انگریزی فلم شروع ہو گئی۔ اس زمانے میں بمبئی، کلکتہ اور مدراس ایسے بڑے شہروں کی ریل گاڑیوں اور سینما ہالوں کی سیکنڈ کلاس اور انٹر کلاس میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے۔ ریل گاڑیوں کی تو تھرڈ کلاس میں بھی مرد عورتیں اکٹھے بیٹھتے تھے۔ اس بات کو ہرگز معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کو بڑا نارمل سمجھا جاتا تھا۔

میرا مزاج بھی اس زمانے کا مزاج تھا اور میں نے بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی کہ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ ہاں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کیسا اتفاق ہے کہ جو عورت ٹرام کار میں میرے ساتھ بیٹھی تھی وہی عورت سینما ہال میں میرے ساتھ بیٹھی ہے۔ پھر میں بھی اسے ایک اتفاق سمجھ کر بھول گیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا تھا۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ جاسوسی فلم تھی۔ اس کا آغاز بھی بڑے حیرت انگیز انداز میں ہوا تھا۔ میں فلم دیکھنے میں محو تھا میرا دایاں ہاتھ سیٹ کے بازو پر تھا۔ عورت کا ہاتھ ساتھ والی سیٹ کے بازو پر تھا۔ اچانک میں نے اپنے ہاتھ پر عورت کے ہاتھ کی دو انگلیاں محسوس کیں۔ میں نے ذرا مڑ کر دیکھا۔ عورت نے جلدی سے انگلیاں ہٹا لیں۔

مجھے عورت کی یہ حرکت بڑی عجیب اور غیر معمولی لگی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ عورت باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت ایسا کر رہی ہے۔ کچھ وقت خاموشی سے گزر گیا۔ اس

کے بعد عورت نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا۔ میرا ہاتھ سیٹ پر جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ میرے جسم میں عجیب قسم کا ہیجان سا پیدا ہونے لگا۔ میں نے عورت کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس کے بعد اس عورت نے اس قسم کی کوئی حرکت نہ کی۔
جب انٹرول ہوا تو عورت نے میری طرف دیکھ کر ہلکے سے تبسم کے ساتھ بڑی صاف اردو میں کہا۔ ''بڑی دلچسپ فلم ہے۔''

میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

میں عورت سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ مجھے یوں شرم سی محسوس ہو رہی تھی جیسے مجھ سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہو گئی ہو مگر وہ عورت مجھے مسلسل دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی کشش تھی' یا مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ عورت مجھے اپنے طلسمی حلقے میں لے رہی ہے۔ کہنے لگی۔

''تم بنگال کے نہیں لگتے۔ پنجاب سے آئے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں' پنجاب کے شہر امرتسر سے آیا ہوں۔''

اب وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''میں تمہارا رنگ' روپ دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ تم پنجابی ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ کہنے لگی۔

''تم مسلمان ہو۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ میرا نام نسیمہ ہے۔ دلی میں ہمارا گھر ہے۔ میں دلی کے اندرا پرستھا کالج میں لیکچرار ہوں۔ آج کل ہندو دھرم پر ریسرچ ورک کر رہی ہوں۔ اس سلسلے میں بنگال کے مندروں کا جائزہ لینے آئی ہوں' میں یہاں لڑکیوں کے ایک ہوسٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔''

میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ مسلمان ہو کر ہندو دھرم پر ریسرچ کیوں کر رہی ہے۔ مجھے اس وقت اتنا شعور ہی نہیں تھا۔ دوسرے مجھے اس سے اتنی زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی۔ پھر اس نے خود ہی کہا۔

''جب میں نے تمہیں ٹرام کار کے سپاٹ پر دیکھا تو پتہ نہیں کیوں تم مجھے بڑے

اچھے لگے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے بھی آج پیراڈائز میں فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

میں نے اسے بتا دیا کہ میں لوئر چت پور روڈ پر اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہ بات مجھے اسے نہیں بتانی چاہیے تھی مگر ایک تو وہ میری جوانی کا زمانہ تھا جب آدمی پر جذبات کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے میں شروع ہی سے بہت زیادہ جذباتی تھا۔ ہاف ٹائم ختم ہو گیا۔ ہال میں اندھیرا ہو گیا اور فلم دوبارہ شروع ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد اس عورت نے ایک بار پھر میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے ہاتھ پیچھے کرنا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک بار تو مجھے پسینہ آ گیا۔ فلم ختم ہوئی تو سینما ہاؤس سے باہر آ کر اس عورت نے مجھ سے کہا۔

''چلو کہیں چل کر کافی پیتے ہیں۔''

میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس وقت میرا بھی اس کے ساتھ کافی پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ بس یونہی وہ عورت مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ ایسے حالات میں تو عقلمند سے عقلمند آدمی بھی ایک بار چکر کھا جاتا ہے اور میرے اندر تو عقل کی پہلے ہی بہت کمی تھی اور صرف جذبات ہی جذبات تھے جو اس عمر میں آگ ہوتے ہیں۔

بوندا باندی بھی شروع ہو گئی جس نے ماحول کو اور زیادہ رومانٹک بنا دیا۔ ہم ٹیکسی رکشے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ بولی۔

''ریستوران کو چھوڑو۔ ہوسٹل چلتے ہیں وہاں ایک مہمان کو ساتھ لانے کی اجازت ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر تمہیں پلاؤں گی۔''

میں پہلے ہی رومانوی فضا میں اڑ رہا تھا۔ اس نے یہ بات کہی تو پرواز کچھ اور بلند ہو گئی اور میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔

نسیمہ اپنے ساتھ ایک بڑا تھرمس اور پک نک کی چوکور ٹوکری بھی لائی تھی۔ کہنے لگی کہ میں نے اس میں کافی چکن سینڈوچز بنوا کر رکھ لیے ہیں۔

''ہم دوپہر کا کھانا تو چندر نگر کے کسی ریستوران میں کھائیں گے' یا پھر دریا

کنارے بیٹھ کر اپنے لائے ہوئے سینڈوچز سے لنچ کریں گے۔کیا خیال ہے؟''

میں نے کہا۔

''ہم دریا کنارے بیٹھ کر ہی لنچ کریں گے۔ ریستوران میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' اس نے کہا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ کہنے لگی۔ ''آج میں بڑی خوش ہوں کہ تمہارے ساتھ سارا دن گزاروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے زیادہ خوشی ہو رہی ہے۔''

وہ ہنس کر بولی۔ ''یہ تو سیتا بن کے جنگل میں پہنچنے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ ہم میں سے کون زیادہ خوش ہے۔''

اس جملے کے پیچھے جو پوشیدہ معنی چھپے ہوئے تھے میں انہیں بالکل نہ سمجھ سکا۔ اس وقت میں سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں صرف سمندر کی پرسکون سطح کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے نیچے جو طوفانی موجیں چھپی ہوئی تھیں ان کی مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ سٹیشن پر آ کر پتہ چلا کہ ٹرین دو گھنٹے لیٹ ہے۔ ہم پلیٹ فارم پر ہی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ ویٹنگ روم وہاں سے کچھ فاصلے پر تھے۔ ہم اس طرف نہ گئے۔ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ نسیمہ نے گہرے کاسنی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آج اس نے ماتھے پر بندی بھی لگائی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

''نسیمہ! تم تو مسلمان ہو۔ پھر ماتھے پر ہندو عورتوں کی طرح بندی کیوں لگائی ہے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔

''یہ تو یہاں کا فیشن ہے۔ میں محض فیشن کے طور پر کبھی کبھی لگا لیتی ہوں اور پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

اس نے پک نک باسکٹ میں سے پلاسٹک کے دو چھوٹے کپ نکالے۔ تھرمس میں سے ان میں چائے ڈالی اور ہم وہیں بیٹھے چائے پیتے رہے۔ یہ عورت آج مجھ سے

بڑی محبت کی باتیں کر رہی تھی۔ بار بار یہ جملہ دہراتی۔

''ہم ساری زندگی ایک دوسرے کے دوست رہیں گے اور دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرتے رہیں گے۔ مجھے دوستی بہت پسند ہے۔''

اس قسم کی محبت بھری باتوں میں وقت کے گزرنے کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ دو گھنٹے بھی گزر گئے۔ کلکتے کے مضافات میں جانے والی ٹرین تھی اس میں اتنا رش نہیں تھا۔ گھنٹے سوا گھنٹے میں ہم چندر نگر پہنچ گئے۔ اس وقت تک چندر نگر ابھی فرانسیسی نوآبادی ہی تھی اور اس چھوٹے سے شہر پر فرانس کا قبضہ تھا۔ ہم سٹیشن سے سیدھا دریا کے گھاٹ پر آ کر ایک جگہ درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ لنچ کا وقت ہو گیا تھا۔ نسیمہ نے ٹوکری میں سے سینڈوچز نکال کر مجھے بھی پلیٹ میں ڈال کر دیے اور خود بھی لے لیے۔ باسکٹ کے اندر اس نے پانی کی بھی ایک تھرمس رکھی ہوئی تھی۔ سینڈوچز اس نے بڑے مزے دار بنائے تھے۔ ہم نے خوب مزے سے لنچ کیا۔ دریا کی طرف سے بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر ادھر ادھر سے آ کر بادلوں کے ٹکڑے جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے نسیمہ سے کہا۔

''کہیں بارش نہ آ جائے۔''

اس نے بادلوں کو ایک نظر دیکھا اور کہا۔

''میرے خیال میں یہ بارش والے بادل نہیں ہیں۔ اور اگر بارش شروع ہو بھی گئی تو کوئی بات نہیں ہماری پک نک اور زیادہ رومانٹک ہو جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے مگر تم قدیم مندروں پر ریسرچ ورک نہیں کر سکو گی۔''

اس نے ہنس کر کہا۔ ''تم فکر نہ کرو مجھے بارش میں بھی کام کرنا آتا ہے۔''

جب ہم دریا پار کرنے کیلئے چندر نگر گھاٹ پر سے ایک بڑی کشتی میں بیٹھے تو آسمان پر کافی بادل جمع ہو چکے تھے اور دھوپ کسی وقت نکلتی تھی اور کسی وقت غائب ہو جاتی تھی۔ کلکتہ شہر میں بہنے والا دریائے جمنا عرف دریائے ہگلی بڑے سکون کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ کیونکہ ہوا معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ کشتی میں اور مسافر بھی بیٹھے تھے۔ دریا پار

پہنچنے کے بعد اس عورت نے ایک جانب جدھر درختوں کے جھنڈ تھے دیکھا اور بولی۔

''ٹھیک ہے ہمیں ان درختوں کی طرف جانا ہے۔ میں نے جو نقشہ دیکھا تھا اس میں ان درختوں کا جھنڈ صاف طور پر دکھایا گیا تھا۔''

ہم ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔

ہمارے اردگرد کافی گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہم ان کے درمیان میں سے ہو کر جا رہے تھے۔ آخر ہم درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گئے۔ پگڈنڈی اس جھنڈ میں سے گزر کر دوسری طرف جاتی تھی۔ آگے درخت زیادہ قریب قریب اگے ہوئے تھے اور بادلوں کی وجہ سے وہاں درختوں کے نیچے ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہ اندھیرا گہرے سائے کی مانند تھا۔ نسیمہ کہنے لگی۔

''ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔''

وہ مجھ سے آگے آگے چل رہی تھی، میں اس کے پیچھے تھا اور میں نے پک نک والی بانس کی چھوٹی ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔ پانی کا تھرمس ٹوکری کے اندر تھا اور چائے والا تھرمس نسیمہ نے اپنے کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

''یہاں سے سیتا بن کا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔''

ہم سیتا بن کے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل میں ہر قسم کے درختوں اور جنگلی بیلوں کی اور جنگلی پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم کافی دیر تک درختوں کے نیچے چلتے رہے۔ راستے میں ہمیں کوئی دیہاتی آدمی نظر نہ آیا۔

میں نے نسیمہ سے پوچھا۔

''کیا اس طرف کوئی گاؤں وغیرہ نہیں ہے؟''

وہ بولی۔ ''ایک گاؤں ہے مگر وہ مندر کے آگے ہے۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟''

اس نے رک کر مجھ سے پوچھا۔ میں نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔ ''بالکل نہیں، میں نے ایسے کئی جنگل دیکھے ہیں۔ بمبئی کی طرف جو جنگل آتے ہیں وہ اس سے زیادہ گھنے اور ڈراؤنے ہیں۔ میں نے ان میں کئی کئی دن گزارے ہیں۔''

نسیمہ نے میرے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''تم سچ مچ بڑے بہادر لڑکے ہو۔ میں نے کچھ سوچ کر ہی تمہیں اپنا دوست بنایا ہے۔ مجھے بہادر لڑکے بڑے پسند ہیں۔''

اور اس نے دوبارہ آگے آگے چلنا شروع کر دیا۔

راستے میں ایک جگہ چھوٹی سی برجی دیکھی جو ایک ٹوٹے پھوٹے چبوترے پر بنی ئی تھی اور خستہ حالت میں تھی۔ نسیمہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ اسی مندر کی ایک مڑھی ہے۔ ہم منزل کے قریب آ گئے ہیں۔''

ہم نے ایک چھوٹی سی ندی پار کی۔ ندی کے اوپر جھکے ہوئے درختوں نے ایک نگ سی بنا رکھی تھی ابھی تک ہمیں کوئی جنگلی جانور نہیں ملا تھا۔ درختوں پر کہیں کہیں کسی ندے کے بولنے کی آواز ضرور آ جاتی تھی۔ ایک پراسرار سی خاموشی چھائی ہوتی تھی۔ شاید دگی میں پہلی بار مجھے اس خاموشی سے ڈر سا آنے لگا۔ میری چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی اور ے آنے والے خطرات سے خبردار کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں اس عورت کے طلسم ے زیر اثر اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

ایک جنگلی بلا زور سے غراتا ہوا ہمارے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ میں ڈر کر رت کے ساتھ لگ گیا۔ عورت یعنی نسیمہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ڈر گئے؟''

میں جلدی سے الگ ہو کر بولا۔ ''بالکل نہیں۔''

وہ ہنس پڑی۔ ہم چلتے چلتے جنگل کے وسط میں ایک ایسی جگہ آ گئے جہاں ت اتنے قریب قریب ہو گئے تھے اور ان کے درمیان اتنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں کہ دشوار ہو رہا تھا۔ مگر وہ عورت اس طرح راستہ بناتے آگے آگے چلی جا رہی تھی جیسے اس پہلے سے یہ راستہ دیکھ رکھا ہو اور وہ کئی بار اس راستے سے گزری ہو۔ مجھے پک نک کی ی سنبھال کر ان جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ اس ن نہ جانے کیوں اچانک میرے دل میں خیال آ گیا کہ مجھے اس طرف نہیں آنا چاہیے

تھا۔

اس عورت نے شاید میرے چہرے سے میرے دل کے خوف کو پڑھ لیا تھا۔ ا
مجھے اپنے قریب کرتے ہوئے بولی۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنی منزل پر پہنچنے ہی وا
ہیں۔"

درختوں کا گھنا پن تھوڑا تھوڑا ختم ہو گیا اور اب مجھے ان کے درمیان ایک
پگڈنڈی بھی نظر آئی۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے درختوں کے نیچے ایک پرانے مندر ک
کھنڈر نما عمارت دیکھی۔ وہ عورت، یعنی نسیمہ، بڑی خوش ہو کر بولی۔

"لو ہم رام چندر جی کے قدیم مندر کے پاس آ گئے ہیں۔"

مندر کی عمارت ایک طرف سے بالکل ہی بیٹھ چکی تھی۔ جو دیواریں سلامت تھیں
ان کی بھی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں اور ان پر گھاس اگ رہی تھی۔ مندر کے
کھنڈر کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ سامنے کی جانب ایک شگاف سا بنا ہوا تھا۔ شاید وہاں کبھ
کوئی دروازہ ہوا کرتا ہوگا۔ جو اب غائب ہو چکا تھا اور دروازے کا صرف شگاف ہی با
رہ گیا تھا۔ اس کے بالکل سامنے پتھروں کو جوڑ کر ایک چبوترا سا بنایا ہوا تھا جس کے پتھ
بوسیدہ ہو چکے تھے اور ان کے درمیانی درزوں میں سے سوکھی گھاس باہر نکلی ہوئی تھی۔ نسیم
چبوترے پر جا کر بیٹھ گئی۔

کہنے لگی۔

"شکر ہے بھگوان۔"

میں نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا تو وہ ہنس کر بولی۔

"تم ضرور حیران ہو رہے ہو گے کہ میں نے مسلمان ہوتے ہوئے بھگوان کا نا
کیوں لیا؟ اصل میں بات یہ ہے کہ ہندو دیومالا پر کام کرتے کرتے مجھ پر اس کا تھوڑا تھو
اثر ہو گیا ہے اور کبھی کبھی میرے منہ سے خدا کی بجائے بھگوان کا لفظ نکل جاتا ہے۔"

میں نے تب بھی کوئی خیال نہ کیا اور پکنک کی ٹوکری رکھ کر چبوترے پر اس

میں بیٹھ گیا اور اپنے اردگرد جنگل کو اور کبھی سامنے عجیب و غریب خستہ حال مندر کے
ر کو تکنے لگا۔ ہم نے تھرمس میں سے پانی نکال کر پیا۔ کچھ سینڈوچز کھائے۔ میں نے
ے کی چھوٹی پیالیاں نکال کر چبوترے کے پتھر پر رکھیں تو وہ عورت بولی۔ "ایک منٹ
رو پہلے مجھے اس مندر کے گرد ایک چکر لگا کر اس کا جائزہ لے لینے دو۔ ویسے تو مجھے یقین
کہ یہ وہی مندر ہے جس پر مجھے ریسرچ کرنی ہے لیکن ایک بار اس کا جائزہ لینے سے میرا
دور ہو جائے گا۔ تم یہیں بیٹھے رہو۔"

وہ مجھے چبوترے پر بیٹھا چھوڑ کر مندر کے پیچھے چلی گئی۔

◆......◆......◆

ایک عجیب سناٹا ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ پہلے کسی پرندے کے بولنے کی آواز کسی وقت آ جاتی تھی اب وہ بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ کوئی پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔

دس پندرہ منٹ گزرنے کے بعد وہ عورت یعنی نسیمہ مندر کے کھنڈر کی دوسری طرف سے درختوں جھاڑیوں کے درمیان سے آتی نظر آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی' آ کر میرے پاس بیٹھ گئی' کہنے لگی۔

''میں نے تسلی کر لی ہے۔ یہ وہی مندر ہے' یہاں ایک پیالی چائے پیتے ہیں۔ اس کے بعد تم اسی جگہ بیٹھنا میں اس مندر کو اندر سے جا کر ایک نظر دیکھوں گی اور ضروری نوٹس لینے کے بعد ہم سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے واپس چل دیں گے۔''

میں تھرمس سے چائے نکال کر پیالیوں میں ڈالنے لگا۔ اس ویران سے جنگل میں چائے پینے کا بے حد لطف آیا۔ چائے بھی تھرمس میں پڑی رہنے کی وجہ سے ابھی تک گرم تھی۔ جب ہم ایک ایک پیالی چائے پی چکے تو اس عورت نے تھرمس کھولتے ہوئے کہا۔

''ایک ایک پیالی اور پینی چاہیے اس سے ہماری رہی سہی تھکان بھی اتر جائے گی۔''

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا کہ وہاں چائے نے واقعی بڑا مزہ دیا تھا۔ اور سفر کی تھکان کافی دور ہو گئی تھی۔ اس عورت نے اپنی پیالی میں چائے ڈالنے کے بعد میری پیالی

میں چائے ڈالی اور ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ ابھی میں نے چائے کے دو تین گھونٹ ہی پیے تھے کہ اس عورت نے چبوترے کے نیچے ایک طرف جھاڑیوں میں دیکھتے ہوئے میرا نام لے کر کہا۔

''وہ دیکھ رہے ہو؟''

وہ جھاڑیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔ میں بھی ادھر دیکھنے لگا۔ ''ادھر کیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''شاخوں میں ایک سرخ پھول کھلا ہوا ہے۔ یہ گل مہر کا پھول ہے۔ مجھے گل مہر کے پھولوں سے بڑی محبت ہے۔ پلیز میری خاطر وہ پھول مجھے لا دو گے؟''

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے پھول لانے کیلئے کہتی اور میں نہ جاتا۔ میں نے چائے کی پیالی وہیں رکھ دی اور چبوترے سے اتر کر جھاڑی کی طرف بڑھا۔ یہ گل مہر کے پھولوں کا پودا یا جھاڑی تھی۔ گل مہر کے پھول سرخ ہوتے ہیں اور اس کا جھاڑ چھ سات فٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔ میں نے سرخ پھول توڑا اور اسے لا کر نسیمہ کو دیا۔ وہ بڑی خوش ہوئی۔ اس نے پھول کو اپنے بالوں میں لگا لیا اور بولی۔

''تم سچ مچ بڑے بہادر ہو۔ تمہارے اندر ایک مرد کی ساری خوبیاں موجود ہیں' بھگوان نے چاہا تو......''

وہ ایک دم رک گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''آئی ایم سوری ڈیئر! میرے منہ سے پھر غلطی سے بھگوان کا نام نکل گیا۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ خدا نے چاہا تو ہماری دوستی ساری زندگی قائم رہے گی۔''

پھر اس نے میری چائے کی پیالی اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو اپنی چائے پیو' میں بھی اپنی چائے پیتی ہوں۔'' اور اس نے اپنی پیالی بھی اٹھا لی۔ ہم ایک ایک گھونٹ کر کے چائے پینے لگے۔ درختوں کے درمیان سے کہیں کہیں آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ دھوپ بالکل نہیں تھی۔ سورج بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ وہ عورت مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر بڑا بے معلوم سا تبسم تھا۔

میں نے چائے کا گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ ''تمہارا چہرہ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔''

وہ ہنسنے لگی۔ تم بھی مجھے بڑے اچھے لگتے ہو' میرے ساتھ دلی چلو گے؟ تم اب انکار نہیں کر سکتے تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ضرور چلوں گا۔''

میں بھی مسکرانے لگا تھا۔ مجھے اپنے اندر سرور کی ہلکی ہلکی سی لہر دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ جنگل میں اپنی دوست عورت کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے کا اثر تھا۔ لیکن چائے کے مزید تین چار گھونٹ پینے کے بعد اس سرور میں اضافہ ہو گیا۔ جب میں نے چائے کی پیالی خالی کر کے نیچے رکھی تو سرور کی یہ کیفیت ہلکے سے نشے کی حالت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ عورت بدستور میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

''تمہیں ضرور ہلکا ہلکا سرور محسوس ہو رہا ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔''

کہنے لگی۔ ''مجھے بھی ہو رہا ہے' یہ اس جنگل کی ہوا کی وجہ سے ہے۔ کہتے ہیں کہ سیتا بن کے تالاب کے کنارے جو اس مندر کی دوسری طرف ہے' ایسے درخت اگتے رہتے ہیں جن کی شاخوں اور پتوں سے نشے کے بخارات نکل نکل کر ہوا میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نشہ اس ہوا کی وجہ سے ہو رہا ہے۔''

لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ نشے یا سرور کی کیفیت میں نہیں تھی وہ بڑے سکون سے اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ میرا سر اس نشے کی کیفیت میں آہستہ آہستہ ڈولنے لگا۔ میں گھبرا گیا اور اس عورت سے کہا۔

''مجھے چکر آ رہے ہیں۔''

اس نے مجھے تھام لیا۔ کہنے لگی۔ ''اگر نیند آتی ہے تو سو جاؤ۔''

میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو رہی تھیں۔ میں نے انہیں کھلا رکھنے کی کئی بار کوشش کی مگر میں کامیاب نہ ہوا اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میرا دماغ ابھی تک گھوم رہا

تھا۔ بند آنکھوں کے اندر سفید دائرے گھوم رہے تھے یہ دائرے گھومتے گھومتے سفید سے نیلے ہو گئے' پھر سرخ ہو گئے' پھر غائب ہو گئے اور اندھیرا چھا گیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی مگر میں انہیں ہلا نہ سکا۔ میرا سارا بدن جیسے پتھر ہو چکا تھا۔ مگر بے ہوش اس طرح ہوا تھا کہ میرے کانوں میں اس عورت نسیمہ کی آواز برابر آ رہی تھی۔ وہ مجھے آہستہ آہستہ میرا نام لے کر پکار رہی تھی۔ ''کیا تم سو گئے ہو؟ تم میری آواز سن رہے ہو؟''

میری زبان بند تھی میں بول نہیں سکتا تھا اس عورت کا بھید مجھ پر کھل چکا تھا۔ اس نے مجھے چائے میں کچھ پلا دیا تھا۔ جب میں اس کیلئے گل مہر کا پھول لینے گیا تھا تو اس وقت اس نے میری پیالی میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔ مجھے اس کی آواز مدھم مگر پوری طرح سے سنائی دے رہی تھی۔

مجھے اس کے جسم کا' اس کے ہاتھوں کا لمس بھی محسوس ہو رہا تھا' مگر میں اپنے ہاتھ پیر ہلانے سے قاصر تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے مجھے چبوترے پر لٹا دیا ہے۔ اس کے بعد مجھے اس کے چبوترے سے اترنے کی آواز آئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ میں سوچنے لگا کہ وہ کہاں گئی ہو گی۔

میری سمجھ میں ابھی تک یہ معمہ نہیں آیا تھا کہ اس نے مجھے کس لیے بے ہوش کیا ہے اور وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایک مرد اور ایک عورت کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ آواز قریب آئی تو میں نے اس عورت نسیمہ کی آواز کو پہچان لیا' وہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لے آئی تھی۔ وہ میرے قریب آ کر باتیں کرنے لگے۔ نسیمہ نے کہا۔

''میں نے اپنا کام کر دیا ہے' اب آگے جو کچھ کرنا ہو گا تم لوگوں کو کرنا ہو گا۔''

مرد کی آواز آئی۔

''رانی اندو تم نے لکشمی میا کے دشمن کو ہمارے قدموں میں ڈال کر اپنا کرتوے کو پوری طرح نبھایا ہے اس کے بدلے لکشمی دیوی تمہیں جنم جنم کے چکر سے مکت کر دے گی۔''

تب مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ یہ عورت مسلمان نہیں تھی ہندو تھی اور اس کا نام رانی اندو تھا۔ اس کو ایک سازش کے تحت میری تلاش میں اور مجھے پکڑنے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ اندو رانی نے کہا۔ ''لکشمی میا تو مجھے جنم جنم کے چکر سے مکتی دلانے کا جو وردھان دے گی وہ میرے سوبھاگ ہیں لیکن تم لوگوں نے مجھے اس کے عوض دو ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا وہ بھی تمہیں پورا کرنا ہوگا۔''

مرد نے کہا۔ ''وہ صبح ہوتے ہی تمہارے گھر پہنچا دیے جائیں گے ابھی ہمیں لکشمی میا کے اس دشمن کو جس نے دیوی کی بھینٹ کو اس کے استھان سے چھینا تھا' یہاں سے بھدرگام کے جنگل والے مٹھ میں پہنچانا ہوگا جہاں بڑے پجاری جی کے آنے کے بعد اسے لکشمی میا کی مورتی کے آگے قتل کرنے کے بعد مورتی کو اس کے خون سے نہلانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم سب لکشمی دیوی کے سراپ (بددعا) سے بچ سکیں گے۔''

عورت نے کہا۔ ''تم اپنے آدمی بلا کر اسے یہاں سے لے جاؤ' میں یہاں سے واپس کلکتے درگا دیوی کے دریا کنارے والے مندر میں چلی جاؤں گی۔''

مرد نے کہا۔ ''ہمارا آدمی تمہیں وہیں آ کر صبح دو ہزار روپے دے جائے گا۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرو میں چھکڑا گاڑی اور اپنے آدمیوں کو لے کر آتا ہو۔ ہم نے سب کام تیار کر رکھا تھا۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ آدمی چلا گیا تھا' مکار عورت شاید میرے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ کسی کسی وقت مجھے اس کے آہستہ سے کھانسنے کی آواز آ جاتی تھی۔ پھر مجھے ایسی آواز آئی کہ وہ پیالیاں وغیرہ بانس کی ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔ میں بولنا چاہتا تھا' میں چیخ چیخ کر اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا ہے' مگر میری زبان بند تھی۔ میں صرف سن سکتا تھا۔ نہ بول سکتا تھا نہ ہاتھ پاؤں اور جسم کو ہلا سکتا تھا۔ مجھے اندھے جذبات میں بہہ جانے اور عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے کی سزا مل رہی تھی۔ میں نے صدق دل سے اللہ کے حضور دعا مانگی کہ یا اللہ پاک مجھے اس عذاب سے بچا لے۔ میں آئندہ کبھی ایسا گناہ نہیں کروں گا۔

مجھے چھکڑا گاڑی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی دو تین آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ چھکڑا گاڑی چبوترے کے پاس آ کر رک گئی جو مرد پہلے مکار عورت رانی اندو سے باتیں کر رہا تھا اس نے کہا۔ ''اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال دو۔''

دو تین آدمیوں نے مجھے اٹھایا اور چھکڑا گاڑی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد گاڑی چل پڑی۔ مجھے نہیں معلوم گاڑی کے آگے بیل جتا ہوا تھا یا گدھا' گاڑی آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتی ایک طرف چل پڑی۔ یہ لوگ مجھے وسطی جنگلوں میں کسی جگہ واقع بھدرگام کے کسی مٹھ میں لے جا رہے تھے جہاں مجھے کسی مورتی کے آگے قتل کر دینا تھا۔

◆......◆......◆

میں صرف سن سکتا تھا اس کے علاوہ مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ چھکڑا گاڑی کے ہچکولے محسوس ہوتے تھے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ گاڑی ابھی تک جنگل میں ہی جا رہی ہے۔ کتنی ہی دیر تک گاڑی چلتی رہی۔ پھر مجھے بارش کی آواز سنائی دینے لگی۔ بیل گاڑی کے اوپر کوئی ترپال وغیرہ ڈال کر مجھے شاید ڈھانپ دیا گیا تھا۔ یہ آواز بارش کی بوندوں کے ترپال پر گرنے کی تھی۔ ٹپاٹپ کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ بیل گاڑی کے پہیوں کی چرخ چوں بھی سنائی دے رہی تھی۔ کسی آدمی کے بولنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کچھ پتہ نہیں بیل گاڑی ایک گھنٹے تک چلتی رہی کہ دو گھنٹوں تک چلتی رہی۔ ایک جگہ پہنچ کر بیل گاڑی رک گئی۔ لاری کے ہارن کی آواز سنائی دی اور پھر ایسے لگا جیسے کوئی لاری بیل گاڑی کے پیچھے آ کر رک گئی ہے۔ دو تین آدمیوں کی کچھ فاصلے پر سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا کہ بیل گاڑی کسی ریلوے پھاٹک کے پاس آ کر رک گئی تھی جو بند تھا۔ کچھ دیر کے بعد ریل گاڑی کے شور مچا کر گزرنے کی آواز آئی۔ جب یہ آواز دور نکل گئی تو ریلوے پھاٹک کھلا گیا اور ہماری بیل گاڑی پھر سے چل پڑی۔

یہ سفر جہاں تک میرا اندازہ ہے پانچ چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ اب گاڑی کو بہت کم ہچکولے لگ رہے تھے اور وہ قدرے ہموار سڑک پر جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک مجھے لاریوں کے گزرنے کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور گاڑی کو ہچکولے لگنے شروع ہو گئے۔ گاڑی پھر کسی جنگل میں داخل ہو گئی تھی۔ میں نے دو تین بار کوشش کی کہ آنکھیں کھولوں مگر میرے پپوٹوں نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ میرا باقی کا جسم بھی اسی

طرح سن ہو چکا تھا۔ خدا جانے اس عورت نے مجھے چائے میں کیا پلا دیا تھا۔ میرا ذہن برابر کام کر رہا تھا اور میں سوچ بھی رہا تھا اور مجھے گزرے ہوئے سارے واقعات یاد بھی آ رہے تھے۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ میرے ذہن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں سو گیا ہوں کیونکہ باہر کی آوازیں سنائی دینی بند ہو گئی تھیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ میں کب تک سویا رہا۔ پوری رات سویا رہا کہ پورے دوسرے دن بھی سوتا رہا۔ جب میری سماعت واپس آئی اور میرا ذہن بیدار ہو گیا تو مجھے موٹر کے انجن کے چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ مجھے کسی موٹر کار یا جیپ میں ڈال کر کسی دوسری جگہ لے جایا جا رہا تھا۔ جیپ سڑک پر ہموار چل رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی پکی سڑک تھی۔ کافی دیر کے بعد جیپ ایک طرف کو مڑ کر شاید کچی سڑک پر تھوڑا اچھل اچھل کر چلنے لگی۔ یہ حالت پندرہ بیس منٹ تک رہی۔ اس کے بعد جیپ کی رفتار کافی ہلکی ہو گئی اور اسے کم ہچکولے لگنے لگے۔ میرے اوپر جو ترپال ڈالی ہوئی تھی اس کے ساتھ درختوں کی شاخوں کے ٹکرانے کی بھی آواز آ رہی تھی۔ شاید ہم ایک بار پھر کسی جنگل سے گزر رہے تھے۔

ترپال پر بارش کی رم جھم کی آواز رک گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بارش رک گئی تھی۔ گاڑی بہت دیر تک ہلکے ہلکے ہچکولوں کے ساتھ چلتی رہی۔ پھر وہ ایک جگہ رک گئی۔ یہاں کچھ اور آدمیوں کے بولنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ اتنی دیر میں مجھے وہ لوگ بیل گاڑی میں سے اٹھا کر کسی جگہ لے گئے۔ اتنا اندازہ ہوا کہ وہ کوئی زینہ اتر کر نیچے گئے تھے۔ شاید یہ کوئی قید خانہ تھا جہاں مجھے لا کر ایک چارپائی پر ڈال دیا گیا تھا۔ خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد مجھ پر بھی غنودگی سی طاری ہونا شروع ہو گئی۔ آہستہ آہستہ میری غنودگی گہری بے ہوشی میں تبدیل ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا میری نیند کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم کی طاقت واپس آ گئی ہے۔ میں ہاتھ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو میری آنکھیں بھی کھل گئیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی کی دیوار کے طاق میں دیا روشن تھا۔

سامنے ایک زینہ اوپر کو جاتا تھا۔ میں اٹھ کر زینے کی طرف جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ میرا ایک پاؤں چارپائی کے ساتھ زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ زنجیر لوہے کی تھی اور جہاں اس کا سرا چارپائی کے ساتھ بندھا تھا وہاں ایک تالا بھی لگا ہوا تھا۔ یعنی اگر میں زنجیر کو کھولنا بھی چاہوں تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سر کے چکر بالکل ختم ہو چکے تھے۔ جسم کی طاقت بھی واپس آ گئی تھی۔ اس مکار عورت نے مجھے چائے میں ملا کر جو سفوف پلایا تھا اس کے اثرات بالکل ختم ہو چکے تھے۔ اوپر سے کسی کے زینے پر سے اترنے کی آواز آئی۔ میں چارپائی پر سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ یہ دو آدمی تھے۔ ان کی رنگت کالی تھی۔ ایک نے ہاتھوں میں بندوق پکڑی تھی اور ایک قدم پیچھے تھا۔ دوسرے کے ہاتھوں میں تھالی تھی جس میں چاول تھے جن کے اوپر زرد رنگ کی دال ڈالی ہوئی تھی۔ اس آدمی نے کہا۔

''اٹھو' یہ کھا لو۔'' میں آہستہ سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے تھالی میرے ہاتھوں میں تھمائی اور بندوق والے آدمی کے ساتھ زینہ چڑھ کر چلا گیا۔ اوپر سے مجھے دروازے کے بند ہونے اور باہر سے تالا لگنے کی آواز آئی۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ یہ بھدرگام کا وہ جنگل ہے جہاں مجھے کسی دیوی کی مورتی کے آگے ہلاک کر کے مجھ سے لکشمی دیوی کی بھینٹ کو بھگا کر لے جانے کا بدلہ لے لیا جائے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ وہاں سے میرے لیے اپنی جان بچانا بہت مشکل اور دشوار ہے۔ صرف خدا ہی غیب سے میری مدد کا کوئی سامان پیدا کر سکتا تھا۔ بظاہر میرے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

وقت کا تو مجھے کوئی اندازہ تھا ہی نہیں۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ اس کوٹھڑی میں قید میں پڑے مجھے کتنے دن' کتنی راتیں گزر گئی تھیں۔ پھر ایک روز مجھے قید خانے کی کوٹھڑی سے نکال کر باہر لایا گیا۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ درخت ہی درخت تھے۔ درختوں کے اوپر آسمان پر دن کی روشنی گلابی ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ سامنے ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے موٹے تنے کی دونوں جانب مشعلیں روشن تھیں۔ درخت کے آگے چھوٹے سے چبوترے پر کسی دیوتا کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ مورتی کے آگے تیل کے تین چار دیے ایک تھالی میں جل رہے تھے۔ ایک پجاری یا مہنت ٹائپ کا موٹے پیٹ والا

دمی مورتی کے پاس بیٹھا خدا جانے کیا بولتا جا رہا تھا۔ مجھے پکڑ کر اس کے پاس لے جایا گیا۔ مہنت نے کہا۔

''اس کو بٹھا دو۔''

مجھے اس سے ایک گز کے فاصلے پر بٹھا دیا گیا۔ مہنت نے وہ تھالی جس میں یے جل رہے تھے اٹھائی' اپنی جگہ سے اٹھا اور کچھ الاپتے ہوئے تھالی کو میرے سر کے اوپر گھمانے لگا۔ دس بارہ مرتبہ میرے سر کے اوپر تھالی کو گھمانے کے بعد وہ مورتی کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور جو آدمی مجھے پکڑ کر لائے تھے ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اس کو لے جا کر بند کر دو۔ آدھی رات کے بعد چندرمان آکاش پر نکلے تو اس یچھ کو دیوی ماتا پر قربان کر دیا جائے گا۔''

میں نے دیکھ لیا تھا کہ مورتی کے آگے سنگ مرمر کا ایک بڑا پتھر رکھا ہوا تھا جس پر ایک کلہاڑی اور دو چھریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان چھریوں سے آدھی رات کے بعد مجھے بح کیا جانے والا تھا۔ انہیں دیکھ کر میرے اندر دہشت کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

مجھے تہہ خانے میں واپس لا کر کے چارپائی پر ڈال کر زنجیر سے باندھ دیا گیا۔ ونوں آدمی چلے گئے اور تہہ خانے کا دروازہ بند کر اسے تالا بھی لگا گئے۔ اس کا مطلب تھا لہ میری زندگی میں بظاہر چند ایک گھنٹے ہی باقی رہ گئے تھے۔ پہلے تو مجھ پر موت کا خوف اری ہو گیا اور میرا جسم ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر میں ہاتھ اٹھا کر خدا کے حضور دعا مانگنے لگا لہ یا اللہ پاک میرے گناہ معاف فرما دے۔ زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے۔ مجھ پر م فرما اور مجھے ان قاتلوں سے نجات دلا دے۔ دعا مانگنے کے بعد مجھے کچھ حوصلہ ہو گیا۔ یکن موت مجھے سامنے نظر آ رہی تھی۔ موت میرے سر سے ابھی ٹلی نہیں تھی۔

جیسے جیسے رات گہری ہوتی جا رہی تھی میرے اندر موت کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ دہ غیب سے اگر کوئی مدد آنے والی تھی تو اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ لیکن بظاہر میرے بچاؤ کی وئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ طاق میں دیا جل رہا تھا۔ کوٹھڑی میں موت کا سناٹا طاری ا۔ میں زنجیر سے بندھا چارپائی پر بیٹھا تھا۔ کسی بھی وقت موت کا فرشتہ زینے میں نمودار

ہو کر مجھے باہر مورتی کے سامنے لے جا کر ہلاک کر سکتا تھا۔ میں بے بسی کے عالم میں بیٹھ سامنے والی دیوار کو یونہی تکے جا رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے دیوار میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ میں نے اس پر نظریں جما دیں۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ شاید کوئی سانپ ہے جو جنگل میں سے اندر آ گیا ہے اور اب دیوار پر رینگ رہا ہے۔ حرکت کرتی ہوئی چیز نے ایک انسانی سائے کی شکل اختیار کر لی۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اچانک انسانی سایہ دیوار سے اتر کر زمین پر آ گیا۔ میں ڈر گیا کہ یہ کوئی آسیب ہے۔ جلتے ہوئے چراغ کی دھیمی روشنی میں سائے کے نقش صاف ہونے لگے اور پھر میں نے اس انسانی سائے کو پہچان لیا۔ یہ وہی میری ہمدرد بھٹکی ہوئی بدروح ترشنا تھی۔ آج وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا نہیں رہی تھی' خاموش تھی۔ وہ وہیں دیوار کے ساتھ کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر مجھے اس کی سرگوشی نما آواز سنائی دی۔ کہنے لگی۔

''جہاں میں کھڑی ہوں۔ میرے جانے کے بعد دیوار میں اس جگہ میں سے نکل جاؤ۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں کر سکتی۔ میں دیوتا کی مورتی کے منہ سے اس کا شکار چھین رہی ہوں۔ مجھے اس کی بددعا لگے گی۔ مگر میں تمہیں ان وحشی درندوں کے ہاتھوں مرتا نہیں دیکھ سکتی۔ میرے گناہوں میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو جائے گا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں تمہاری محبت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ترشنا میرے دیکھتے دیکھتے انسانی جسم سے سائے میں تبدیل ہو گئی۔ پھر یہ سایہ دیوار میں جذب ہو گیا۔ ترشنا جا چکی تھی۔ میں کچھ دیر ساکت سا ہو کر بیٹھا رہا۔ پھر خیال آیا کہ میرا ایک پاؤں زنجیر سے بندھا ہوا ہے میں اٹھ کر دیوار کے پاس کیسے جا سکتا ہوں۔ میں نے اپنا لوہے کی زنجیر میں جکڑا ہوا پاؤں ہلایا تو زنجیر میرے پاؤں میں سے نکل گئی۔ میرا پاؤں آزاد ہو چکا تھا۔

میں جلدی سے اٹھ کر دیوار کے پاس آ گیا۔ دیوار پتھر کی تھی۔ اس میں کوئی درز تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ پتھر کی طرح سخت تھی۔

ہیں اس میں سے کیسے گزر سکتا تھا۔ کہیں ترشنا نے میرے ساتھ سنگین مذاق تو نہیں کیا؟ کہیں رشنا کی جگہ یہ کوئی دوسری بدروح تو نہیں تھی۔ طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔

پھر سوچتا کہ اگر ترشنا نے میرے ساتھ مذاق کیا ہوتا تو وہ میرا پاؤں زنجیر سے آزاد نہ کرتی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے دیوار کو ٹٹولا۔ اس پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ اسے ندر کی طرف دبایا۔ دیوار پتھر کی طرح تھی۔ مجھے خیال آ گیا کہ ترشنا نے کہا تھا کہ جب یں چلی جاؤں تو تم دیوار میں سے گزر جانا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ گزرنے سے پہلے یوار کو ٹٹول کر ہاتھ لگا کر اسے دبا کر دیکھنا۔

میں نے دیوار میں سے گزرنے کی اداکاری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ زیادہ سے یادہ یہی ہو سکتا تھا کہ میں دیوار سے ٹکرا جاتا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار کی رف اس طرح بڑھا جیسے میں دیوار میں سے نہیں بلکہ کسی دروازے میں سے گزرنے والا ں۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ دیوار میں سے کیسے گزر گیا۔ یہ کوئی جادو ٹونہ ہی ہو سکتا ا۔ میں دیوار کے ساتھ بالکل نہیں ٹکرایا تھا۔ میں نے جو قدم بڑھایا تھا وہ دیوار میں سے یے گزر کر دوسری طرف چلا گیا جیسے دروازے میں سے گزرا ہو۔ میں نے آنکھیں بند یں۔ میں نے دوسرا' پھر تیسرا اور چوتھا قدم اٹھایا۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا میرے چہرے کو لگی میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ منظر بدل گیا ہے۔ جہاں مجھے لایا گیا تھا وہ جگہ نہیں ہے۔ میرے دائیں بائیں دو ٹیلے تھے جن کی ڈھلانوں پر اندھیرا چھایا ہوا ۔ ٹیلوں کے درمیان ایک تنگ سا راستہ بنا ہوا تھا۔ میں جتنی تیز چل سکتا تھا اس راستے پر ے لگا۔ میں اس خیال سے تیز چل رہا تھا کہ کہیں میرا اندازہ غلط نہ ہو اور یہ وہی جگہ نہ ہو اں میرے دشمنوں نے مجھے قید میں ڈال رکھا تھا۔ اگر یہ وہی جگہ تھی تو آس پاس کوئی نہ ئی مسلح پہرے دار ضرور موجود ہو گا۔ میں ٹیلوں کے درمیانی تنگ راستے میں سے نکل ا۔

میرے سامنے ایک مختصر سا کھلا میدان تھا۔ وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ جھاڑیاں جھاڑیاں تھیں۔ میں میدان میں سے بھی گزر گیا۔ آگے پھر اونچے اونچے درختوں کا

سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب میں کافی اندر نکل گیا اور کوئی آدمی میرے پیچھے نہ آیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ ترشنا نے اپنے طلسم کی مدد سے مجھے میری موت کے مقام سے نکال کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیا ہے۔ میں اندھیرے میں درختوں کے نیچے چلا جا رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ میری دائیں جانب اندھیرے میں جھاڑیاں حرکت کر رہی ہیں۔ میں نے رک کر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں چل پڑا۔ پھر مجھے میری بائیں جانب جھاڑیوں میں حرکت کا احساس ہوا۔ میں خوفزدہ ہو کر رک گیا۔ غور سے بائیں جانب دیکھا۔ وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ جھاڑیاں اندھیرے میں بالکل ساکت تھیں۔ میں پھر چلنے لگا۔ چند قدم چلا ہوں گا کہ اب مجھے اپنی دونوں جانب جھاڑیوں میں حرکت کا احساس ہوا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میری دونوں جانب کوئی میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

میرے جسم میں خوف و دہشت کی ٹھنڈی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ اتنے میں میرے دائیں جانب سے کسی نے بھاری مردانہ آواز میں پوچھا۔

''کدھر جا رہے ہو؟''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ دونوں جانب کی جھاڑیوں میں سے دو انسانی سائے نکل کر میرے سامنے آ گئے۔ وہ مجھ سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ اندھیرے میں مجھے ان کی لال آنکھیں انگاروں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ ایک نے پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

میں نے اتنی دیر میں اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ ایک دوست کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا۔ جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔ ان دونوں کی بندوقیں میں نے دیکھ لی تھیں جو انہوں نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ دوسرے آدمی نے کہا۔

''بائیں طرف مڑ کر ہمارے آگے آگے چلو۔ بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دیں گے۔''

موت کے منہ سے نکل کر موت کی جھولی میں گر گیا تھا۔ یہاں تھوڑی بہت بچنے

کی امید تھی۔ میں بائیں طرف مڑ کر درختوں میں چل پڑا۔ دونوں میرے پیچھے مجھ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر چلے آ رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے اندھیرے میں درختوں کے نیچے ایک لالٹین جلتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ لالٹین ایک کوٹھڑی کے باہر لٹکی ہوئی تھی۔ ایک جانب کچھ گھوڑے کھڑے تھے۔ ان آدمیوں نے مجھے کوٹھڑی کھول کر اندر دھکیلا اور دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ کوٹھڑی میں گھپ اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کی درزوں میں سے اندر آتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی میں مجھے کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی ایک خالی چارپائی نظر آئی۔ میں اس پر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں تقدیر مجھے کیا دکھاتی ہے۔

جو دو آدمی مجھے وہاں لائے تھے وہ چلے گئے تھے۔ باہر خاموشی تھی۔ پھر باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازے کی کنڈی کسی نے اتاری اور دروازہ کھول دیا۔ ایک آدمی لالٹین لیے کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اونچا لمبا بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی تھا جس کے کندھے سے بندوق لٹک رہی تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو مسلح آدمی تھے جو شاید اس کے باڈی گارڈ تھے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی نے میرے قریب آ کر مجھے گھور کر دیکھا اور رعب دار آواز میں پوچھا۔

''تم ایس پی مکند لال کے آدمی ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میں کسی مکند لال کو نہیں جانتا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ راستہ بھول کر ادھر آ نکلا۔ آپ کے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔''

مونچھوں والے آدمی نے اس آدمی کی طرف دیکھا جس نے لالٹین پکڑ رکھی تھی۔

وہ آدمی بولا۔ ''رانا جی یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ پولیس کا جاسوس ہے۔''

مونچھوں والے آدمی نے اس سے پوچھا۔ ''تو پھر اس کا کیا کریں؟''

◆......◆......◆

وہ آدمی کہنے لگا۔ ''اس نے ہمارا خفیہ ٹھکانہ دیکھ لیا ہے۔ اس کو مار ڈالتے ہیں۔''

مونچھوں والے رانا نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''اس کو بند کر کے پہرہ لگا دو۔ سویرے اس سے پوچھ گچھ کریں گے۔''

وہ مجھے کوٹھڑی میں بند کر کے چلے گئے۔ میں نے باقی رات کوٹھڑی کے اندر گزار دی۔ دروازے کی جھریوں میں سے دن کا اجالا اندر آنے لگا تو کسی نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ لال لال آنکھوں والا ایک آدمی اندر آیا اور مجھے پکڑ کر درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف لے گیا۔ وہاں وہی بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی جس کو رانا کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا ایک چارپائی پر بندوق ایک طرف رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کا گلاس تھا۔

اس میں شاید چائے تھی۔ وہ چائے پی رہا تھا۔ ایک آدمی بندوق اٹھائے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ جو آدمی مجھے پکڑ کر لایا تھا اس نے مجھے رانا کے سامنے زمین پر بٹھا دیا اور خود ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

دوسرے درختوں کی طرف سے کچھ آدمیوں کے بولنے کی کسی وقت آواز آ جاتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ڈاکو لوگ ہیں اور انہوں نے اس جنگل میں ڈیرا ڈال رکھا ہے اور یہ بڑی بڑی مونچھوں والا رانا ڈاکوؤں کا سردار ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''لڑکے صاف صاف بتا دو' تم کون ہو۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔''

میں نے ڈاکوؤں کے سردار رانا کو صاف صاف بتا دیا کہ میں اصل میں گھر سے بھاگ کر کلکتے آیا تھا۔ وہاں سے کچھ لوگوں نے مجھے اغوا کیا اور ایک جنگل میں لے آئے۔

وہ مجھے یرغمال بنا کر میرے رشتے داروں سے پیسہ وصول کرنا چاہتے تھے۔ آج شام میں موقع پا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اس وقت سے جنگل میں بھٹک رہا ہوں کہ کوئی راستہ باہر نکلنے کا مل جائے تاکہ میں ٹرین یا کسی لاری کو پکڑ کر واپس کلکتے چلا جاؤں۔''

ڈاکوؤں کے سردار نے پوچھا۔

''تم ہندو ہو کہ مسلمان؟''

میں نے کہا۔ ''میں مسلمان ہوں اور پنجابی ہوں۔''

ڈاکوؤں کا سردار خاموشی سے چائے پیتا رہا اور مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میرے بیان پر یقین آ گیا ہے۔ اپنے آدمیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ لڑکا بڑا چالاک لگتا ہے۔ مجھے یقین ہے اسے پولیس نے ہماری ٹوہ لگانے کیلئے بھیجا ہے۔''

اس کا آدمی کہنے لگا۔

''رانا جی! ہمیں تو پہلے ہی یقین تھا۔ حکم دیں' ابھی اس کو مار کر دبا دیتے ہیں۔''

رانا جی نے کہا۔

''ایسا کرو اسے لے جا کر بند کر دو۔ جس روز یہاں سے ڈیرہ اٹھائیں گے اس کو مار کر دبا دینا اور ایس پی مکند لال کو پرچی لکھ کر بھیج دینا کہ ہم نے تمہارے آدمی کو فلاں جگہ دبایا ہے' آ کر لاش لے جاؤ۔''

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک بار پھر موت میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس کوٹھڑی میں لا کر بند کر کے باہر پہرہ لگا دیا گیا۔ ایک آدمی مجھے کچھ کھانے کو دے گیا۔

انہوں نے مجھ پر اتنی مہربانی ضرور کی تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے تھے۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازے کی جھریوں میں سے باہر دیکھ لیتا تھا۔ باہر ایک کی بجائے دو مسلح ڈاکو چارپائیوں پر بیٹھے میری نگرانی کر رہے تھے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ صرف ایک خیال میرے دل کو تھوڑا سہارا دیتا تھا کہ شاید ترشنا کی بدروح میری مدد کو آ جائے لیکن وہ عین وقت پر آتی تھی۔ ہوسکتا ہے اس دفعہ اس کو پتہ ہی نہ چلے کہ میں کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ اس وقت آئے جب یہ لوگ مجھے مارنے کے بعد میری لاش کو زمین میں دفن کر رہے ہوں۔

باہر شام کا اندھیرا ہونے لگا۔ ایک آدمی کوٹھڑی میں آ کر مجھے کھانے کو دو روٹیاں اور اچار دے گیا۔ یہ سارے لوگ مسلح تھے اور چہروں ہی سے بڑے سفاک قاتل لگ رہے تھے۔ میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ کوٹھڑی کے چاروں طرف ڈاکو ہی ڈاکو چلتے پھرتے مختلف کام کرتے نظر آ رہے تھے۔

وہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ میں نے دروازے کی درزوں میں سے دیکھا کہ ڈاکو وہاں سے چلنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ گھوڑوں پر تھوڑا بہت سامان لادا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری موت کا وقت آن پہنچا تھا۔

ترشنا کی بدروح میری مدد کرنے ابھی تک نمودار نہیں ہوئی تھی۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتا کبھی اٹھ کر کوٹھڑی میں سے باہر دیکھنے لگتا۔ باہر اب رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ ایک دو درختوں کے نیچے لالٹین روشن ہو گئی تھیں۔ کوٹھڑی کے باہر والی لالٹین بھی روشن کر دی گئی تھی۔

کوٹھڑی کے آگے جو دو بانس کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں وہ بھی اٹھا لی گئی تھیں۔ اب باہر صرف ایک ڈاکو بندوق لیے ایک پتھر پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ کوٹھڑی کے آگے سے چھ سات گھوڑے جن پر سامان رکھا ہوا تھا گزر گئے۔ ان کے ساتھ ڈاکو چل رہے تھے۔

میری موت کا وقت آ گیا تھا۔ ابھی تک ترشنا کی بدروح میری مدد کو نہیں آئی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں موت کے خوف سے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ اتنے میں کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور دو ڈاکو اندر آ گئے۔ ایک ڈاکو بندوق پکڑے کھڑا رہا۔ دوسرے نے رسی سے میرے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے۔ وہ مجھے چلاتے ہوئے ایک طرف درختوں کے جھنڈ

کے پاس لے گئے۔ ایک ڈاکو نے بندوق تان لی۔ دوسرے نے مجھے حکم دیا۔

''یہاں بیٹھ جاؤ اور اپنے خدا کو یاد کرو۔'' میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔

میں بیٹھ گیا اور خدا کو یاد کر کے رونے لگا۔ مجھے نہیں پتہ پھر کیا ہوا اتنا یاد ہے کہ میں نے روتے ہوئے خدا کو اس طرح یاد کیا جیسے وہ میرے سامنے موجود ہو۔ ایک آسمانی بجلی سی چمکی' جھماکا سا ہوا اور میری آنسوؤں سے بھری آنکھیں چکاچوند ہو گئیں اور میرے حلق سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ میں یہی سمجھا کہ مجھ پر بندوق کا فائر ہوا ہے۔ میرا جسم صحیح سالم تھا' میں منہ کے بل پڑا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اب کوئی بجلی نہیں چمک رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے دونوں ہاتھ کھلے تھے۔ شروع رات کے تاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں میں نے دیکھا کہ دونوں ڈاکوؤں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔

میں نے سامنے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ میں سکول کی کھیلوں میں بڑا تیز دوڑا کرتا تھا۔ اندھیرے میں کچھ نظر آ رہا تھا' کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بے تحاشا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میں جھاڑیوں میں الجھ رہا تھا۔ سامنے آ جانے والے درختوں سے اپنے آپ کو بچا رہا تھا۔ ایک جگہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر بھی پڑا مگر میں رکا نہیں' دوڑتا چلا گیا۔

آگے ڈھلان آ گئی یہ ڈھلان ایک گہری گھاٹی میں اترتی تھی۔ میں گھاٹی میں اتر گیا۔ یہاں تاریکی زیادہ تھی مگر میں دوڑ رہا تھا۔ گھاٹی کے دونوں کنارے اونچے تھے۔ درمیان میں تنگ سا راستہ تھا جس میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں گھاس میں ایک طرف کو بھاگ رہا تھا۔

مجھے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ یہ گھاٹی آگے کہاں جاتی ہے اور میں کس طرف جا رہا ہوں۔ میرا کام جان بچا کر بھاگنا تھا اور میں بھاگ رہا تھا۔ ایک جگہ گھاٹی ختم ہو گئی۔ سامنے تھوڑی سی چڑھائی تھی میں چڑھائی چڑھ کر گھاٹی سے باہر نکل آیا۔

وہاں کالی سیاہ بڑی بڑی چٹانیں تھیں جو آڑی ترچھی زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ کوئی بالکل سیدھی کھڑی تھی، کوئی ٹیڑھی ہو رہی تھی اور کوئی زمین سے نکل کر کچھ دور جا کر واپس زمین میں چلی گئی تھی۔ ان کے درمیان پتھروں سے ٹکراتا چشمہ بہہ رہا تھا۔

چشمہ ایک ندی کی شکل میں تھا۔ اس کے بہتے پانی کی آواز آ رہی تھی۔ میں چشمے میں اتر گیا۔ پانی ٹھنڈا تھا اور میری پنڈلیوں تک تھا۔ میں چشمے میں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکل کر دوسرے کنارے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا، مجھے ہر لمحے ڈاکوؤں کا ڈر لگا ہوا تھا۔

مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ میرا پیچھا نہ کر رہے ہوں۔ میں کیسے ان کی گولیوں سے بچ گیا تھا؟ یہ میں آج بھی نہیں سمجھ سکا۔ میرا ایمان ہے کہ خدا نے مجھے بچا لیا تھا۔ بس اللہ کو میرے آنسو دیکھ کر مجھ پر رحم آ گیا تھا اور اس نے مجھے بچا لیا تھا۔ کیسے بچا لیا تھا اور وہ قیامت خیز بجلی کی چمک کیا تھی جس نے مجھے چکا چوند کر دیا تھا اور ڈاکوؤں کو غائب کر دیا تھا۔ یہ میں کوشش بھی کروں تو آپ کے آگے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میں خود اس راز کو نہیں سمجھ سکا، آپ کو کیا سمجھاؤں گا۔

خدا جانے میں اس خوفناک جنگل میں رات کی تاریکی میں کب تک اور کہاں تک بھاگتا اور کبھی تیز تیز چلتا چلا گیا۔ جب میرے پاؤں میں چلنے کی بالکل سکت نہ رہی اور ٹانگوں نے بھی جواب دے دیا تو میں ایک جگہ گر پڑا اور دیر تک اسی حالت میں سوکھی خشک گھاس پر پڑا رہا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

آسمان کی طرف دیکھا، تارے چمک رہے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان ظالموں سے میری جان بچا لی۔ اس کے بعد ارد گرد کا جائزہ لیا کہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ میرے سامنے کی جانب اب کوئی گھنا جنگل نہیں تھا زمین صاف تھی اور ستاروں کی روشنی میں ایسے لگ رہا تھا جیسے آگے کھیت ہی کھیت ہیں۔

میں ان کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ ان کھیتوں میں کہیں تو فصل کھڑی تھی اور کہیں کھیتوں میں ہل چلا ہوا تھا۔ میں اونچی فصل کی آڑ میں سامنے کی جانب چلا جا رہا تھا۔ میں

نے ایک جگہ کھڑی فصل کے ٹانڈوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ یہ کماد کا کھیت تھا۔ کماد یعنی گنے دیسی تھے جو پتلے ہوتے ہیں۔ وہ شبنم میں بھیگے ہوئے تھے۔

میں نے دو تین گنے اکھاڑے اور وہیں بیٹھ کر انہیں توڑ توڑ کر چوسنے لگا۔ تازہ میٹھے رس نے مجھے کافی حد تک پھر سے تازہ دم کر دیا۔ یقین کریں میں نے تین چار گنے ختم کر دیے۔ کسی طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، میں اٹھ کر چلنے لگا۔ میں کھیتوں کے درمیان چل رہا تھا تا کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے۔ چلتے چلتے اونچی فصل سے باہر نکلا تو سامنے دور دو تین روشنیاں ٹمٹماتی دکھائی دیں۔

ابھی تک مجھے یہ کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں کون سے علاقے میں آ گیا ہوں۔ جن ڈاکوؤں سے میں جان چھڑا کر بھاگا تھا وہ ہندی اردو بول رہے تھے، بنگلہ نہیں بول رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں صوبہ بنگال سے آگے نکل آیا ہوں اور بہار کے جنگلوں میں سے گزر کر آیا ہوں اور ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھ کر مجھے حوصلہ ہوا کہ میں انسانوں کی آبادی میں پہنچ گیا ہوں۔

میرا رخ ان روشنیوں کی طرف تھا کھیت ختم ہو گئے۔ آگے ایک ریلوے لائن آ گئی۔ ٹمٹماتی روشنیاں ریلوے لائن کی جانب ہی تھیں۔ شاید یہ کوئی ریلوے سٹیشن تھا۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا ریلوے لائن ایک طرف کو گھوم گئی تو سامنے سگنل کی سرخ بتی نظر آئی۔

میں تیز تیز چلنے لگا میں ایک چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ اس کے پلیٹ فارم پر تین چار بتیاں جل رہی تھیں۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ پلیٹ فارم کا ایک گیٹ تھا، میں گیٹ کے پاس خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ کوئی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ایک نیلی قمیض والا ٹرالی پر کچھ سامان لادے پلیٹ فارم پر نمودار ہوا۔ میں اٹھ کر اس کے پاس گیا اور پوچھا۔

"یہ کون سا سٹیشن ہے؟"

اس نے ٹرالی ایک طرف رکھ دی تھی اور اس میں سے سامان اتار رہا تھا۔ میرے

سوال پر میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ ''تمہیں کہاں جانا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''پنجاب جاؤں گا۔ کیا یہاں سے کوئی ٹرین پنجاب جاتی ہے؟''

وہ بولا۔ ''صبح چھ بجے ایک پسنجر میل جاتی ہے۔''

وہ خالی ٹرالی لے کر جس طرف سے آیا تھا اس طرف چلا گیا۔

مجھے اب ساری رات اس ویران پلیٹ فارم پر گزارنی تھی۔ مجھے یہ خوف تھا کہ ڈاکوؤں کا کوئی پتہ نہیں کہیں میری تلاش میں سٹیشن پر بھی نہ پہنچ جائیں۔ جس بنچ پر میں بیٹھا تھا اس پر بجلی کے کھمبے کی روشنی پڑ رہی تھی۔

میں وہاں سے اٹھ کر پلیٹ فارم کے دوسرے سرے کی طرف چلا گیا۔ وہاں تھوڑا اندھیرا تھا۔ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ شام کو ڈاکوؤں نے مجھے کچھ کھلا پلا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ قریب ہی ایک نلکا تھا۔ میں نے اٹھ کر پانی پیا۔ منہ دھویا اور بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔

اگرچہ موسم سردیوں کا نہیں تھا لیکن رات کو خنکی ہو گئی تھی اور مجھے تھوڑی تھوڑی سردی لگنے لگی تھی۔ میں نے ٹھنڈی پتلون اور قمیض پہنی ہوئی تھی۔ میرے پاس کوئی پیسہ بھی نہیں تھا۔ میں سٹ سمٹا کر بنچ کے کونے میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ کب دن چڑھے گا اور کب پنجاب جانے والی ٹرین آئے گی۔ سٹیشن کا نام عجیب سا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔

یہ صوبہ بہار کا علاقہ ہی تھا۔ وہاں سے پنجاب کافی دور تھا۔ لیکن ایک بار ٹرین میں بیٹھنے کی دیر تھی، پھر امرتسر تک میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ صرف ایک ہی خطرہ تھا کہ میں بغیر ٹکٹ سفر کروں گا۔ راستے میں پکڑا گیا تو ٹی ٹی مجھے وہیں ٹرین سے اتار دے گا۔

میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر ٹی ٹی ٹرین سے اتار دے گا تو میں کوئی دوسری ٹرین پکڑ لوں گا۔ واپس کلکتے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب تو کسی نہ کسی طرح میں اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ ویران پلیٹ فارم کی رات بڑی آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ کسی وقت تو ایسے لگتا کہ جیسے رات گزر ہی نہیں رہی۔ ویران پلیٹ فارم پر آ کر وہ بھی رک گئی

ہے۔

ٹھنڈ لگتی تو میں اور زیادہ سمٹ جاتا۔ کسی وقت اٹھ کر بنچ کے پیچھے اندھیرے میں ٹہلنے لگتا۔ وقت تو گزر ہی رہا تھا، صرف مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے وہ رک گیا ہے۔ رات بھی وقت کے ساتھ گزر رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر کوئی گھڑی بھی نہیں لگی ہوئی تھی کہ جس سے اندازہ ہوتا کہ رات کا کیا بج رہا ہے۔

بے چینی اور کوفت کی وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ بنچ پر دبک کر بیٹھے بیٹھے کسی وقت مجھے نیند بھی آ جاتی لیکن سردی لگنے سے کچھ دیر بعد ہی آنکھ کھل جاتی۔ بڑی مشکل سے آسمان پر پھیلی ہوئی تاریکی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ میں نے آسمان کے مشرق کی جانب نگاہ ڈالی۔ وہاں آسمان کے کناروں پر نیلاہٹ سی جھلکنے لگی تھی۔ یہ صبح کے آثار تھے۔ یہ نیلاہٹ بڑے بے معلوم انداز میں سفیدی مائل ہونے لگی۔ آسمان پر سورج نکلنے سے بہت پہلے کا نورانی غبار اڑنے لگا۔ جن کھیتوں اور جنگلوں سے میں گزر کر آیا تھا ان کی جانب سے کسی کسی وقت ٹھنڈی ہوا آتی۔ اسی ہوا میں جنگلی پھولوں، درختوں اور شبنم میں بھیگی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس کی مہک تھی۔

اس کے بعد سورج نکل آیا اور پلیٹ فارم پر کچھ مسافر بھی نظر آنے لگے۔ دھوپ نکلنے سے فضا کی خنکی اور سردی کم ہو گئی تھی۔ میں اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

◆.....◆.....◆

پسنجر ٹرین اپنے وقت پر آ گئی۔ میں پچھلی بوگی کے ایک ڈبے میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین تھوڑی دیر کیلئے ہی رکی اور پھر چل پڑی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک تو ٹرین کی رفتار ہلکی تھی اور دوسرے وہ تقریباً ہر سٹیشن پر کھڑی ہوتی تھی۔ بنارس پہنچتے پہنچتے دن ڈھلنے لگا تھا۔ ابھی تک ڈبے میں کوئی ٹکٹ چیکر نہیں آیا تھا۔ بنارس کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں محتاط ہو گیا۔ یہ بڑا سٹیشن تھا۔ یہاں پلیٹ فارم پر بھی ٹکٹ چیکر کا خطرہ تھا۔ یہ بات میرے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے تجربے میں آ چکی تھی کہ کبھی کبھی کسی بڑے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی ٹکٹ چیکر اگر کسی پر شک پڑ جائے تو ٹکٹ چیک کر لیتا تھا۔ میں پلیٹ فارم پر اترتے ہی ٹرین سے دور ہٹ کر کتابوں رسالوں کے سٹال کے کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ جتنی دیر ٹرین بنارس کے سٹیشن پر رکی رہی میں وہیں کھڑا رسالے وغیرہ دیکھتا رہا۔ جب ٹرین چل پڑی تو میں بھی ٹرین کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے ڈبے میں کوئی ٹکٹ چیکر نہیں چڑھا تو میں دوڑ کر ڈبے میں گھس گیا۔

اس کے آگے بڑا سٹیشن لکھنو تھا۔ یہاں بھی بغیر ٹکٹ پکڑے جانے کا شدید خطرہ تھا۔ مگر میں بھی بغیر ٹکٹ سفر کرنے میں بڑا ماہر ہو گیا تھا۔ اس کھیل کے تمام کرداروں کی نفسیات سے واقف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب تک گاڑی تھوڑی رفتار نہیں پکڑ لیتی، ٹکٹ چیکر ڈبے میں داخل نہیں ہوتا۔ اگر وہ رکی ہوئی ٹرین کے کسی ڈبے میں سوار ہو تو اس ڈبے میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے والا مسافر ٹکٹ چیکر کی شکل دیکھ کر ہی اتر سکتا تھا۔ لیکن جب ٹرین تھوڑی تیز ہو جاتی تھی تو پھر بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے کیلئے اترنا مشکل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ

عام طور پر چیکر چلتی ٹرین میں دوڑ کر ڈبے میں سوار ہوا کرتے تھے۔ اس طرح کسی مسافر کو اترنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔

میں بھی ٹکٹ چیکر کے منصوبے پر عمل کیا کرتا تھا اور جب ٹرین پلیٹ فارم پر سپیڈ پکڑ لیتی تھی تب اس میں سوار ہوتا تھا۔ اس دوران میں یہ تسلی کر لیتا تھا کہ ڈبے میں کوئی چیکر سوار نہیں ہوا۔ اگر چیکر سوار ہوتا تھا تو میں وہ بوگی چھوڑ کر کسی پچھلی بوگی کے ڈبے میں گھس جاتا تھا۔

بعض ڈبوں کے دروازے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے تھے۔ ٹکٹ چیکر چلتی ٹرین میں ایک ڈبے کے مسافروں کو چیک کر کے دروازے کے ہینڈلوں کو پکڑ کر دوسرے ڈبے میں آ جاتا تھا۔ مگر دو بوگیوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا تھا۔ یہاں وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس وجہ سے میں چیکر والی بوگی چھوڑ کر دوسری بوگی میں سوار ہو جاتا تھا۔

ٹرین بنارس شہر کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل آئی تھی۔ شام کے وقت ٹرین دریائے گومتی کے پل پر سے گزری اور پھر لکھنؤ کے سٹیشن پر رکتے ہی میں حسب عادت ڈبے سے اتر کر ادھر ادھر ہو گیا۔ مجھے اس طریقہ کار پر اس وقت تک عمل کرتے رہنا تھا جب تک ٹرین امرتسر نہیں پہنچ جاتی۔ کیونکہ میرے پاس ٹرین کا ٹکٹ نہیں تھا اور میں بغیر ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔ پتہ نہیں آج کل کیا صورتحال ہے مگر انگریز کے زمانے میں یہ بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا اور ٹکٹ چیکر پکڑے ہوئے مسافر کو اس وقت تک نہیں چھوڑتا تھا جب تک کہ وہ ڈبل جرمانہ ادا نہ کر دے۔ اگر مسافر کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے تو اسے ریلوے پولیس کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ میری عمر کے لڑکوں کو اکثر ٹکٹ چیکر پکڑنے کے بعد راستے میں ہی کسی سٹیشن پر اتار دیا کرتے تھے۔ میرے ساتھ ایسا تین چار مرتبہ ہو چکا تھا۔ ایک تو لکھنو کا سٹیشن ایک بڑا جنکشن تھا۔ دوسرے ٹرین پسنجر تھی۔ وہ کافی دیر تک وہاں رکی رہی اور میں ٹکٹ چیکروں سے آنکھ بچاتا ادھر ادھر چھپتا پھرتا رہا۔ بڑی مشکل سے گارڈ نے سیٹی دی، پھر انجن نے دو تین بار وسل دیا اور ٹرین پلیٹ فارم پر سے کھسکنے لگی۔ میں ذرا پرے ہٹ کر ٹرین کے ساتھ ساتھ تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اپنے ڈبے کی نشاندہی میں نے یاد کر رکھی تھی۔ میرا ڈبہ

میرے پیچھے سے آ رہا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا اور میں نے دیکھ لیا کہ اس میں کوئی چیکر سوار نہیں تو میں نے دوڑتے دوڑتے ڈبے کے ہینڈل کو پکڑا اور اس میں سوار ہو گیا۔

جس روٹ پر یہ پسنجر ٹرین سفر کر رہی تھی اس روٹ پر سارے بڑے بڑے شہر آتے تھے۔ لکھنؤ کے آگے شاہجہان پور تھا' پھر بریلی تھا۔ اس کے بعد رامپور تھا اور اس کے آگے مراد آباد کا شہر تھا۔ لیکن ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ اب رات ہو گئی تھی اور رات کو ٹرین میں چیکنگ کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ بریلی کے سٹیشن پر میں پلیٹ فارم پر اتر گیا لیکن اس کے بعد میں ڈبے میں ہی رہا۔ ٹرین رات کے وقت سفر کرتی رہی۔ کم بخت کوئی سٹیشن نہیں چھوڑ رہی تھی۔ جب مراد آباد آیا تو دن نکل آیا تھا۔ بھوک سے میرا حال کافی خراب ہو رہا تھا۔ پانی تو میں پی لیتا تھا' مگر سارا دن میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ لیکن اللہ میاں بڑا کارساز ہے اور رزاق ہے۔ مراد آباد سے میرے ڈبے میں ایک بزرگ سوار ہوئے جن کے پاس ایک بڑا سا ٹفن کیریئر بھی تھا۔ اتفاق سے وہ میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گئے۔ مراد آباد سے ٹرین نے دلی کا رخ کیا۔ جب ٹرین چل پڑی تو اس بزرگ نے ٹفن کیریئر کھول دیا۔ اس کے اندر کھانے کو بہت کچھ تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اتنے میں اس بزرگ نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''برخوردار! ناشتہ کرو گے؟''

میں نے دل پر جبر کر کے تکلفاً کہہ دیا۔

''جی نہیں' شکریہ!''

اس بزرگ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''میاں! ہم کبھی اکیلے ناشتہ نہیں کرتے۔ میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ مجھے خوشی ہو گی۔''

مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔ پوریاں تھیں' حلوہ تھا' کچوریاں تھیں۔ مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی پھر بھی میں ہاتھ روک کر کھا رہا تھا کہ بزرگ مجھے ندیدہ نہ سمجھیں۔ لیکن بڑے

مشفق بزرگ تھے انہوں نے زبردستی مجھے بہت کچھ کھلا دیا۔ میری بھوک ختم ہو گئی۔ راستے میں ٹرین ایک جگہ رکی تو انہوں نے تھرمس میں سے چائے نکال کر ایک کپ مجھے بھی دیا۔ مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ ''امرتسر جا رہا ہوں۔''

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

خدا جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے کہہ دیا۔

''یہیں مراد آباد سے ہی سوار ہوا ہوں۔ ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ پتہ چلا کہ وہ کلکتے جا چکا تھا۔ اب واپس اپنے شہر جا رہا ہوں۔''

میں اس بزرگ سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک ہمارے ڈبے میں ایک ٹکٹ چیکر سوار ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی میں گھبرا گیا۔ سوچا ڈبے سے اتر جاؤں مگر اس دوران ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ ٹکٹ چیکر مجھے پکڑ لے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے ٹرین سے نیچے نہ اتارے اور کہے کہ تمہیں دلی پہنچ کر پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ دلی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اس بزرگ کے آگے میری بڑی بے عزتی ہو گی۔ اب کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ٹرین پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ ٹکٹ چیکر مسافروں کے ٹکٹ چیک کرتا ہماری نشستوں کی طرف آ رہا تھا۔ بزرگ مجھ سے کچھ باتیں ضرور کر رہے تھے۔ میں ہوں' ہاں میں جواب دے رہا تھا اور میری ساری توجہ ٹکٹ چیکر کی طرف تھی جو آہستہ آہستہ ہمارے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ آخر وہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے بزرگ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ان سے ٹکٹ مانگی۔ بزرگ نے بڑے اطمینان سے اچکن کی اوپر والی جیب سے زرد رنگ کا ریلوے ٹکٹ نکال کر چیکر کو دیا۔ چیکر نے اس پر پنسل سے نشان بنایا اور ٹکٹ واپس کر دیا۔ اب اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ٹکٹ؟''

اس کی آواز بم کا دھماکہ بن کر میرے کانوں میں گونج اٹھی۔ میں نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا اور یونہی اپنی پتلون کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ چیکر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی ساری جیبوں کی تلاشی لینے کے بعد حیران

ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''خدا جانے کہاں گم ہو گیا ہے ٹکٹ۔ میں نے اسی جیب میں رکھا تھا۔''

ٹکٹ چیکر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''برخوردار! تمہاری شکل بتا رہی ہے کہ تم نے ٹکٹ نہیں خریدا تھا۔ کہاں سے سوار ہوئے تھے؟''

چیکر نے اپنی خاکی بش شرٹ کی جیب میں سے کاپی پنسل نکالتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہہ دیا۔

''مراد آباد سے سوار ہوا ہوں۔''

چیکر نے حساب لگا کر مراد آباد سے لے کر دلی تک کے ریل کے کرائے کی رقم مع جرمانے کے بتائی تو میں نے کہا۔

''میرے پاس تو اتنے ہی پیسے تھے جس کا میں نے ٹکٹ خرید لیا تھا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

چیکر بولا۔ ''تو پھر برخوردار یہیں آرام سے بیٹھے رہو۔ دلی آ رہا ہے۔ وہاں میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

اچکن پوش بزرگ بڑی خاموشی سے ہمارے درمیان جاری مکالمے سن رہے تھے۔ جب ٹکٹ چیکر نے پولیس کا نام لیا تو انہوں نے کہا۔

''مراد آباد سے دلی کا ٹکٹ کاٹ دیجیے۔ پیسے میں دیے دیتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں نہیں جناب آپ تکلیف نہ کریں۔''

انہوں نے بٹوے میں سے روپے نکال کر ٹکٹ چیکر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں برخوردار! تم میرے بچوں کی طرح ہو۔''

ٹکٹ چیکر کو شاید افسوس ہو رہا تھا کہ شکار اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس نے پیسے لے کر مجھے چھپے ہوئے کاغذ کی شکل میں مراد آباد سے دلی تک کا ٹکٹ تھمایا اور ڈبے کے دروازے کی طرف چلا گیا۔ میں اس بزرگ کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ وہ بولے۔

''میاں! تمہیں تو امرتسر جانا ہے۔ آگے کیا کرو گے۔ تمہارے پاس تو کوئی پیسہ نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں دلی اتر کر اپنے کسی رشتے دار کے پاس جا کر پیسے ادھار لے لوں گا۔''

وہ بولے۔ ''میاں! تمہاری یہ عمر اپنے رشتے داروں کے احسان لینے کی نہیں ہے۔ فکر نہ کرو۔''

انہوں نے بٹوے میں سے بیس روپے نکال کر مجھے دیے اور فرمایا۔ ''یہ کرائے کیلئے اپنے پاس رکھو۔ تمہیں میں اپنے بچوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔''

مراد آباد کے اس بزرگ کی مہربان صورت آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں انہیں ہمیشہ نیک دعاؤں کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔ اس زمانے میں بیس روپوں کی بڑی قیمت تھی۔ گاڑی دلی پہنچی تو وہ بزرگ مجھے خدا حافظ کہہ کر دوسرے مسافروں کے ہجوم میں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن میرے تصور میں آج وہ دنیا کے ہجوم میں سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ دلی سٹیشن پر اس پسنجر ٹرین کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرنا تھا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کسی طرح پلیٹ فارم سے نکل کر باہر گیا اور دلی سے امرتسر تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں آگے بھی بغیر ٹکٹ ہی جاؤں۔ لیکن اب میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں جلدی اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنا گھر' اپنے گھر والے' بہن بھائی' اپنا شہر' اپنے شہر کی گلیاں اور سب سے بڑھ کر اپنے امرتسر شہر کا کمپنی باغ بہت یاد آ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس بار میں نے اپنے ایڈونچرس سفر میں بہت مصیبتیں اٹھائی تھیں اور دو تین بار موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔

میں اپنی پسنجر ٹرین میں آ کر بیٹھ گیا۔ ٹکٹ میری جیب میں تھا۔ اب مجھے کسی کی فکر نہیں تھی بلکہ میری خواہش تھی کہ کوئی ٹکٹ چیکر ڈبے میں آئے اور میں بڑی شان سے

ٹکٹ نکال کر اسے دکھاؤں۔ لیکن میری یہ حسرت پوری نہ ہوئی۔ امرتسر تک کوئی چیکر ٹکٹ چیک کرنے نہ آیا۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جب ٹکٹ اپنے پاس ہوتو ٹکٹ چیکر ڈبے میں نہیں آتا۔ جب ٹکٹ پاس نہ ہوتو چلتی ٹرین میں ٹکٹ چیکر ڈبے میں آ جاتا ہے۔ عجیب لوگ ہیں یہ بھی۔

ہماری پسنجر ٹرین اسی طرح بے حس وحرکت کھڑی تھی۔ جیسے یہ اس کا آخری سفر تھا جو ختم ہوگیا ہے۔ اس کا انجن بھی غائب ہوگیا تھا۔ ٹرین کے آس پاس ریلوے کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ گارڈ کا ڈبہ بھی خالی پڑا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹرین کا کوئی وارث نہیں رہا۔ انتہائی صبر آزما انتظار کے بعد آخر گارڈ صاحب کی صورت نظر آئی۔ وہ سرخ اور سبز جھنڈیاں بغل میں دبائے سگریٹ پیتے ایک طرف سے چلے آ رہے تھے۔ گارڈ کو دیکھ کر کچھ حوصلہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد ایک انجن بھی کسی طرف سے شنٹ کرتا آیا اور ٹرین کے آگے لگ گیا۔ آخر گارڈ کو مسافروں پر رحم آ گیا۔ اس نے سیٹی بجائی۔ ایک بار نہیں دو تین بار سیٹی بجائی۔ اس کی سیٹی کی آواز سن کر انجن کو بھی ہوش آ گیا۔ اس نے بھی دو تین بار وسل دیا اور پسنجر ٹرین کے مردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ اس نے تکلیف دہ آوازوں کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور پلیٹ فارم پر کھسکنا شروع کر دیا۔ ٹرین کے ہمارے ڈبے کے پہیوں میں سے عجیب دردناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ ٹرین آدھی رات کے وقت امرتسر پہنچی۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ آپو جی یعنی والدہ نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر اپنے ساتھ لگا کر میرا ماتھا چوما۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

◈......◈......◈